نیا عالمی نظام اور ہم

از

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

ترتیب و پیشکش

محمد وثیق ندوی

ناشر

دار الرشید

لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

۱۴۴۱ھ - ۲۰۲۰ء

نام کتاب	:	افکار ونظریات
مؤلف	:	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
		(سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)
ترتیب وپیشکش		محمد وثیق ندوی
صفحات	:	۳۷۲
تعداد	:	گیارہ سو
قیمت	:	Rs.270

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، فون: 0522-2741539

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ، فون: 9415912042

مکتبہ ندویہ، احاطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون: 9335070285

مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، فون: 9793118234

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، شباب مارکیٹ، مکارم نگر، لکھنؤ 9696437283

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ: (0522)2610443. 6535664

ناشر

دار الرشید
Dar Al Rasheed

164/106 Khatoon Manzil, Haidar Mirza Road
Golaganj, Lucknow. Mo: 9452294097-9838154415
e-mail:daralrasheed17@gmail.com

فہرست

پیش گفتار	۷
مقدمہ	۱۵
روس اور سامراجیت	۱۹
آزادی نسواں - ایک فریب پیہم	۲۴
سیکولرزم کا نیا مفہوم	۲۹
یہ ذہن تعمیری نہیں ہے	۳۵
تنگ نظری کا مرتکب کون؟	۴۱
بدامنی کا ذمہ دار کون؟	۴۶
مشرق وسطیٰ پر عالمی کشمکش کے سائے	۵۱
غیر اسلامی نظام میں اسلام کے ساتھ معاندانہ سلوک	۵۷
جمہوریت چاہے جس شکل میں	۶۲
شراب - سم قاتل	۶۷
دانشوروں کی ذمہ داری	۷۲
مذہب بیزاری - سامراجی عہد کا ورثہ؟	۷۹
حاکم کون اور محکوم کون؟	۸۵
اک عالم نو ہو رہا ہے پیدا؟	۹۰
یورپ کو صلیبی ذہنیت سے ابھی تک آزادی نہیں ملی	۹۷

کیا آزادی نام ہے فطرت سلیم سے بغاوت کا؟ ۱۰۴
دہشت گردی کا معلم کون ہے؟ ۱۱۱
نئی منطق نئی اصطلاحیں ۱۱۹
آزاد ممالک کے غلام عوام ۱۲۶
سیاسی نظام حکومت اور عوامی رجحان ۱۳۲
جمہوریت، سیکولرزم اور ترقی پسندی کے دوہرے پیمانے ۱۳۸
سیکولرزم کا متضاد مفہوم ۱۴۴
سیاسی تحریکات ونظریات اور دینی واصلاحی
تحریکات میں مقصد اور وسائل کا فرق ۱۴۹
کمزور ممالک پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک نیا ہتھیار ۱۵۴
نیا نظام نئے تصورات ۱۶۱
سیکولرزم کیا ہے؟ ۱۶۹
جمہوریت اور سیکولرزم: فکر وعمل کا تضاد ۱۷۶
جب اقدار کی کوئی بنیاد ہی نہیں تو مفاہمت کیسے ممکن ہو؟ ۱۸۴
ایک آقا اور سب محکوم ۱۹۰
سامراجی منصوبے ۱۹۸
نیا عالمی خطرہ ۲۰۵
کیا مہذب دنیا تاریک دور کی طرف واپس جارہی ہے؟ ۲۱۳
سامراج اور عیسائیت کی تبلیغ - نیا رجحان ۲۲۲
مشرق اور مغرب کے درمیان اختلاف کا سبب
دولت نہیں، تصور حیات کا فرق ہے ۲۳۱

مغربی تہذیب چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر	۲۳۷
سامراج کی تاریخ اور محرکات	۲۴۴
سیکولرزم اور جمہوریت کے پیمانے	۲۴۷
انسانیت کی بقاء ٹکراؤ میں نہیں، جوڑ میں ہے	۲۵۵
ڈائیلاگ مساوی فریقین کی طرح ہو	۲۶۱
اخلاقی قدروں سے خالی علم کے تباہ کن نتائج	۲۷۰
جب اسلام کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے	۲۷۷
انسانیت کی مصیبت مغرب کے مشرق سے جدا ہونے میں ہے	۲۸۷
مسلمان ردعمل کی نفسیات کے شکار نہ ہوں	۲۹۴
آزادیٔ اظہارِ رائے کا مطلب	۳۰۴
یہ رخ تعمیری نہیں ہے	۳۱۱
نئے نظام کے قیام کا نیا سامراجی منصوبہ	۳۱۷
مسلم رہنماؤں کی دانشمندی کی آزمائش	۳۲۲
مغربی تعبیرات واصطلاحات: تاریخی حقائق وپس منظر	۳۳۰
فکروفن کے ذریعہ اسلام پر حملہ	۳۳۷
مسلمان ایک عالمی امت ہیں	۳۴۵
سامراجیت کا نیا فلسفہ	۳۵۲
عالم انسانی کے لیے سب سے بڑا فتنہ	۳۵۹
انسانی حقوق: نظریات اور حقائق	۳۶۵
ایک نئی عالمی طاقت کی ضرورت	۳۶۸

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش گفتار

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد۔

انتہائی اہم موضوعات پر نہایت وقیع مضامین کا یہ قیمتی مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے، والد ماجد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان مضامین میں ان مغربی افکار ونظریات پر روشنی ڈالی ہے جو مشرق ومغرب میں یکساں مقبول ہوئے اور اس نئے عالمی نظام کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے جس نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، دنیا کے نقشہ میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جو اس نئے نظام سے جو یورپ کے دائرہ اقتدار کو بڑھانے اور مشرق پر یورپ کی گرفت مظبوط کرنے کے لیے لایا گیا تھا، آزاد نظر آتا ہو۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اپنی بقا کے لیے یورپ کو ایک نئے نظام کی ضرورت تھی، لیکن مشرقی دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا کی صورتحال مغربی دنیا کی صورتحال سے کچھ نہیں، بہت کچھ مختلف تھی، اسلامی دنیا میں رائج مذہب ''اسلام'' یورپی مفکرین کے پیش کردہ ان افکار ونظریات کی تمام اچھائیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا اور ساتھ ساتھ ان افکار ونظریات میں پائی جانے والی ہر خامی اور ان میں نظر آنے والے ہر جھول سے پوری طرح پاک تھا، لیکن مغربی مفکرین سے ایک غلطی ہوئی، ایسی غلطی جس کی سزا دنیا آج تک بھگت رہی ہے اور شائد اس وقت تک بھگتی

رہے جب تک وہ اسلام کے عادلانہ اور مساویانہ نظام کو عالمی نظام کے طور پر قبول نہ کرلے، غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انہوں نے مشرقی ممالک میں اپنی اصلی حالت پر قائم ''اسلام'' کو مغربی ممالک کی تحریف شدہ ''عیسائیت'' پر قیاس کرلیا اور جس طرح انہوں نے مسیحیت کو یورپ کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھا، اسی طرح انہوں نے اسلام کو بھی مشرقی ممالک کی پستی کا بنیادی سبب قرار دیا، نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یورپ سے درآمد تمام نظریات میں مذہب کی حیثیت کو کم ہی نہیں، ختم ہی کردیا گیا اور اس کو ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑیاں اور پاؤں میں پڑی بیڑیاں قرار دیا گیا، جبکہ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا اس وقت تک ترقی کرتی رہی، آگے بڑھتی رہی اور یورپ کا قبلہ بنی رہی جب تک وہ اپنے اسلامی نظام کے مطابق چلتی رہی، افسوس کہ مغربی مفکرین اس چیز کو سمجھ نہ سکے، یا یہ کہ انہوں نے اس چیز کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ''دوسری قوموں کی ترقی اس میں ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور نئے کی تلاش کریں، لیکن ہماری ترقی اس میں ہے کہ ہم پیچھے ہٹیں اور اتنا ہٹیں کہ صحابہ کرامؓ کی صف سے جاملیں''۔

اٹھارہویں صدی کے فرانس کو کون بھولے گا، یہ وہی فرانس ہے جو کبھی سب کا قبلہ بنا ہوا تھا، لیکن یہی فرانس اٹھارہویں صدی میں تین طبقوں میں تقسیم ہو چکا تھا، پہلا طبقہ کیتھولک چرچ، یعنی مسیحی پادریوں اور عیسائی مذہبی پیشواؤں کا تھا، جس کا حکم بادشاہ کو بھی ماننا پڑتا تھا، ملک کی آمدنی کا بڑا حصہ اسی طبقہ کی جھولی میں جاتا تھا، ٹیکس کی ادائیگی سے بھی یہ طبقہ مستثنیٰ تھا، البتہ دوسروں پر ٹیکس لگانے کا اسے پورا اختیار تھا، غریبوں کی خون پسینے کی کمائی پر ظالمانہ ٹیکس لگانا اور پھر اس پیسہ سے عیش وعشرت کی زندگی گزارنا یہ اس کا کام تھا، دوسرا طبقہ امیروں، نوابوں، زمینداروں اور جاگیرداروں کا تھا جس کے لیے فرانس جنت کا ایک ٹکڑا تھا، ہیرے جواہرات کے ڈھیر پر وہ بیٹھتا

تھا، سونے چاندی کی پلیٹوں میں وہ کھاتا تھا، دو دو سو ایکڑ میں بنے محلوں میں وہ رہتا تھا، یہ طبقہ بھی ٹیکس سے مستثنیٰ تھا، البتہ عام لوگوں سے ٹیکس وہ بھی وصولتا تھا، اس طبقہ کے لوگوں کے لیے قانوناً دس قتل تک معاف تھے، ان دونوں طبقوں کے افراد صرف چار فیصد تھے، جبکہ وہیں پر تیسرا طبقہ جو چھیانوے فیصد آبادی پر مشتمل تھا، ضروریات زندگی کے لیے ترس رہا تھا، نہ ان کو پینے کے لیے صاف پانی میسر تھا، نہ رہنے کے لیے ڈھنک کا مکان اور نہ پہننے کے لیے مناسب کپڑے، ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی اور سلوک بھی ان کے ساتھ جانوروں ہی جیسا کیا جاتا تھا، قحط کے ایام میں ایک وقت کی روٹی کے لیے ایک عورت کو کئی کئی بار اپنے جسم کو بیچنا پڑتا تھا، کسی کو بھی اس عورت پر ترس نہیں آتا تھا، اس کی مجبوری سے پہلے اور دوسرے طبقہ کا ہر مرد فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا، تیسرے طبقہ کے افراد کے لیے نمک تک کے استعمال پر ٹیکس لگتا تھا، بھوک سے مجبور ہو کر تیسرے طبقہ کا کوئی آدمی پہلے اور دوسرے طبقہ کے کسی آدمی کی اگر ایک مرغی بھی چرا لیتا تو اس کی سزا موت ہوتی تھی، آزادیٔ رائے، یا حکومت پر تنقید کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقتصادی بحران کی وجہ سے حکومت نے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچنے کا اعلان کیا، تو اس وقت کے مشہور فرانسیسی مفکر وولٹیر نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچنے کے بجائے اگر شاہی دربار کے آدھے گدھوں کو دربار سے نکال دیا جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا، وولٹیر کا اتنا کہنا تھا کہ اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک چھوٹے سے تہ خانہ میں قید کر دیا گیا۔

یہ تھے اس وقت کے وہ حالات جو تبدیلی چاہتے تھے اور یہ تھا اس وقت کا وہ نظام جو بدلاؤ چاہتا تھا، صرف اسلام وہ واحد مذہب تھا جو ان حالات کو بدلنے اور اس نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، وہ ایک ایسا عالمی نظام دے سکتا تھا

جس سے دنیا امن کا گہوارہ بن سکے اور ہر شخص امیر ہو یا غریب، خاص ہو یا عام، چھوٹا ہو یا بڑا، مذہبی ہو یا غیر مذہبی، آزادی کی فضا میں، امن کے ماحول میں، مکمل انصاف کے ساتھ سکون واطمینان کی زندگی گزار سکے، جس میں ہر شخص کو اس کا حق ملے، دولت کی بنیاد پر، خاندان کی بنیاد پر، مذہب کی بنیاد پر کوئی ایسی تقسیم نہ ہو، جو کسی پر زیادتی یا اس کی حق تلفی کا سبب بنے، لیکن ایسا نہیں ہوا اور بجائے اسلامی نظام کو بدل کے طور پر پیش کرنے کے اس وقت کے مذہب سے بے زار مغربی مفکرین نے اسلام سے ہٹ کر کچھ اور طریقے پیش کیے، یہ طریقے اپنی تمام خوبیوں کے باوجود خامیوں سے خالی نہ تھے، چنانچہ حالات بہتر تو ہوئے، لیکن اتنے نہیں جتنے ہونے چاہیئے تھے، اگر ایک پہلوان کا اچھا تھا تو دوسرا پہلوان کا خراب اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، ہر نظام کا تجربہ ہو چکا ہے، ہر نظریہ کو اپنایا جا چکا ہے، لیکن دنیا ہے کہ پستی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے اور رفتار ہے کہ روز بروز تیز ہو رہی ہے۔

جاگیردارانہ نظام سے عاجز آ کر سرمایہ دارانہ نظام کا تجربہ کیا گیا، سرمایہ دارانہ نظام سے تھک ہار کر اشتراکی نظام کا سہارا لیا گیا، نتیجہ صفر ہی رہا، دنیا دوزخ تھی، دوزخ ہی بنی رہی، جنت نہ بن سکی، کچھ لوگوں کو ضرور جنت کا مزہ آیا۔ لیکن اکثریت کو کیا ملا؟ ذرا اکثریت سے پوچھیے۔

شاہی نظام سے پیچھا چھڑا کر جمہوری نظام کو اپنایا گیا، مذہب سے ناطہ توڑ کر سیکولرزم کا نعرہ لگایا گیا، لیکن صورتحال جو تھی وہی رہی، یورپ نے تو ان تبدیلیوں سے تھوڑا بہت فائدہ اٹھایا اور وہاں کے کچھ حالات بدلے، لیکن مشرقی ممالک تو جیسے تھے ویسے ہی رہے، کہنے کو تو سیکولر اور جمہوری تو ضرور ہیں، لیکن کیا عملاً ایسا ہے؟ جواب آپ کا نفی ہی میں ہوگا، دور جانے کی ضرورت نہیں، ہم خود اس کی ایک مثال ہیں اور ملک کے موجودہ حالات خود اس کا کھلا ثبوت ہیں۔

پیش نظر مضامین میں والد گرامیؒ نے اسی صورتحال کو موضوع بنایا ہے اور نئے عالمی نظام کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے تخریبی اور سامراجی پہلو سے پردہ اٹھایا ہے، انہوں نے بتایا ہے کہ مغربی طاقتیں کس طرح انسانیت کے ساتھ کھیلواڑ کرتی ہیں، خوشنما اور دلفریب نظریات وافکار پیش کرتی ہیں اور آزادی کے نام پر انسانی اور اخلاقی اقدار وروایات کو ملیامیٹ کرتی ہیں، کبھی تو اشتراکیت کے نام پر، کبھی کمیونزم کے نام پر، کبھی سیکولرزم کے نام پر، کبھی جمہوریت کے کے نام پر، کبھی آزادیٔ نسواں کے نام پر، کبھی آزادی رائے کے نام پر اور اخیر میں گلوبلائزیشن کے نام پر مغربی طاقتوں نے دنیا پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی ہے، دوسری طرف عالم اسلام کو اپنے زیر نگیں لانے اور اس پر اپنا دباؤ بنانے کے لیے کبھی اس پر بنیاد پرستی کا الزام لگایا، کبھی نام نہاد اسلامی دہشت گردی کا اور ان الزامات کی آڑ میں عالم اسلام پر حملے کیے اور وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کر کے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار دی جو مغربی سامراج کے توسیع پسندانہ عزائم کو نافذ کرنے میں ان کے مددگار ہوں اور مغربی تہذیب وتمدن کی بالادستی قائم کریں، اس کے لیے انہوں نے مغرب زدہ مسلم دانشوروں کو استعمال کیا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:۔

> ''مغربی قائدین اور مغرب زدہ اہل قلم، اسلام اور مسلمان کے بارے میں تنگ نظری، بنیاد پرستی اور تشدد پسندی کی تعبیرات استعمال کرتے رہتے ہیں جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں پر حرف زنی کرنا اور دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے اسلامی معاشرے کو ایک تاریک ترین معاشرہ ثابت کرنا ہوتا ہے جو درحقیقت سامراجی طاقتوں یا سامراج کے اشارہ پر چلنے والے کے جبر وتشدد کی وجہ سے حقیقی آزادی سے محروم ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ اس وجہ سے پسماندہ ہیں کہ انہوں نے کی ان تعلیمات کی پابندی اختیار کی ہے جو ان

کے نزدیک قرون مظلمہ کے معاشرہ کے لیے خاص تھیں اوران تعلیمات میں جبر وتشدد اور اکراہ کی تعلیم دی گئی ہے، اس تصور کے لیے وہ کارٹونی تصویریں اور سیاسی واجتماعی جائزے پیش کرتے ہیں، جس سے مغربی اہل قلم کی اسلام دشمنی کا پتہ چلتا ہے اور اسلامی معاشرہ کی پسماندگی کی تصویر سامنے آتی ہے، وہ اہل قلم دنیا کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر اسلام کے ماننے والے جوان کے نزدیک انتہا پسند اور قدامت پرست ہیں، برسر اقتدار آگئے یا ان کو تسلط حاصل ہوگیا اور اسلامی شعور بیدار ہوگیا تو موجودہ تہذیب خطرے میں پڑ جائے گی اور انسانی قدریں معدوم ہوجائیں گی''۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

''حقیقت یہ ہے کہ یورپ اسلامی ممالک کی اقتصادی وصنعتی ترقی کی راہ میں حائل ہورہا ہے اور بلاضرورت وہ ان پر پابندیاں عائد کررہا ہے اور انھیں اپنے یورپی ممالک کا ہمیشہ دست نگر بنے رہنے پر مجبور کررہا ہے، یہ یورپ کی ایسی پالیسی ہے جس کی وجہ سے کوئی اسلامی ملک کبھی بھی صنعتی ترقی نہیں کرسکتا؛ بلکہ یورپ کے ہمنوا ممالک بھی اقتصادی بدحالی اور صنعت وحرفت کی درماندگی کا شکار ہوسکتے ہیں، اس سے نہ تو ترکی مستثنیٰ ہے اور نہ ہی عرب ممالک، جنھوں نے دوصدیوں سے یورپ کی پیروی کو اپنا وطیرہ بنایا ہے اور اس کی سربراہی وتسلط کو تسلیم کررکھا ہے''۔

مغرب نے عالم اسلام میں جو حالات اور مسائل پیدا کیے ہیں ان کو کیسے حل کیا جائے؟ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

''یہ وہ کثیر الجہات اور متنوع حالات ہیں جو پوری دنیا میں عام ہیں، یہ تقاضہ کرتے ہیں کہ مسلم رہنما ان تمام مسائل اور حالات کا بغور جائزہ لیں اور

حکمت و مصلحت اور دانشمندی کے ساتھ ان کا حل تلاش کریں۔ اس ضمن میں دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت اور میڈیا جیسے ذرائع و وسائل کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً حالات کو سمجھنے بوجھنے کے لیے افہام و تفہیم اور گہری سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے''۔

''دنیا کی موجودہ صورتحال ایک ایسی موثر و عادل طاقت کی متقاضی ہے جو ظالموں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں امن و امان قائم کرے اور انسانی حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کرے''۔

''عالم اسلام کو اس وقت جو صورت حال درپیش ہے وہ عزم و ارادہ، غیرت و حمیت اور قربانی نیز منصوبہ بندی کی متقاضی ہے اور یہی وہ آزمودہ نسخہ ہے جو عالم اسلام کو درپیش موجودہ خطرات سے ایک بار پھر نجات دلاسکتا ہے، یہ ایثار و قربانی اور صبر و عزیمت کا راستہ ہے، اور یہی وہ راہ ہے جو اس امت کو درپیش نئے خطرہ و چیلنج سے بچا سکتا ہے، گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے''۔

یہ مجموعہ مغرب کے نئے عالمی نظام، اس کے اسباب و وسائل، مغربی سامراج کے عزائم و منصوبوں، امت مسلمہ کو درپیش خطرات، عالم اسلام کے سیاسی و اقتصادی بحران اور درپیش مسائل کے حقیقی اسباب و محرکات سے پردہ اٹھاتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے معاصر دنیا کی تقریباً چالیس سال کی تاریخ سامنے آجاتی ہے، اور اس عرصہ میں مشرق و مغرب میں کیا انقلابات رونما ہوئے؟، کیا واقعات پیش آئے؟، کیسے کیسے پرفریب نعرے لگائے گئے؟، مغرب نے کیسی کیسی منطقیں اور اصطلاحیں پیش کیں؟ ان کے پس پردہ کون تھا؟ حاکم کون اور محکوم کون؟ مجرم کون؟ دہشت گرد کون؟ انسانیت کے لیے خطرہ کون؟ دنیا کے لیے رحمت کون؟ امن و سلامتی کا دشمن

کون؟ عالم اسلام کی بیماری کیا ہے؟ اس کا علاج کیا ہے؟ جیسے سوالات کا جواب مختصر وقت میں قاری کو مل جاتا ہے۔

ہم شکر گزار ہیں مولانا محمد وثیق ندوی (استاد تفسیر وعربی زبان وادب دار العلوم ندوۃ العلماء) کے کہ انہوں نے عربی میں لکھے گیے ان مضامین کو جمع کیا، اکثر کا ترجمہ کیا، محنت کی، وقت صرف کیا، ترتیب قائم کی اور یہ مفید مجموعہ تیار کر کے ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں پہنچایا، انہیں والد گرامی کے ساتھ رہنے اور ان کے علم وفکر اور منہج عمل سے بھرپور استفادہ کرنے کا اچھا موقع ملا، ان کے علمی وفکری ورثہ سے انہیں دلچسپی بھی ہے اور اسے منظر عام پر لانے فکر بھی، اللہ تعالی والد گرامیؒ کے اس عمل اور مرتب کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور ان کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔

جعفر مسعود حسنی ندوی

۴/ جمادی الاولی/ ۱۴۴۱ھ

۳۰/ جنوری/ ۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(حضرت مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين وبعد!

علم اور سائنس کے لفظ الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی معنی رکھتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگ دونوں کے الگ الگ معنی سمجھنے لگے، اس طرح اہل دنیا اور اہل دین نے ان کے معنی الگ الگ سمجھ کر دونوں میں تقسیم کردی اور اہل دنیا نے اس کو علم نہیں سمجھا اور اہل دین نے اس کے انگریزی لفظ کے مطلب کو برا سمجھا اور دونوں الگ الگ ہوگئے۔ اس طرح مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے اور دنیوی علوم سے اپنے کو الگ رکھنے لگے۔

اس کا بڑا نقصان یہ سامنے آیا کہ دنیاوی زندگی کی ضروریات سے بھی ہمارے اہل دین ناواقف رہے اور اس کو خالص دنیا سمجھ کر اس سے الگ رہے اور دنیوی علوم کے ماہر جو آخرت کے منکر ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے مخالف رویہ رکھنے والے تھے، ان کے مخالفانہ عزائم اور ارادے معلوم ہی نہیں ہوسکے، اس بات نے مسلمانوں کو اسلام اور مسلمان مخالف عناصر کے عزائم کو سمجھنے سے محروم رکھا اور مغربی دنیا سے امت مسلمہ کے ذہنوں کو مخالفانہ حقائق کو سمجھنے سے محروم کردیا اور اسلام مخالف طاقتوں کی مخالفت کو تقویت ملی۔

اس بات کو سمجھنے کا موقع جن علماء دین کو ملا، انہوں نے علم کے دونوں پہلوؤں کو معلوم کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے پیش نظر ندوۃ العلماء کا قیام سوا سو سال پہلے عمل میں لایا گیا اور اس مدت میں جامع فکر کے افراد تیار کرنے کے ضروری وسائل و ذرائع اختیار کرنے کی کوشش کی گئی اور الحمد للہ یہ کوشش مفید ہوئی اور یہ گمشدہ راہ ایک حد تک سامنے آگئی اور اس پر کچھ چلنے والے افراد بھی تیار ہونے لگے۔ مثال کے طور پر گزشتہ نسل میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ جیسے اچھے نمونے سامنے آئے اور پھر متصلاً نسل میں کئی اہم شخصیتیں سامنے آئیں، ان میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت بہت نمایاں حیثیت سے سامنے آئی اور انکی تربیت میں متعدد افراد تیار ہوئے۔

ان میں خاص طور پر کارگزار شخصیت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی شخصیت بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے، انہوں نے موجودہ عہد کے اچھے برے رجحانات کا معاینہ کیا اور اسلام کے جامع تصور حیات کو توڑنے اور ختم کرنے کی جو تدابیر مغربی ماہرین فکر کی کوششوں سے کام کر رہی تھیں، ان کو خود بھی سمجھا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی، ان کے مضامین مختلف پرچوں میں شائع ہوتے رہے اور یہ تقریباً ۷۵ رسال کی جو مدت گزری اس میں کتابوں کی صورت میں اور رسائل و اخبارات کے صفحات کے ذریعہ سامنے آتے رہے، ان کے ایک خصوصی تربیت یافتہ مولوی محمد وثیق ندوی جوان کے معاون علمی کے طور پر ان کے ساتھ رہے اور ان کے منہج فکر و عمل کو اختیار کیا، انہوں نے ان مضامین کو جمع کر کے مختلف کتابوں کی شکل میں پیش کیا، جن میں ''مسئلہ فلسطین اور عالم اسلام''، ''محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم''، ''نظام تعلیم و تربیت''، ''موجودہ تہذیب و تمدن اور عالم اسلام''، ''انسانی حقوق قرآن، حدیث اور سیرت کی روشنی میں''، ''صحابہ کرام کی مثالی

زندگی''، ''نقوش فکر وادب''، ''مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فکر وعمل کے آئینہ میں''، ''دعوت اسلامی: مسائل، اندیشے اور تقاضے''، ''اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں'' اور دیگر کتابیں ہیں اور عربی کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

پیش نظر کتاب ''نیا عالمی نظام اور ہم'' جو ان کی وفات کے بعد شائع ہو رہی ہے، بڑے فکر انگیز اور ذہن ساز افکار کو پیش کرتی ہے، جو اسلام سے محبت رکھنے والے حضرات کی اچھی واقفیت کا ایک اچھا ذریعہ ہے، یہ کتاب اپنے عنوان اور مضامین کے ساتھ ایک مفید کتاب کے طور پر سامنے ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کا نفع عام ہو وما ذلك على الله بعزيز۔

۲۲/ جمادی الاولی/ ۱۴۴۱ھ
۱۸/ جنوری/ ۲۰۲۰ء

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ
اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ
نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾

[الصف:٨]

روس اور سامراجیت (☆)

اشتراکیت مزدوروں کے حقوق اور اقتصادی اور طبقاتی مساوات کی دعویدار ہے، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال کی مخالفت اور اس کے خلاف جدوجہد کو اولین مقاصد میں شمار کرتی ہے، بلکہ اس نظام کی اساس ہی محنت کش طبقہ کے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد پر قائم ہے، لیکن پولینڈ میں روس کا موقف مزدوروں اور محنت کشوں کے مقابلہ میں مالکوں کے ساتھ ہمنوائی اور تائید کا ہے، دنیا کے ہر ملک میں مالک اور مزدوروں کے درمیان کشمکش میں کمیونسٹ نظریہ کے لوگ مزدروں کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن پولینڈ میں ان کی تائید حکمراں طبقہ کو حاصل ہے اور اس حاکم طبقہ کو عوام سے بچانے کے لئے فوجی وسائل استعمال کئے جارہے ہیں۔ پولینڈ کے عوام نے نہ کمیونزم سے بغاوت کی ہے اور نہ وارسا پیکٹ سے علیٰحدگی اختیار کی ہے، وہاں کے مزدروں نے کچھ حقوق کا مطالبہ کیا ہے، جو حقوق پڑوسی غیر کمیونسٹ ملکوں کو حاصل ہیں، اس کے لئے سالوں سے پرامن جدوجہد کی جارہی ہے، اس جدوجہد میں روز بروز قوت پیدا ہوتی رہی اور عوامی تائید میں اضافہ ہوا تو کمیونسٹ نظام کو اس کا خطرہ لاحق ہوا کہ اس سے اس کی حقیقت کھل جائے گی، اس لئے اس پر امن عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے طاقت استعمال کی گئی، قانونی حکومت کی جگہ فوجی حکومت قائم کی گئی اور مارشل لا نافذ کیا گیا، اس کے جواز کے لیے ظاہر کیا گیا کہ یہ سامراجی سازش ہے۔

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر فروری ۱۹۸۲ء۔

پولینڈ کے حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے، اور روس نے عوامی طاقت کو کچلنے کے لئے جو فوجی ترکیبیں استعمال کیں، وہ اشتراکی دنیا میں نئی نہیں ہیں، اس سے پہلے چیکوسلواکیا اور ہنگری میں ایسے واقعات پیش آچکے ہیں، ان دونوں ملکوں میں بھی عوامی تحریک کو سامراجی سازش کہہ کر کچلا گیا۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کی جانیں گئیں، ہزاروں بے گھر ہوئے، بربریت اور وحشت کا بدترین مظاہرہ کیا گیا، عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے روس ہر ملک میں یکساں انداز اختیار کرتا ہے۔ اصلاح کی کسی تحریک کو چاہے وہ کتنی عوامی کیوں نہ ہو، سامراجی، رجعت پسند کہہ کر اس کو بدنام کیا جاتا ہے، مقامی حکومت کو کارروائی کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے، حکومت کے تشدد کے نتیجہ میں اس تحریک میں جب شدت پیدا ہوتی اور تحریک قوت پکڑتی ہے اور حکومت تحریک کو کچلنے میں ناکام ہوتی ہے، تو براہ راست روس مداخلت کرتا ہے یہ کہہ کر اس کو امن قائم کرنے یا کمیونزم کی حفاظت کے لیے دعوت دی گئی ہے، یہی صورت حال ہنگری میں پیش آئی بعد میں یہی صورت چیکوسلاویہ میں پیش آئی اور اب پولینڈ اخبارات کا موضوع بنا ہوا ہے، مغربی ممالک جو روس سے ٹکراؤ سے کتراتے ہیں صرف شور مچا کر رہ جاتے ہیں، اور روس تیز کارروائی کر کے آزادی کی تحریک کو کچل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، پولینڈ سے پہلے افغانستان روسی جارحیت کا شکار ہوا، جس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد بے گھر ہوئے اور لاکھوں نوجوان شہید ہوئے وہاں بھی روسی کارروائی خودساختہ حکومت کی مدد کے لیے اسی کی دعوت پر کی گئی۔

مشرقی یورپ کی اشتراکی دنیا سے ہٹ کر عرب اشتراکی دنیا پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ وہاں بھی حالات کا یہی رُخ ہے جو مغربی ممالک میں گذشتہ چند برسوں سے کئی بار پیش آئے، جو ممالک روس کے زیر اثر ہیں مثلاً شام، یمن، لیبیا، الجزائر وہاں عوام سیاسی حقوق سے محروم ہیں، روسی فوجی مشیر اور کے، جی، بی، (K.G.B.)

کے ایجنٹ نظام حکومت پر قابض ہیں، ملک کی معیشت روس کے مفاد کی تابع ہے، کسی کو تنظیم بنانے اور اپنے نظریات کے اشاعت کی اجازت نہیں ہے، وسائل ابلاغ صرف ایک نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں، ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں وہاں کے قائدین ماسکو کی طرف دیکھتے ہیں جس کی بدترین مثال افغانستان کا مسئلہ ہے، روس کی کھلی جارحیت کے باوجود ان ممالک نے روس کی مذمت کرنے کے بجائے مجاہدین کو سامراج کا ایجنٹ کہا، یہ حکومتیں ہر وقت روس سے وفاداری کی تجدید کے لئے ایسی کارروائیاں کرتی ہیں جو کمیونسٹ مفاد کو قوت پہنچائیں، اس کے لئے اسلامی ذہن کو اور شخصی آزادی کی تحریک کو سامراجیت کا الزام دے کر کچلتی رہتی ہیں۔ عالم اسلام میں اس عہد میں جو انقلابات آتے رہے ہیں اور آئے دن حکام کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس میں سے اکثر کا تعلق امن عالم کے اس علمبردار سے ہے جس نے اس افسانوی سامراج کی جگہ لے لی ہے جس سے دنیا عرب کے انقلابی ہیرو برسر پیکار ہیں اور جس کی زبانی مخالفت کو ترقی پسندی تصور کرتے ہیں۔

گذشتہ تیس برس کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی کیمپ سے تعلق جوڑنے سے جو سب سے اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے، وہ ماتحتی اور روس کی غلامی و بندگی ہے اور خود اعتمادی کا فقدان ہے اس سے کوئی ملک مستثنیٰ نہیں ہے۔ مشرقی یورپ کے وہ ممالک جنھوں نے روس کی وفاداری قبول کی یا ان کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا وہ علمی وصنعتی ترقی کے باوجود روسی سیاست اور ماسکو کے حکمراں ٹولہ کی خواہشات کے پوری طرح پابند ہیں، وہ اس کی مرضی کے خلاف کسی سے دوستی بھی نہیں کر سکتے اور جب بھی مشرقی یورپ کے کسی لیڈر کی جانب سے تصرف کی آزادی یہاں تک کہ تجارت اور تعلیم حتی کہ غیر کمیونسٹ پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کوئی بھی مخفی اشارہ ہوتا ہے تو اس لیڈر کے لئے سیاسی یا حقیقی سزائے موت لکھ دی جاتی ہے اور اس

کی تمام خدمات بے نتیجہ ثابت ہوجاتی ہیں، رہی خوشحالی اور اقتصادی ترقی جس کے لئے عوام کے سارے حقوق سلب کر لئے جاتے ہیں اور عوام کو تربیتی کیمپ کی زندگی گزارنی پڑتی ہے اس کا اندازہ صرف پولینڈ کے اعداد وشمار میں کیا جاسکتا ہے۔ مغربی یورپ اور امریکہ کے بینکوں کا جو پولینڈ پر قرض ہے اس کی قیمت ۳۶ ملین ڈالر ہے پولینڈ اس قرض کو کسی حال میں ادا نہیں کرسکتا اس کے برعکس صرف سود کا ایک حصہ ادا کرنے کے لئے پولینڈ مغربی بینکوں سے مزید ۳۵۰ ملین ڈالر کا قرض چاہتا ہے تاکہ پانچ سو ملین ڈالر کا کچھ حصہ ادا کرسکے۔ مغربی ملکوں کے بائیکاٹ کے نتیجہ میں پولینڈ کے لوگ بھکمری سے دوچار ہیں، اگر یہ بائیکاٹ جاری رہے تو بڑی تعداد میں لوگ موت کا شکار ہوسکتے ہیں، روس اس کی مدد اس لئے نہیں کرسکتا کہ وہ غذا اور دوسری ضرورتوں میں خود غیر ملکوں کا محتاج ہے اسی وجہ سے گھٹن اور دل برداشتگی کے آثار اشتراکی دنیا میں ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں، مشرقی یورپ روسی قبضہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کررہا ہے جس کا مظاہرہ گزشتہ بیس سالوں میں کئی ملکوں میں ہوچکا ہے۔

جن عرب ملکوں نے اشتراکیت کو اختیار کیا ہے، ان کی اقتصادی بدحالی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، ان حالات میں صرف سخت گیر فوجی حکومتیں روس کے فوجی مشیروں کے ذریعہ عوام کو اپنے جذبات اور خواہشات کو ظاہر کرنے سے روکے ہوئے ہیں، جب کوئی حاکم اس میں ناکام ہوجاتا ہے تو وہ بدل دیا جاتا ہے۔ شام، یمن اور لیبیا میں روسی مشیروں کی تعداد فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں ان ملکوں میں نظام کی تبدیلی یا زندگی میں کوئی اصلاحی کوشش روس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتی اور اگر اس کے آثار ظاہر ہوں اور ان حکومتوں کو خطرہ لاحق ہو تو روس مدد کی دعوت کا دعویٰ کرکے براہ راست مداخلت کرسکتا ہے جو اس کے نزدیک عوام کی مدد، ترقی کی رفتار کو باقی رکھنے اور سامراج سے حفاظت اور دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے

اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے اور جس پر وہ بڑی پابندی اور اخلاص کے ساتھ عمل پیرا ہے، اس کے کارخانوں کی آواز پر اس کے ٹینکوں کی آواز ہمیشہ غالب رہتی ہے، البتہ اس کے ریڈیو اور وسائل ابلاغ میں کارخانوں کی آواز اور انسانی حقوق کے نغمے زیادہ طاقت میں سنائی دیتے ہیں۔

روسی اثر اور نفوذ، بلکہ کمیونسٹ نظام کی بقا اب صرف فوجی وسائل کے ذریعہ ممکن ہے، اس نظریہ کا کھوکھلا پن اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ناکامی کھل کر سامنے آچکی ہے، اگر مغربی ممالک کسی وقت سنجیدگی سے اشتراکی دنیا کا اقتصادی بائیکاٹ کردیں تو دنیا دیکھ سکتی ہے کہ کمیونزم نے ان ملکوں کو جہاں اس کے نافذ کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور ساری آزادیاں سلب کرلیں گئیں اور آہنی حصار میں ایک مدت گزاری گئی، کیا دیا، اور ان ملکوں کے کتنے مسائل حل ہوئے۔

غالباً روس کے مفکر اس نزاکت کو سمجھنے لگے ہیں، اسی لیے اب وہ فوجی طاقت پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، بہ نسبت نظریاتی یا عقلی جدوجہد کے، اور اس طرح وہ اب اس راستہ پر گامزن ہے جو راستہ سامراجی طاقتوں کا راستہ ہے۔

آزادی نسواں - ایک فریب پیہم (☆)

آزادی نسواں ایسا پرکشش اور جاذب نظر موضوع ہے کہ مرد وزن دونوں ہی پر اس کا جادو برابر چلتا ہے گویا کہ عورت کی آزادی ملک کی ترقی کا پہلا زینہ اور حصولِ زر کا وسیع سرچشمہ ہے چنانچہ عورت کی آزادی کے علمبرداروں کا یہ خیال ہے کہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں مقید رکھنا دراصل نصف سے زائد ملکی باشندوں کی عملی قوت کو معطل کر دینا ہے اس لئے جب بھی کسی شہر کی ترقی اور اس کے مسائل کو سلجھانے کے ذرائع تلاش کئے جاتے ہیں تو مغربی ذہنیت زدہ سرفہرست عورت کو "چراغ خانہ" کے بجائے "شمع انجمن" کی حیثیت اور مردوں کے مساوی حقوق دلانے کا مطالبہ پیش کرتے ہیں اور انہیں اس کی قطعاً فکر نہیں ہوتی کہ ملک میں لاکھوں آدمی تعطل و بے کاری کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کو روزگار نہیں ملتا، اور نہ تعلیم کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، نہ ان کو اس کا خیال ہے، کہ ایک ماں اور بیوی کی حیثیت سے عورت کے اپنے فرائض وذمہ داریوں سے کنارہ کشی کیوجہ سے بچوں کی تربیت کا کیا نظم ہوگا اور اگر اس کے لئے باہر سے کھلانے والیاں، یا دایہ کا انتظام کیا جائے تو بچوں پر ان کی تہذیب اور عقیدے، اور زبان پر کیا مضر اثرات پڑیں گے اور ان کے اخلاق کی تعمیر کس شکل میں ہوگی۔

عورت سے حد سے زیادہ ہمدردی ومحبت کا اظہار کرنے والے انہی طریقوں سے طلاق، ازدواجی بندشوں اور نکاح ثانی کے متعلق اپنے رنج وملال کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ چیزیں ملک کی تہذیبی وتمدنی ترقی کی راہ میں سنگ گراں

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۵ء۔

اور ناموس عورت کے لئے باعث اہانت ہیں، چنانچہ آزادیٔ نسواں کے علمبردار بعض معاشی، انسانی اور اجتماعی وجوہ کے پیش نظر عورت کی آزادی اور طلاق ونکاح کے قوانین میں اصلاح وترمیم کی تجویز پیش کرتے ہیں، لیکن صورت حال سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کا مطالبہ اخلاص پر مبنی نہیں ہے اور نہ وہ قومی مفاد میں ہے، دراصل ملک کی تعمیر وترقی سے کہیں بڑھ کر عورتوں کو سر بزم لاکر اپنے کام ودہن کے لئے لذت وشناسائی اور سیر وتفریح کا سامان کرنا ان کا اہم مقصد ہے۔

اس کی زندہ مثال ترکی ہے جہاں یہ قانون ہے کہ طلاق اولاً تو قاضی کی موجودگی میں واقع ہوگی اور ثانیاً طلاق کے لئے اس کے اسباب کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔

ان پابندیوں کی وجہ سے طلاق کے وقوع کا تناسب بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تو ضرور ہوگیا ہے، لیکن یہ شریعت اسلامیہ کے مقصد کے منافی ہے، شریعت نے اگرچہ طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے پھر بھی اسے حلال کہا ہے، کیونکہ بسا اوقات طلاق بعض ایسے سنگین بحران ومسائل کا حل ثابت ہوتی ہے، جن کی وجہ سے انفرادی واجتماعی زندگی مسلسل غم وپریشانی اور یاس وحرمان نصیبی کا شکار ہوکر رہ جاتی ہے۔

ترکی قانون کی رو سے شوہر دوسری شادی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک دوسری بیوی کو طلاق نہ دیدے تیسری اور چوتھی شادی کا تو ذکر ہی کیا۔

اس طرح دوسری شادی اور طلاق پر پابندیاں عائد کرکے ترکی نے اپنے معاشرہ کو عین مغربی مسیحی سوسائٹی سے ہم آہنگ کردیا ہے جہاں نہ طلاق کا کوئی تصور ہے اور نہ ہی دوسری شادی کا، اس لئے مغربی معاشرہ مسائل، آزمائشوں اور اخلاقی انارکی اور جنسی بے راہ روی کے زبردست بحران سے دوچار ہے۔

ترکی قانون نے مطلقہ کی رہائش کا حق دے کر ترکی عورت کو ایک امتیاز بخشا لیکن دراصل ترکی نے شادی کو تماشہ اور مادی وتجارتی منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بنادیا۔

ترکی نے دین کے خلاف بغاوت کی اور زندگی کے تمام شعبوں میں یہاں تک کہ عقائد وعبادات میں بھی مغرب کے مادی قانون کو اختیار کیا، اپنے اسلامی تاریخی ذوق ومزاج کو خیر باد کہا، لیکن ترکی اب بھی نہ صرف کارواں سے بہت دور ہے بلکہ وہ طرح طرح کے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، یہ مسائل اس قدر سنگین اور حوصلہ شکن ہیں کہ انہیں بم وبارود کے سوا کوئی طاقت حل بھی نہیں کرسکتی۔ ترکی عوام آج بھی طاقت واقدار کے آہنی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں، بہر کیف عورت کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر عام زندگی میں مردوں کے دوش بدوش لاکر لذت وتفریح، بداخلاقی بگاڑ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، اور ترکی کا نام عریانیت وبے حیائی کے لئے دنیا میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس ماحول سے وہی لوگ اپنا دامن بچا سکے جنہوں نے عام زندگی کی ہمہ ہمی سے الگ تھلگ رہ کر طوفان کے بلاخیز جھونکوں میں بھی اپنے اخلاقی اقدار وآداب کو حرز جاں بنایا اور ذاتی طور پر اپنے کو دین سے وابستہ رکھا۔

آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہم آزادی کی بدولت عورت کو ملک کی فلاح وبہبود میں مردوں کے دوش بدوش لاسکتے ہیں اور عورت کی اقتصادی پوزیشن کو مضبوط سے مضبوط تر بنا سکتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے خلیجی ممالک میں بیرونی باشندوں کی ملازمت کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والی ایک کمیٹی نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ بیرونی ملازمین کے بجائے کیوں نہ عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ ملکی کاموں میں ہاتھ بٹانے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ بیرونی ملازموں سے بے شمار سیاسی اور اجتماعی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ان ملکوں میں جہاں آزادی کا تناسب نسبتاً کچھ کم ہے۔ لیکن ترکی خود اس دلیل کی ناکامی کی بہترین مثال ہے، مصری جریدہ ''الاخبار'' کے مطابق ترکی کی اقتصادی حالت بہت پسماندہ ہے،

چنانچہ ترکی کے وزیراعظم کا خود بیان ہے کہ ترکی اقتصادی حالت اس درجہ پسماندہ ہوگئی ہے کہ مجبور ہوکر ترکی نے اس کی تلافی کے لئے چند اقدامات کئے، اس اقتصادی پسماندگی کو مثال سے ثابت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تین سال سے قبل باشندگان ترکی کو دوسال میں صرف ایک مرتبہ سفر کرنے کی اجازت ملتی تھی اور ایک بیگ اور چار سو ڈالر سے زیادہ ہمراہ لے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ سفر اور دوران سفر میں دولت کے حصول اور اس کے خرچ پر اس طرح کی پابندیاں اقتصادی طور پر پسماندہ ممالک میں عام طور سے رائج ہیں، خاص طور سے اشتراکی معاشرہ میں جہاں افلاس اور فقر طرہ امتیاز بن گیا ہے۔ ٹھیک یہی مسائل ان اشتراکی مسلم ملکوں کا بھی ہے جو اقتصادیات کے اشتراکی اصول کو اپنائے ہوئے ہیں اس سے قبل ترکی سرمایہ دارانہ ممالک کا دست نگر تھا، سرمایہ دارانہ نظام میں اقتصادیات کا میدان آزاد اور کشادہ سمجھا جاتا ہے لیکن افسوس کہ ترکی نے اس میدان میں بھی کوئی ترقی حاصل نہیں کی اور پسماندہ کا پسماندہ ہی رہا۔

ترکی کے نقش قدم پر بعض دوسرے اسلامی ممالک بھی پرسنل لا میں ترمیم اور یورپ کی طرح عورتوں، مردوں کے مساوی حقوق دلانے کے درپے ہیں، ان ممالک میں سرفہرست مصر ہے، جہاں یہ مسئلہ صحافیوں کا موضوع بنا ہوا ہے، طلاق پر پابندی عائد کرنے اور شریعت کے دائرہ سے ہٹ کر عورت کی پوزیشن متعین کرنے کی کوششیں ماضی میں بھی ہوئی ہیں اور اس سلسلہ میں قانون سازوں کو بعض ''روشن خیال'' علماء کی حمایت بھی حاصل ہوگئی ہے تحریک آزادیٔ نسواں کو مصر میں بڑی حد تک شہرت وقبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ پردہ بچوں کی تربیت کے لئے عورتوں کا گھر میں مقیم رہنا اور معاشرہ کی تعمیر کرنا ناقابل تصور بن گیا ہے، اور مصری عورتیں گھر سے نکل کر آزادانہ مردوں کے دوش بدوش سرگرم عمل نظر آنے لگی ہیں۔ لیکن مصر بھی ترکی کی طرح

زبوں حالی میں مبتلا ہے اور پس ماندہ ممالک میں شامل ہے اور ایسی پریشانیوں کا شکار ہے، جو قرض ہی سے دور ہو سکتی ہیں، مزید برآں عورت کے مردوں کے شریک کار ہونے کی وجہ سے اخلاقی انارکی اور لہو ولعب کا دور دورہ ہے دفاتر اور کارکردگی کی جگہوں میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کی موجودگی نے کارکردگی پر اثر ڈالا ہے اور سیر وتفریح کے مواقع میں اضافہ ہو گیا ہے، بجائے اس کے کہ کارخانوں کا اضافہ ہوتا، ملک کی معیشت بہتر ہوتی، مصر میں قہوہ خانے، تفریح گاہوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس طرح سے مصر نے آزادی نسواں سے جو کچھ ترقی حاصل کی اس کا اثر ''فن'' و ''ثقافت'' کے حدود ہی میں سمٹ کر رہ گیا۔

ان دو مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی نسواں کی تحریک کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں، یہ دو ملک ایسے ہیں جہاں عورتوں کو آزادی حاصل کئے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، لیکن وہ مقاصد جن کے لیے یہ اقدامات کئے گئے، ابھی تک خواب وخیال ہیں۔

سیکولرزم کا نیا مفہوم (☆)

مغربی مفکرین نے ایک بڑا مغالطہ یہ پیدا کر دیا ہے کہ یہ عہد سیکولرزم کا عہد ہے، دین کا اثر ورسوخ ختم ہو چکا ہے، دین ایک شخصی مسئلہ ہے، دین کا معاشرتی زندگی اور ملکی اور عالمی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک دوسری قوموں کے ساتھ آزاد تبادلہ کی بنیاد پر معاملہ کرتے ہیں، عملی تجربات ومعلومات کا تبادلہ عقیدہ اور نظریاتی مفاد سے بلند ہو کر کرتے ہیں۔ مسلم دانشوروں نے اس دعوے کو بغیر مطالعہ اور حالات کا جائزہ لئے بغیر قبول کر لیا اور بڑے خلوص سے اپنے سماج اور ملک پر اسکو نافذ کرنے کی کوشش کی، اس لئے کہ مغربی تعلیم کے اداروں میں اور خاص طور سے ان تعلیم گاہوں میں جہاں اونچے گھرانے کے مسلمان بچے پڑھتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ سے لے کر پرائمری اسکول کے ٹیچر تک ہر ایک نے ان افکار ونظریات کو عام کرنے میں اپنے سارے وسائل جھونک دیئے تھے، اس سیکولر نظریہ کے عام ہونے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک خطرناک رجحان یہ پیدا ہو گیا کہ ان کی غیر مسلموں سے راہ ورسم بڑھ گئی اور اپنے سماج سے تعلق کمزور ہو گیا، وہ ان کی پوری طرح نقالی کرنے لگے، ثقافتی اقدار اور دینی فرائض سے بیگانہ ہو گئے، مسلم عوام سے کٹ گئے اور ان کے ذہن اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں زہریلے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے خود اپنے دین سے وابستگی کو ترقی اور تہذیب کے خلاف سمجھنا شروع کر دیا، ان میں یہ تصور عام ہو گیا کہ دین سے وابستگی نئی تہذیب کے خلاف ہے، لیکن اس کے برخلاف ترقی یافتہ ممالک جنھوں نے

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اپریل ۱۹۸۶ء۔

مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا، خود اپنے کو دین سے الگ نہ کر سکے، ان کی دین سے وابستگی اور اپنی قومی تہذیب سے دلچسپی کسی پر مخفی نہیں ہے، جن ملکوں کے مسلم ممالک سے ثقافتی تعلقات ہیں اور جن سے زندگی کے مختلف میدانوں میں بڑے پیمانہ پر لین دین ہوتا ہے اور جن ترقی یافتہ ممالک پر ترقی پذیر اسلامی ممالک اعتماد کرتے ہیں ان ملکوں کے قائدین، صحافی اور اہل قلم مسلم ممالک، مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں نفرت اور امتیازی تصور سے پاک نہیں ہیں، وہاں کی صحافت، خبر رسانی کے دوسرے وسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سوشل میڈیا، اخبارات ورسائل، خبر رساں ایجنسیاں یہاں تک کہ انسانی خدمت انجام دینے والے رفاہی ادارے بھی دین وعقیدہ کی بنیاد پر تفریق پیدا کرنے کے کسی موقع کو ضائع نہیں کرتے ہیں۔

افریقہ کے قحط زدہ لوگوں کی امداد میں کھلی ہوئی جانبداری دیکھنے میں آئی، ساری غیر مسلم ریلیف ایجنسیاں کسی آفت یا حادثہ کے وقت دین کی بنیاد پر تفریق کرتی ہیں۔ ریڈ کراس سوسائٹی بھی اس امتیازی سلوک سے محفوظ نہیں ہے، یہ خدمت کرتے وقت عیسائی بنانے کا جذبہ رکھتی ہیں، یا کم از کم اسلام سے دور کر کے اسلامی معاشرہ سے کاٹ دینے کی خواہش، اسی طرح امریکہ، فرانس اور برطانیہ اسلامی ممالک میں رہنے والے عیسائیوں کی سلامتی وحفاظت کے لئے کھل کر ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مصر وسوڈان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے مطالبہ پر مغربی ممالک نے جو اپنے کو سیکولر کہتے ہیں عیسائیوں کی کھل کر وکالت کی اور مسلم حکومتوں کو اس سے روکنے کی کوشش کی، مغربی ممالک کی ایک بڑی خواہش یہ رہی ہے کہ اسلامی ممالک زندگی کے میدان میں خود کفیل نہ ہونے پائیں اور وہاں کے حالات میں سدھار نہ پیدا ہو، وہ ہمیشہ انتشار پھیلانے والی تحریکوں، اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنے والی جماعتوں کی مدد کرتے ہیں اور اسلامی عقیدہ کی غلط ترجمانی کرنے والوں کی پشت پناہی کرتے ہیں تعمیری ذہن اور صحیح

جذبہ رکھنے والے قائدین اور مفکرین کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، اور کردار کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اقتدار تک ایسے لوگ پہنچیں جن کے ذہن قوم اور مذہب کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہوں، اور وہ غیر اسلامی تصورات رکھتے ہوں، یہ ترقی یافتہ ممالک کبھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ اسلامی ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہوں اور وہاں کے باشندے اس سے فیضیاب ہوں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ انتشار پسند تحریکیں ملک کے بنانے، سنوارنے اور اپنے عوام سے رابطہ بڑھانے کے بجائے مغربی آقاؤں کی خوشنودی اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں مشغول رہتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور خاص طور سے مسلم ممالک میں عیسائی مشینری کا کام پھیلا ہوا ہے، بعض مسلم ملکوں میں ان کے ریڈیو اسٹیشن، ہوائی اڈے، اسپتال اور رفاہی ادارے ہیں جن کی سرپرستی مغربی ممالک کرتے ہیں، لیکن اس ملک میں کوئی اسلامی ادارہ قائم ہو تو یہ ممالک فکرمند ہو جاتے ہیں، اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ سیاست کو دین سے الگ کرنے کا نعرہ یک طرفہ ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو روز روشن کی طرح عیاں ہے، کوئی بھی مغربی ملک یا غیر اسلامی ملک چاہے جتنی ترقی کر گیا ہو دینی نسبت سے خالی نہیں ہے، کئی مغربی ممالک مشینری سرگرمیوں پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں اور عیسائی پادری کا حکومت پر کنٹرول ہے، اسلامی ممالک میں رہنے والے عیسائیوں کے مسائل سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ اسلامی بیداری کا مقابلہ کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کرتے ہیں ،اسلامی تحریکوں کی سرگرمیوں کے خاتمہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور اسلامی ممالک میں شرعی قوانین کے نفاذ کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جو ان ممالک کی دین سے وابستگی پر ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے سلسلہ میں یہ جانبدارانہ رویہ صرف ترقی یافتہ ممالک ہی کا شعار نہیں ہے، ان کو تو اس راہ پر صلیبی جنگوں کی یادوں نے، اسلامی فتوحات سے پہنچنے والے نقصانات نے اور ان فوجی شکستوں نے ڈالا ہے جن سے وہ

اپنے سیاسی حربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے بعد نکل سکے۔ وہ اسلام سے خوف زدہ ہونے میں معذور بھی قرار دیے جاسکتے ہیں، اس لئے کہ اسلام ایک ناقابل تسخیر قوت تھا اور ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ عالم اسلام پر یورپ کی برتری فوجی برتری کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ دجل وفریب کی سیاست نے یورپ کو اس منزل تک پہنچایا ہے، مسلمان مغربی تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب ہونے کے باوجود آج بھی وہ جذباتی قوت رکھتا ہے، جو حقائق وقیاسات اور جنگی نقشوں کو زیروزبر کرسکتا ہے لہذا یورپ کی سیاست میں تعصب کا عمل دخل ہونا کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یہ جانبدارانہ رویہ ایشیا اور افریقہ کے بعض ایسے ممالک کا جز بن گیا ہے، جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، وہ اس تعصب کا شکار ہیں اور اسلام سے اپنی نسبت کی قیمت چکا رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں، یہ امتیازی سلوک صرف عملی مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کے مسلمان اس کا نشانہ بنتے ہیں، تعصب کا شکار ہونے کے لئے اسلامی نام کا ہونا کافی ہے اگرچہ خود مسلمان اسلام پر عمل نہ کرتے ہوں، اور اپنے آپ کو سب سے بڑا سیکولر ثابت کرتے ہوں، ان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ قومی دھارے میں شامل ہوں، ان کے اسلامی نام ناگوار ہوتے ہیں، ان کی زبان اور تہذیب کھلتی ہے، ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرتی عادات واطوار ترک کردیں اور ان کے اندر کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے جو ان کے مسلمان ہونے پر دلالت کرتی ہو، یہاں تک کہ شادی، طلاق، اور وراثت میں اسلام کی پابندی کو ملک کے مفاد کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اکثر ترقی پذیر ممالک میں مسلمانوں کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے جارہے ہیں وہ اس حاسدانہ ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں جس کی بنیاد دین پر ہے، ان ممالک کو اپنے تعمیری پروگراموں سے اپنے مسائل کو حل کرنے سے، معیشت کے معیار کو بلند کرنے سے، ایڈمنسٹریشن میں پھیلے ہوئے کرپشن، بڑھتی ہوئی جہالت

اور سماجی ظلم کو روکنے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی اقلیتوں کو اکثریت کے دین اور ثقافتی رنگ میں رنگنے سے ہے، انھوں نے علیٰحدگی اور تشدد پسند، امن وامان اور نظم ونسق کو درہم برہم کرنے والی تحریکوں کو چھوٹ دے رکھی ہے اور مسلمانوں کے ذہن کی نئی تشکیل کر کے اکثریتی فرقہ کے افکار وخیالات کے مطابق ڈھالنے کے مسئلہ کو سرفہرست رکھا ہے، گویا یہ عمل ہی تہذیبی وثقافتی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا پہلا قدم ہے۔

بلغاریہ، برما، یوگوسلاویہ، البانیہ اور دوسرے بہت سے کمیونسٹ ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی اس سے الگ واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ عالمی سیاست کا ایک جزء ہے، بس فرق یہ ہے کہ بعض ممالک کھلم کھلا یہ موقف اختیار کرتے ہیں اور بعض دوسرے ممالک خاموشی کے ساتھ کسی دوسرے عنوان کا سہارا لے کر یہ کام کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان ایک زبردست غیر اعلان شدہ جنگ سے دوچار رہتے ہیں، اس زمانے میں دین کی بنیاد پر امتیازی سلوک کرنا ایک عام ذہنیت ہے کسی بھی ملک نے اخلاص کے ساتھ سیکولر نظریہ قبول نہیں کیا۔ اگرچہ اس کا پروپیگنڈہ خوب کیا جاتا ہے ہر ملک نے اپنے ملک کی اکثریت کے دین، تہذیب اور زبان کے احیاء اور ترقی کے وسائل اختیار کرتا ہے اور اس کے مخالف رجحانات کو کنٹرول کرتا ہے۔ صرف اسلامی ممالک جن کی باگ ڈور مغربی نظام تعلیم کے پروردہ قائدین کے ہاتھ میں ہے وہ سیکولرزم پر خلوص سے عامل ہیں۔

ان کے یہاں غیر اسلامی افکار وتحریکات کو پوری آزادی حاصل ہے وہ اپنے ملک میں اکثریت کی مرضی کے خلاف دشمنان اسلام سے دوستی اور ان پر مکمل اعتماد کرتے ہیں، اس کے بعد بھی وہ اپنے مغربی آقاؤں کے معتمد بننے کے قابل نہیں بن سکے اور وہ ان کی نگاہوں میں متعصب اور بنیاد پرست مسلمان ہیں، اللہ رب العزت نے اس کی خوب ترجمانی کی ہے۔

ولن ترضیٰ عنك الیهود و لا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتهم قل ان هدی الله هو الهدیٰ ولئن اتبعت أهواء هم بعد الذی جاء ك من العلم مالك من الله من ولی و لا نصیر (سوره بقره آیت ۱۲۰)

''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ کو نہ اپناؤ تم صاف صاف کہدو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے اور اگر بالفرض تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی گرفت سے تم کو بچانے والا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا''۔

یہ ذہن تعمیری نہیں ہے (☆)

ہندوستان میں لسانی، مذہبی اور ثقافتی اقلیتوں کو آپس میں ضم کردینے اور ان کو ایک طرز حیات اور ایک ہی قسم کی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرنے کی وہ مہم جو انتہا پسند حلقے چلا رہے ہیں کچھ عرصہ سے زیادہ وسیع ہوگئی ہے، اس مہم کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ یہ اقلیتیں تاریخ، سیاست ومعاشرت، عقیدہ وزبان، اخلاق وعادات، طرز حیات اور دوسرے امور میں اسی طرح کے افکار وتصورات قبول کرلیں جس قسم کے افکار واعتقادات پر اکثریت عامل ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان حلقوں نے پوری دنیا میں وثنیت واصنام پرستی کی پیشوائی ولیڈری کی قیادت اور سرپرستی اختیار کرلی ہے، اور آسمانی تعلیمات سے دشمنی کے اظہار میں انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، خواہ ان کا تعلق اسلام سے ہو یا مسیحیت سے یا یہودیت سے۔ اسی طرح یہ حلقے سامی نسل کے بارے میں اپنے معاندانہ تصورات کے اظہار میں کوئی حجاب نہیں محسوس کرتے۔ وہ آرین نسل کے فضل وعظمت اور شکوہ وشوکت کا دعویٰ کرتے ہیں، اور سامی اقوام پر جہل وانتہا پسندی، بزدلی وخونریزی، تحزب وتعصب اور اسی طرح کے دوسرے گھناؤنے الزامات لگاتے ہیں جن کی اخبارات میں اشاعت ہوتی ہے۔ ان رجحانات وخیالات کا اندازہ ان بیانات سے کیا جاسکتا ہے جو آسمانی مذاہب کے مخالف حلقوں کے لیڈران وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں۔ ان میں سرفہرست بلراج مدھوک، بالا صاحب دیورس اور بال ٹھاکرے ہیں۔ ان کے بیانات میں

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور غیر آرین قوم کی تہذیب اور خصوصی طور سے اسلام سے بغض ونفرت اور عداوت عیاں نظر آتی ہے، جس سے نسلی امتیاز کی بو آتی ہے، اسکی وجہ سے وثنیت وغیر وثنیت اور آرین وسامی نسل کے درمیان ایک کشمکش اور نفسیاتی دیوار قائم ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ جب کہ دنیا نسل پرستی اور مذہب وتہذیبی عصبیت اور علیٰحدگی پسندی کے خلاف جنگ کررہی ہے۔

یہ رجحانات جو نسلی، قومی اور نظریاتی تقسیم کی بنیاد پر قائم ہیں۔ پہلے ایک خاص ذہنیت کے لوگوں میں جن کا عوام پر کوئی اثر نہ تھا، پائے جاتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اسلام کی نشر واشاعت اور اس کے کچھ حصوں میں عیسائیت کے فروغ نے بعض قدامت پرست حلقوں کے اندر دہشت وخوف کی ذہنیت پیدا کردی ہے اور ان پر ان حالات کا ایسا زبردست اثر ہوا کہ ان کے اعصاب متاثر ہوگئے ہیں۔ اس لئے وہ عالمی رجحانات، ترقی پسند خیالات، وسعت اور رواداری کے نظریات جو دنیا میں رواج پارہے ہیں، اور عالمی معاشرہ کا تصور پھیل رہا ہے اس کو نظر انداز کرجاتے ہیں۔

نظریات اور مذہب کی ترویج اور اشاعت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ علمی اور فکری لٹریچر تیار کیا جائے۔ اپنے تصورات کو لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کی خوبیوں کو بیان کیا جائے۔ اس سے ماخوذ اور مستفاد رسوم ورواج اور طور وطریقے نیز اس کی تاریخی روایات اور اخلاقی قدروں کی طرف دعوت دی جائے اور اسکی توسیع کے لئے اپنی جدوجہد تیز سے تیز تر کی جائے، یہی معقول وفطری راستہ ہے، لیکن اس کے بالکل برعکس جو رویہ اکثریت کے بعض لیڈر اختیار کررہے ہیں وہ دوسرے مذاہب پر معاندانہ حملہ، اپنی ثقافت وتہذیب کے علاوہ تمام ثقافتوں اور تہذیبوں کے خلاف جنگ اور ان کے خلاف سازشیں کرنے کے مرادف ہے۔

ہندوستان میں مسلمان دوسری بڑی اکثریت ہیں، ان کا ملک کی تعمیر اور

تہذیبی ارتقا اور تشکیل میں ایک شاندار ماضی رہا ہے اور ہندوستان کی وحدت و تشخص میں اہم کردار رہا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کے نمائندہ پیش رو اور قائد تھے، جس کا مشاہدہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایسی تہذیب وتمدن کے علمبردار تھے۔ جو اتحاد وسالمیت، آزادی ومساوات اور مواسات کا درس دیتی تھی اور جس کے یہاں تحصیل علم وفن میں عدم مساوات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی کسی دور میں اور دنیا کے کسی ملک میں نسلی امتیاز کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے زندگی کے تمام ہی شعبوں میں اپنے سنہرے نقوش اور تابندہ آثار چھوڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نسلی تصور کی مضرت کو سب سے زیادہ مسلمان محسوس کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کی وجہ سے وہی معاندانہ رویہ کا نشانہ بن رہے ہیں اور ان کے وجود کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جارہا ہے۔ اور ہر طرح کے ذرائع ان کے شاندار آثار کو مسخ کرنے اور عہد اسلامی کے نشانات کو مٹانے کے لئے استعمال ہورہے ہیں جس کا اندازہ اکثریت کے بعض مورخین کے بیانات سے کیا جاسکتا ہے۔

ماضی میں یہ مہم محدود اور کچھ حلقوں تک مخصوص تھی۔ اس میں فقط ایک خاص ذہنیت کے اہل قلم اور انتہا پسند وفرقہ پرست تحریکات کے لیڈران شریک تھے۔ حکومت مسلمانوں کے احتجاجات پر اس قسم کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لئے کارروائیاں کرتی تھی۔ اس سے اس بات کا اقرار بھی تھا کہ بس یہی چند گنے چنے انتہا پسند عناصر ہیں جو اس قسم کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور انہی کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھوٹ پڑتی ہے۔ حکومت کا جمہوریت پہ ایمان تھا۔ وہ عنصر، عنصر کے درمیان، جنس، جنس کے درمیان، نسل، نسل کے درمیان فرق وامتیاز نہیں کرتی تھی۔ عقیدہ، عقیدہ کے درمیان تمیز نہیں کرتی تھی۔ بلکہ وہ ایسے معاشرہ اور سوسائٹی کی تشکیل کے لئے کوشاں تھی جو متعدد تہذیب وثقافت، عقائد اور زبانوں کا مجموعہ ہو، نیز

دستور بھی ہندوستان میں بسنے والے تمام فرقوں کے حقوق کا ضامن تھا۔ اقلیتیں اپنی ثقافت وتہذیب زبان وعقائد کے سلسلے میں دستور کی ضمانت سے بہرہ اندوز ہوتی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کو اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے عقیدے کے موافق تعلیم دے سکتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت وقتاً فوقتاً اقلیتوں کو جمہوریت کی سیاست سے مطمئن کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیا کرتی تھی۔

لیکن تعلیم وتربیت کے جدید لائحہ عمل نے جس کو خود حکومت نے تیار کیا ہے اور جس کے نفاذ کے لئے تربیتی کورس کا نظم کیا جارہا ہے، اس خطرے کا اعلان کردیا ہے کہ اب خود حکومت ہندوستان میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تصور کے بجائے ایک تہذیب وثقافت کے تصور کو قبول کرتی جارہی ہے۔ یہ لائحہ عمل صرف تعلیمی نصاب اور طریقۂ تعلیم پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ ثقافتی، تہذیبی، اخلاقی اور فکری تربیت تک وسیع ہے۔ اخباری رپورٹوں کے ذریعے ان تربیتی کورسوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کورسوں میں مقرر کردہ ذہن ساز معلمین ٹریننگ کے دوران ثقافتی وتہذیبی پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں اور وشنی تہذیب وثقافت اور کلچر کو دوسرے تمام طرز حیات اور طرز معاشرت پر افضل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جب بچہ صبح سو کر اٹھے تو اس دن کا استقبال کیسے کرے؟ اس سوال کے جواب میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ آسمانی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جس میں خدائے واحد کی تعظیم کی تعلیم دی جاتی ہے، زمین کی تقدیس، ماں کی تقدیس یا کسی انسان یا بت کی تقدیس ان تعلیمات کے خلاف ہے جن پر آسمانی مذاہب کے ماننے والے عامل ہیں اور وہ اپنے بچوں کو اسی پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح باہم گفتگو کے آداب کے متعلق بچوں کو وہی طریقے اختیار کرنے کی نصیحت کی جاتی ہے جو ہندوستان کے محدود قدیم تصورات کے مطابق ہیں۔ جیسے احتراماً زمین کو بوسہ دینا، گھٹنوں کو زمین پر ٹیکنا وغیرہ۔ یہ صورت

حال اس لئے بھی پائی جاتی ہے کہ خود ان معلمین کا تعلق ایک خاص مذہب یا تہذیب سے ہے اور ان کا ان طریقوں کو اختیار کرنا، رسم ورواج اور گھریلو ماحول کے اثر کے نتیجے میں ہے۔

آداب اکل وشرب میں بھی اسی ثقافت اور کلچر کی تعلیم دی جاتی ہے جو ایک خاص مذہب کے تصور سے ماخوذ ہے۔ مثلاً علیحدہ علیحدہ کھانا کھانا۔ بچوں کے سامنے اس بات کی وضاحت وتشریح کی جاتی ہے کہ اجتماعی طور سے ایک برتن میں کھانا کھانے سے طبی نقصانات ہیں۔ گوشت خوری کے نقصانات پر زور دیا جاتا ہے۔ اور سبزی خوری کے نفسیاتی اور اجتماعی فوائد کو نمایاں کیا جاتا ہے جو ایک طبقہ کا تصور ہے۔ طلبہ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ خوں ریزی اور سفاکی کا سبب یہی گوشت خوری ہے، حالانکہ یہ تصور اب محدود طبقہ کے علاوہ کہیں نہیں پایا جاتا۔

قدیم ثقافت کے نشاۃ ثانیہ کے لئے حقائق کو مسخ کرنا اور دوسری تہذیبوں پر حملہ کرنا ترقی یافتہ تصور نہیں ہے۔ اسی طرح دوسروں کی تاریخ کو مسخ کرنے سے اپنی تاریخ شاندار نہیں بنتی ہے۔ تاریخ کے سلسلے میں طلبہ کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد مصدر وماخذ قدیم تاریخ ہند ہے جس کی طرف رجوع کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح دوسرے ثقافتی وفکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے جن پر مکمل طور سے ہندوانہ نقطۂ نظر غالب ہے۔

آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اس قسم کے خیالات محدود تھے اور صرف انہی تربیتی کیمپ تک محدود تھے جنھیں انتہا پسند تنظیمیں لگاتی تھیں۔ مسلمان ان کیمپوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن یہ تعلیمی وتربیتی کیمپ جنھیں خود حکومت لگا رہی ہے وہ مخلوط ہیں اس لئے ان کے نقصانات زیادہ وسیع ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انتظامیہ نیز تعلیمی وتربیتی اداروں میں انتہا پسند عناصر کا اثر بڑھتا جارہا ہے۔

پہلے مسلمان شکوہ کرتے تھے کہ پولس ہمیشہ ظالم فریق کی ہمنوائی کرتی ہے اور محکمۂ نشر واشاعت ہمیشہ اکثریت کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتا ہے۔ پھر مسلمانوں کی طرف سے یہ شکایت آئی کہ جج حضرات کی نگاہیں اکثریتی فرقہ کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اور وہ عدل وانصاف کو پس پشت ڈالتے ہوئے۔ اپنی خواہشات اور قلبی تاثرات کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ اور اب یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ تعلیمی حلقہ بھی ایک ہی فرقہ کے احساسات وجذبات کا طرفدار ہوگیا ہے۔ لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر اور فرقہ پرستانہ رخ کو درست کرنے کے سلسلے میں کوئی اقدام نہ کیا گیا اور اس جانب سے چشم پوشی برتی گئی تو ہندوستان میں اقلیتیں عنقریب اپنا تشخص کھو بیٹھیں گی، اور اگر ان کی طرف سے کوئی جدوجہد شروع ہوئی تو طبقاتی کشمکش پیدا ہوگی جو اس ملک کے لئے جس کے مسائل کی کوئی حد نہیں ہے سخت مضر ہے۔ اس لئے حکومت کو جو اپنے دستور اور اعلان شدہ پالیسی اور جماعت کے منشور کے اعتبار سے وسیع تصور کی حامل ہے اور اس کے لیڈر وقتاً فوقتاً وسیع قومی تصور اور کردار کا اعلان بھی کرتے ہیں، اس محدود تصور کو پھیلنے سے روکنا چاہئے۔

تنگ نظری کا مرتکب کون؟ (☆)

مغربی قائدین اور مغرب زدہ اہل قلم، اسلام اور مسلمان کے بارے میں تنگ نظری، بنیاد پرستی اور تشدد پسندی کی تعبیرات استعمال کرتے رہتے ہیں جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں پر حرف زنی کرنا اور دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے اسلامی معاشرے کو ایک تاریک ترین معاشرہ ثابت کرنا ہوتا ہے جو درحقیقت سامراجی طاقتوں یا سامراج کے اشارہ پر چلنے والے کے جبر وتشدد کی وجہ سے حقیقی آزادی سے محروم ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ اس وجہ سے پسماندہ ہیں کہ انہوں نے کی ان تعلیمات کی پابندی اختیار کی ہے جو ان کے نزدیک قرون مظلمہ کے معاشرہ کے لئے خاص تھیں اور ان تعلیمات میں جبر وتشدد اور اکراہ کی تعلیم دی گئی ہے، اس تصور کے لئے وہ کارٹونی تصویریں اور سیاسی واجتماعی جائزے پیش کرتے ہیں، جس سے مغربی اہل قلم کی اسلام دشمنی کا پتہ چلتا ہے اور اسلامی معاشرہ کی پسماندگی کی تصویر سامنے آتی ہے، وہ اہل قلم دنیا کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر اسلام کے ماننے والے جو ان کے نزدیک انتہا پسند اور قدامت پرست ہیں، برسر اقتدار آگئے یا ان کو تسلط حاصل ہوگیا اور اسلامی شعور بیدار ہوگیا تو موجودہ تہذیب خطرے میں پڑ جائے گی اور انسانی قدریں معدوم ہوجائیں گی۔

یہ اہل قلم دنیا کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرنے میں لگے ہیں کہ مسلم معاشرہ جس بدحالی سے دوچار ہے اور اس میں جو المیے، حادثے، ظلم وزیادتی اور قتل

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اگست ۱۹۸۸ء۔

وغارتگری کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اس کی وجہ سے صرف اور صرف یہ ہے کہ اس نے اسلام کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتا ہے۔

مزید برآں مسلم شخصیات پہ حرف زنی کی جاتی ہے اور مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کی سرگرمیوں کو بنظر احتقار دیکھا جاتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا کہ ان کے یہ اعمال اور سرگرمیاں مغرب کی تقلید اور نقالی میں سرزد ہو رہے ہیں یا مغربی حکمرانوں کی طرف سے پیدا شدہ حالات کے نتیجہ کے طور پر رونما ہو رہے ہیں، اس کے برعکس جو بھی برائیاں ہوتی ہیں ان کا سررشتہ دین و مذہب اور قرآن سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

ان تبصروں اور تحریروں کو چونکہ ذرائع ابلاغ ونشر وشاعت کا تعاون حاصل رہتا ہے اس لئے یہ بڑی تیزی سے دنیا کے قریب وبعید علاقوں میں رائج اور عام ہو جاتی ہیں، اس کے مقابلے میں اسلامی اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد عشر عشیر بھی نہیں ہے اس لئے کہ حکومت کی طرف سے ان اخبارات پر سخت پابندیاں عائد ہیں، اسی وجہ سے مغربی ذرائع ابلاغ جس من گھڑت افسانہ کو بھی عام کرنا چاہتے ہیں بڑی آسانی سے وہ عام ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ انہیں ایسی باتیں سننی اور دیکھنی پڑتی ہیں جو ان کے احساسات کو مجروح کرتی اور ان کی تاریخ کو مسخ کرتی ہیں، سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی افترا پردازیاں اور کشت آزاریاں مسلم حکومتوں کے ہونے کے باوجود پیش آتی ہیں، مسلم رہنماؤں کے سامنے رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن کسی کو ان کی تردید اور تکذیب کی جرأت نہیں ہوتی، اور جو لوگ تردید کی کوشش کرتے بھی ہیں، تو ان کے قلم میں زور نہیں ہوتا۔

اس دور کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ مذہب جو حق کا علمبردار اور مساوات

وانسانی بلندی کا قائل ہے، اسے دہشت پسند اور تشدد پسند مذہب سے موسوم کیا جارہا ہے، اور وہ امت جس نے دنیا کو ہر طرح کی غلامی سے آزادی دلائی اور اسے انسانی تہذیب اتحاد اور حریت عطا کی اسے پسماندہ، اور سنگدل امت ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مسلمان اس صورت حال سے مسلسل دوچار ہیں، اور اسکی ذمہ داری ان مغربی نظامہائے حکومت پر عائد ہوتی ہے جو بعض مسلم ممالک میں حکمرانی کررہے ہیں، ان میں سے بیشتر ملکوں میں تشدد کے بہت سے واقعات صرف اس لئے پیش آئے کہ ان حق پرستوں کی آواز دبادی جائے جو اسلام کو اپنانا چاہتے ہیں، اور گمراہی وانسان کشی کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کی مخالفت کرنے والے کسی شخص پر کوئی پابندی نہیں ہے، جب کہ ایسے ہزاروں افراد جبر وقہر میں مبتلا ہیں جن کی خواہش ہے کہ اسلام کو امر ونہی کا اختیار حاصل ہو۔

دنیا کے سارے مذاہب آزادی سے ہمکنار ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ جبر واکراہ اور ظلم وزیادتی کی پالیسی اپنائی جارہی ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کی عزت وآبرو پر حملے کئے جارہے ہیں۔ اور ان کی اولاد کو ایسے نظریات وافکار سیکھنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ جو ان کے عقیدہ وتاریخ سے متصادم ہے۔ کمیونسٹ دنیا کی مظلوم قوموں کو نہ آزادی عبادت اور حیرت عمل حاصل ہے اور نہ عام زندگی میں شرکت کی آزادی، ان قوموں کی زندگی انتہائی قید وبند کی زندگی ہے، انہیں کمیونزم قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے، بعض ملکوں میں اپنی مرضی کے مطابق نام رکھنے، مردوں کو دفن کرنے اور بچوں کو تعلیم دینے پر بھی پابندی ہے۔ کچھ مسلمان قومیں اپنے ہی ملک میں غیر مسلم حکومتوں کے تابع ہیں جو ان پر ناخوشگوار حالات تھوپنے کی کوشش

کر رہی ہیں اور جہاں پیشہ ور اہل قلم آزادی سے اسلامی عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں، اور ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ بیشتر مسلم ممالک میں دینی کتب ضبط کر لی جاتی ہیں اور بندرگاہوں، ایرپورٹوں اور سرحدوں تک پہنچتے ہی بلا تحقیق روک لی جاتی ہیں۔ اور فحش لٹریچرس اور اسلام مخالف کتابوں کو پوری آزادی حاصل ہے، کہ انہیں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

کیا یہ بڑی ناانصافی اور زیادتی کی بات نہیں ہے کہ تعمیری اور سماجی روح بیدار کرنے والی ادبی اور ثقافتی تنظیموں پہ اسلامی ممالک میں پابندی عائد ہے لیکن ایسی تباہ کن تحریکوں اور تخریب کاروں کو مکمل آزادی حاصل ہے جو فساد اور انارکی پھیلاتی ہیں، اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتی ہیں۔

کیا یہ ناانصافی کی بات نہیں ہے کہ ان ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت، کلیسا کی تعمیر اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کی تشہیر کی پوری آزادی ہے اور رفاہی اداروں اور عام ضرورت کی چیزوں کو اس مقصد کے لیے ناجائز طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ عیسائیوں کو اپنے ایرپورٹ اور ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کے حقوق حاصل ہیں، اس کے برعکس مسلم داعیوں کو دعوت اسلام کے لیے کوئی تحریک یا تنظیم قائم کرنے کی اجازت نہیں ے بلکہ اس میں سے اکثر کی سرگرمیوں پہ پابندی عائد ہے۔

مسلم اکثریت اپنے ہی ملک میں غیر مسلم اقلیت کی محکوم ہے اور اس کی پشت پناہی مغربی حکومتیں کر رہی ہیں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ افغانستان میں دس لاکھ سے زیادہ مسلمان اپنی آزادی کے حصول میں اپنے آپ کو قربان کر بیٹھے اور چالیس لاکھ سے زائد جلاوطن کر دیئے گئے۔ الجزائر میں دس لاکھ سے زیادہ مسلمان اپنی آزادی کی

راہ میں قربان کردیئے گئے، سوڈان اور صومال کو صلیبی حملوں کا سامنا ہے، انڈونیشیا کو مکمل عیسائی ملک بنادینے کا دعویٰ ہے۔ فلپائن میں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کا سلسلہ جاری ہے، اسرائیل نے مسلمانوں کی زمین پہ غاصبانہ قبضہ کررکھا ہے اور مغرب کے تعاون سے امن وسکون کی زندگی گذار رہا ہے، اس کے ایجنٹوں نے (صبرا اور شتیلا) میں جو قتل عام کیا اور اسلامی مقدس مقامات کو جس بے دردی سے تباہ کرنے کی یہ لوگ کوششیں کررہے ہیں اس پر انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔

مزید برآں مختلف ممالک میں مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے اور جلاوطن کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں جو تہذیب جدید، حریت اور امن کے دعویدار ہیں، اور اپنے کو سیکولر کہتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں اور قبرستان خطرے میں ہیں، ان کے تعلیمی اداروں پہ طرح طرح کی پابندیاں ہیں، اس کے باوجود دور جدید کی بس ایک ہی آواز ہے جو درحقیقت مغرب کی آواز ہے، ''مسلمان دہشت گرد ہیں، ان کا مذہب دہشت پسندی کا حکم دیتا ہے'' یہ گرچہ تاریخ کے خلاف ہے، واقعہ کے خلاف ہے لیکن چونکہ مغرب کی آواز ہے اس لئے حق ہے عربی شاعر نے کہا تھا ؎

اذا قالت حزام فصدّقوها فان القول ماقالت حزام

اس کا تھوڑے تصرف کے ساتھ ترجمہ کیا جائے تو یہ کہ مغرب میں جو بات کہی جائے اس کی تصدیق کرو، بات وہی ہے جو مغرب کہے۔

بدامنی کا ذمہ دار کون؟ (☆)

دنیا کے مختلف ملکوں میں دعوت اسلامی کی راہ میں مختلف النوع رکاوٹیں حائل کی جارہی ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں پر ہر قسم کے الزامات عائد کئے جارہے ہیں، حتی کہ مسلم ممالک کی حکومتوں پر داعیانِ اسلام کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کارروائیاں بروئے عمل لانے کے لیے مغربی ممالک کی طرف سے دباؤ ڈالا جارہا ہے تاکہ اسلام ایسی قوت نہ بن سکے جن سے غیر اسلام افکار کو خطرہ لاحق ہو یا جن کے نتیجے میں یورپ کی مادی تہذیب کے عیوب عیاں ہوں، اس دباؤ کی نوعیت ان ممالک کے حالات اور مزاج کے فرق سے الگ الگ ہوتی ہے، جن ممالک کا شمار تاریخی یا سیاسی لحاظ سے ''اسلامی ممالک'' میں ہوتا ہے، وہاں تو کھل کر اسلام کی مخالفت نہیں ہو پاتی بلکہ ظاہراً تو اسلامی قوانین کو مضبوط بنانے کی پالیسی اپنائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان تحریکوں پر پابندی عائد کردی جاتی ہے جو مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے خلاف نبرد آزمائی کی روح پھونکتی ہیں۔ اور جو مسلمانوں کے اندر اپنے تشخص کو باقی رکھنے کا احساس پیدا کرتی ہیں، اور جن ممالک نے سیکولرازم یا اشتراکیت اختیار کی ہے وہاں داعیان اسلام یا شیدائیان اسلام اور حکام کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی ہے اسلام پسندوں کی نقل وحرکت پر پابندی عاید کردی جاتی ہے۔ انھیں تہمتوں اور ناروا حملوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسلامی علوم وثقافت مذہبی شخصیتوں اور اسلامی شعائر پر علی الاعلان حملے کئے جاتے ہیں، اور حکومت وقت مغربی افکار کے حاملین اور قلم

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر ستمبر ۱۹۸۹ء۔

کاروں کو اسلامی تاریخ، اسلامی شخصیتوں اور سلف صالحین کے خلاف اپنے نظریے اور افکار کو پھیلانے کی کھلی چھوٹ ہی نہیں بلکہ ترغیب دیتی ہے۔

اسلام کے خلاف مہم گذشتہ عہد میں کھلے الفاظ میں چلائی جاتی تھی۔ پہلے کھلم کھلا اور علی الاعلان اس سے عداوت کا اظہار کیا جاتا تھا اور جو کوئی بھی اسلام کا نام لیتا یا اسلام کی دعوت دیتا تو اس سے حکومتیں برسرپیکار رہتی تھیں، اور اس پر قدامت پسند یا تہذیب نو کے مخالف ہونے کا الزام لگتا تھا۔ اسی طرح گذشتہ زمانہ میں بعض سوشلسٹ ذہنیت کے لوگ اسلام پسندوں کے لیے ''ایجنٹ'' ہونے کا لفظ استعمال کرتے تھے، جو کسی اسلامی ادارہ قائم کرنے کے خواہاں ہوں یا دینی تعلیمات کو زندگی میں بروئے کار لانے کے کوشاں ہوں، تو ایسے حضرات کو وہ لوگ سامراج یا امریکہ کا ایجنٹ سمجھتے تھے، چنانچہ اسلامی ادارے کے بانیوں کو ایک عرصہ تک یورپی سامراج یا سرمایہ داری یا امریکہ کا ایجنٹ کہا جاتا رہا ہے جیسے امریکہ یا فرانس اسلام کے حامی ہوں، حالانکہ امریکہ، فرانس، بریطانیہ تو مسلمانوں کے کٹر اور روایتی دشمن ہیں، وہ تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دل میں بغض وحسد کی چنگاریاں رکھتے ہیں۔ اسی طرح کمیونزم بھی اسلام اور مسلمانوں کے موروثی دشمن ہیں، اس لیے کہ ان کے اندر یورپی عیسائی اور یہودی ہونے کی قومی عصبیت پائی جاتی ہے، چنانچہ صلیبی جنگوں کی قیادت ان ہی ممالک نے کی ہے جو آج یورپین ممالک میں سرفہرست آتے ہیں، ان میں بھی سب سے پیش پیش برطانوی فرانسیسی، اٹالین اور اسپینی ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے خون کے دریا بہائے، ان کو گمراہ کرنے اور ذہنی طور پر سامراج بنانے کے منصوبے تیار کیے، کذب وافترا پردازی کے مراکز قائم کیے، اور اسلام کے خلاف ایسے واہیات وخرافات پھیلائے کہ جن کو سن کر ایک عقلمند اور مہذب شخص کا سر شرم سے جھک جائے اور انھوں نے ایسے بے بنیاد و بے اصل قصے

اور کہانیاں گھڑلیں جو ایک عام آدمی کے معیار پر بھی نہیں اترتیں، انھوں نے ذات نبوی، سنت رسول، کلام ربانی اور تاریخ اسلامی کو داغدار بنانے کی کوشش کی، انہیں لوگوں نے اسلامی ممالک میں فتنوں کی آگ بھڑکائی۔

اور اس طرح کے حملے برابر جاری ہیں باوجودیکہ بہت حد تک حجابات اٹھ چکے ہیں، اور بہت سے مغربی حکماء وفلاسفہ اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اسلام کے مطالعہ کے بعد ایمان ان کے دلوں میں گھر کر گیا، پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے، اور بہت سے انصاف پسندوں نے اس کا بھی اقرار کیا ہے کہ اسلام ایک عرصۂ دراز تک مظلوم بنا رہا ہے، اس پر بے بنیاد الزامات لگائے جاتے رہے ہیں، اور اس کی غلط تصویر پیش کی جاتی رہی ہے۔

جس زمانے میں اسلام کو مورد الزام ٹھہرایا جارہا تھا، اور اس کے خلاف ایک بات بھی سننا گوارہ نہیں ہوتا تھا، اور سارا یورپ حقیقت حال سے ناآشنا اور نور اسلام سے بیگانہ تھا، اس زمانہ میں اسلام پر رجعیت، قدامت پرستی اور پسماندگی کا الزام لگایا جاتا تھا، لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے، اب یہ دشمنان اسلام اسلام کے نام سے اپنی مخالفت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ یہ دہشت پسندی اور مذہبی انتہا پسندی کے نام سے حملہ کرتے ہیں۔

پہلے ان کا اعتراض یہ ہوتا تھا کہ اسلام تلوار کے سائے تلے اپنے مذہب کی اشاعت کرتا ہے۔ لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ دشمنان اسلام ہی اپنے مخالفین کے خلاف تلوار کا استعمال زیادہ کرتے ہیں، اور اس تھوڑی سی مدت میں ان کی تلواروں کے ذریعہ مقتولین کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اس تعداد سے جو اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

اسی طرح پہلے ان مخالفین کا دعویٰ تھا کہ اسلام علم کا دشمن ہے مگر تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ مخالفین اسلام ہی علم کے زیادہ دشمن ہیں، وہ جس ملک میں بھی سامراج کے

سائے میں داخل ہوئے، انھوں نے وہاں کے تمام علمی مراکز حتی کہ زبان ولغت، تہذیب وثقافت عادات واطوار سب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا، مدارس ومکاتب پر تالے لگوادئے، کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگادی اور اپنی زبان وتہذیب کو وہاں کے عوام پر تھوپا۔

ان دشمنان اسلام کا اسلام پر ایک اعتراض یہ تھا کہ اسلام میں ایک سے زائد شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور یہ شہوت نفسانی کے غلبہ کی دلیل ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے عہد میں بے حیائی وبداخلاقی، عشق ومعاشقہ اور غلط تعلقات کی جو ایک عام فضا بن گئی ہے اس کو یہ لوگ تہذیبی پیش رفت کی دلیل قرار دیتے ہیں اور تعلیم وتربیت ودفاتر میں مردوزن کے اختلاط اور بڑے پیمانہ پر جنسی تعلقات بڑھانے کو موجودہ ثقافت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

دشمنان اسلام کے لئے اس طرح کی دلیلیں بہت تھیں۔ مگر اب یہ سارے دلائل اپنی اہمیت کھو چکے ہیں، اس لئے اب ان لوگوں نے اسلام کے نام پر کھلی دشمنی کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور انھوں نے اب سیاسی اور نفرت آمیز عنوان یعنی دہشت انگیزی اور انتہا پسندی کا عنوان تجویز کیا ہے لیکن اگر کوئی شخص مغربی تہذیب اور اس کے تابع موجودہ نظاموں کا جائزہ لے تو وہ فوراً اس نتیجہ تک پہونچے گا کہ خود اس تہذیب کی بنیاد ہی دہشت گردی وانتہا پسندی پر مبنی ہے، اور اس کے تمام مراکز یورپ میں پائے جاتے ہیں، وہاں باضابطہ دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے، ان لوگوں میں اسلحے تقسیم کیے جاتے ہیں، اور دہشت گرد جماعتوں کو امداد دی جاتی ہے اور ان کی سرگرمیوں کو سراہا جاتا ہے، جس شخص کی بھی حالاتِ حاضرہ پر نگاہ ہو اور وہ اخباروں کا مطالعہ کرتا ہو وہ عالمی دہشت گرد تنظیموں کی رپورٹوں سے واقف ہوگا، اٹلی، فرانس، جرمنی، برطانیہ، پرتگال، یونان وغیرہ کا دہشت پسندوں کی ٹریننگ میں ایک نمایاں کردار رہا ہے، مازینی اور میکاویلی بھی اٹلی ہی کے رہنے والے تھے، موجودہ فکر پر انہی دونوں کا خاص اثر ہے، بلکہ موجودہ دنیا میں دہشت گردی کی بنیاد ہی ان دونوں

کے نظریے پر قائم ہے۔ اسی طرح ماسونی تحریک کا اصل مرکز یورپ ہی ہے، وہیں سے دہشت گردوں کی مختلف ٹیمیں مختلف علاقوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اور یہی یورپین ممالک اس وحشیانہ عمل میں صہیونی تحریک کی تائید کررہے ہیں، مگر سارے عالم کے جذبات واحساسات کی انھیں کچھ پروانہیں، ان تنظیموں کو ہوا دیتے ہیں جو نسلی امتیازات کو پروان چڑھانے اور بنیادی آزادی کو ختم کرنے کی مشن پھیلا رہی ہیں، اسی طرح یہ ممالک مسلمانوں کی اغلبیت والے دیش میں بھی علی الاعلان داعیانِ اسلام کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، اور جو یورپ میں قیام پذیر مسلمانوں کو دیش سے نکال دینے کی دھمکیاں اور اپنے شعائر وعبادات سے دستبردار ہوجانے کا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔

تو اب فیصلہ قارئین کرام کے ہاتھ میں ہے کہ دنیا کے لیے کون سی دہشت گردی زیادہ خطرناک ہے، اسلامی جماعتوں کی دہشت گردی جو محدود وسائل سے بھی محروم ہے یا یورپی ممالک کی دہشت گردی جو عظیم جنگی وسائل سے لیس ہیں اور جن کا اقتصادیات پر قبضہ ہے۔

اسلام کی طرف بلانے والے تو بلند اقدار روایات، حقیقی سعادت و کامرانی انسانی عزت وشرافت، عدل ومساوات اور مختلف مادی عبادتوں سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے ہیں، ظلم وبربریت، فتنہ وفسادات اور ہلاکت وبربادی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، لیکن ان کے دشمنان کا نعرہ ہے کہ امن وامان کو غارت کردیا جائے لوگوں کی جانیں اور ان کے مال مباح کردیئے جائیں، یہ لوگ انسانی ترقی کی راہ میں حائل بنے ہوئے ہیں، اور یہی فسادات کی جڑ ہیں، حکومتوں اور انسانی سوسائٹیوں کو داؤں پر لگا رہے ہیں، ہلاکت وتباہی کے وسائل پھیلا رہے ہیں اور عزت شرافت کا سودا کررہے ہیں، ایک محدود اور علاقائی ثقافت وکلچر کا سارے عالم کو پابند کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی لوگ قوموں کے معاشی وسائل پر قابض ہوکر ان کی ترقی اور خود اعتمادی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تو اب اہل دانش فیصلہ کریں کہ انسانیت کو خطرہ کس جماعت سے لاحق ہے؟۔

مشرق وسطیٰ پر عالمی کشمکش کے سائے (☆)

ہندوستان کی تحریک آزادی کے عہد میں تحریک آزادی کے ایک لیڈر نے انگریزوں کو ہندوستان کی تمام خرابیوں افلاس وغربت، محرومی و پریشان حالی اور مختلف فرقوں کی باہمی کشمکش کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کسی دور دراز گاؤں میں دو شخصوں کے درمیان جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھو تو یہ جان لو کہ اس میں بھی انگریزوں کا ہاتھ ہے، انگریزوں کے تربیت یافتہ لوگوں کے اشارہ پر یہ ہنگامہ ہو رہا ہے، ان کے نزدیک ہندوستان ایک پر امن محبت وآشتی کا پیغام دینے والا ملک تھا، انگریزوں نے اس کے امن اور محبت کے ماحول کو تباہ کر دیا۔

یہ تصور اگرچہ سامراجی طاقت سے نفرت ودشمنی کے اظہار میں مبالغہ وانتہا پسندی پر مبنی تھا جو سامراج کا ردعمل تھا، پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے، یہ تصور برطانوی سامراج اور دوسری مغربی سامراجی طاقتوں کے خلاف ناپسندیدگی ونفرت کا نتیجہ ہے جو اس عہد کے ظلم، وحشت وبربریت، پھوٹ ڈالنے اور انتشار پیدا کرنے، ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے خلاف بھڑکانے، مذہب اور ملک کے بارے میں سچے جذبات رکھنے والے عناصر کے خلاف بدگمانی پھیلانے کی پالیسی کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

انگریزوں کی پالیسی بلکہ تمام سامراجی یورپی حکومتوں کی پالیسی دجل اور فریب کے اصول پر قائم تھی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' سامراج طویل عرصہ تک اسی پر عمل پیرا رہا اور جب وطن پرست قوتوں نے اس سیاست کو سمجھ لیا اور متحد ہو کر سامراج کے

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

خلاف جدوجہد کی تو اس نے اپنی نوآبادیات کو خیر باد کہا، وطن پرست طاقتوں نے ان چالوں کو سمجھ لیا اور انتشار سے بچ کر سامراج کے مقابلے کے لیے متحد ہو گئیں، مجاہدین آزادی کا یہی اتحاد آزادی کے حصول کا اہم عنصر تھا جو غیر یورپی دنیا کے افق پر طلوع ہوا اور جس نے سامراجی طاقتوں کو باوجود فوجی برتری اور تنظیم کے شکست دی اور ملک سے نکلنے پر مجبور کیا، آزادی کی تحریک کے کامیاب ہونے کا دوسرا اہم عنصر سامراجی طاقتوں کی وہ کمزوری اور نقاہت تھی جو عالمی جنگوں میں داخل ہونے کے نتیجے میں لاحق ہوئی جس نے ان کی تمام مادی طاقتوں کو چوس لیا تھا۔ ان طاقتوں کے بس میں یہ نہ تھا کہ اپنی ہیبت ورعب کو اس آزادی کے شعور اور سامراج سے نفرت کے احساس کے ماحول میں باقی رکھ سکیں اور اپنے نظام کا تحفظ کر سکیں اور ان مخالف قوموں کے اقتصادی بوجھ کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا سکیں اور انقلاب کی آگ کو بجھا سکیں تو انھوں نے عافیت کے راستے کو اختیار کیا اور ان ملکوں سے اپنا فوجی اور انتظامی تسلط ختم کیا۔

سامراج اپنی نوآبادیوں سے نکل گیا؛ لیکن اس نے ان ملکوں سے اپنی ذہنی وابستگی اور تعلق کو ختم نہیں کیا، ایک مشہور عوامی کہاوت ہے کہ ''چور چوری سے گیا ہیرا پھیری سے نہیں گیا'' اکثر وہ چوری کی نگہبانی کے فرائض انجام دینے لگتا یا چوری سکھانے کا کام کرتا ہے، اس لیے کہ چوری اس کی طبیعت کا ایک جزو ہو جاتی ہے اور جب چور اس کے پروردہ و متبع ہوتے ہیں تو وہ ان کی چالوں اور ان کے مکر وفریب کو دیکھ کر لذت وخوشی محسوس کرتا ہے اور وہ ان کی رہنمائی کرتا ہے اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سب چور اپنے مربی چور ہی کی تیار کی ہوئی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور اس کارروائی کی ذمہ داری شاگردوں پر آجاتی ہے اور برے نتائج وہ بھگتتے ہیں جو ان کے استاد کی تدبیر وتفکیر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

آج جو حالات وواقعات مختلف ملکوں میں رونما ہو رہے ہیں، چاہے وہ خونریز

جنگ کی شکل میں ہوں یا وہ طبقاتی کشمکش یا اقتصادی مصائب کی شکل میں ہوں، یہ سب سامراج کے بوئے ہوئے ہیں، یا سامراجی ملکوں کی سازشوں کا نتیجہ ہیں، اوران میں سے اکثر مسائل مغربی حکومتوں کی تدبیر واسکیم کا نتیجہ ہیں، یاان کے شاگردوں کی، یہ مغربی ممالک اپنے ماہرین، مشیر، ذرائع ابلاغ سے فرمانبردار حکام کی ایسی رہنمائی کرتے ہیں کہ ایسے مسائل پیدا ہوتے رہیں اوران کو مدد کی ضرورت پیش آتی رہے اوران ملکوں پر وہ بالواسطہ حکومت کرتے رہیں۔

سامراج کی سازشوں کی سب سے بڑی دلیل جو ہمیشہ نظر آتی ہے، یہ ہے کہ کشمکش کے علاقے دنیا میں بدلتے رہتے ہیں، اگرچہ عالم اسلام سامراج اوراس کے مددگاروں کی سازشوں کا اکثر نشانہ ہوتا ہے، دنیا کے مختلف علاقوں میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں ایک قسم کی مشابہت ومماثلت پائی جاتی ہے، اگرچہ ان کے ہیرو اور نافذ کرنے والوں کے نام مختلف ہوتے ہیں، اگر کوئی محقق تحقیق کرے، تو درپردہ دوسری شخصیات کو پائے گا، ظاہری شخصیات ان واقعات کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں اور چھپی ہوئی شخصیات سزا سے محفوظ رہتی ہیں، ملامت ظاہری شکلوں پر ہوتی ہے، اصل محرک ملامت سے محفوظ رہتے ہیں۔

اس طرح کے ڈرامے مغربی ممالک اکثر کھیلتے رہتے ہیں، کئی مرتبہ دنیا اس کو آزما چکی ہے کہ ایک لیڈر دنیا کی بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کے خلاف اپنی دشمنی کا اظہار کرتا ہے اوراس پر گالیوں کی بوچھار کرنے میں حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اور ڈرامہ کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کام پر مامور ومقرر تھا اور جس طاقت کو وہ نشانہ بنارہا تھا وہ اس کا وفادار غلام ہے اور گالیاں اس کے کہنے سے دی گئیں اوراسی طرح بعض رہنماؤں پر سامراجی حکومتوں کے مفادات کے مطابق بعض پالیسیاں ومواقف تھوپ دیے جاتے ہیں وہ ان پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں اوراس پالیسی کے نتائج کا سامنا کرتے ہیں۔

کمزور ممالک کے بہت سے حکام مطلق آزادی نہیں رکھتے، بلکہ ان کی پالیسیوں کو مشیروں اور باہر سے ہدایات دینے والوں کے ذریعہ متعین کردیا جاتا ہے اور کوئی ملک ان غیر ملکی مشیروں سے آزادی کے اس عہد میں بھی خالی نہیں، ان مشیروں کی بڑی تعداد خود حکام کو گھیرے رہتی ہے اور وہ ان کے تصرفات کا رخ متعین کرتی ہے، یہی لوگ ان سے وہ بیانات لکھواتے ہیں جن کو یہ حکام جاری کرتے ہیں اور ان مواقف کو بتاتے ہیں جن کو وہ اختیار کرتے ہیں، ان مشیروں کے مشورے سے جنگیں شروع ہوتی ہیں اور ختم ہوتی ہیں۔

زمانۂ قریب میں شاہی محل کی بیگمات وشہزادیاں کسی حاکم کے معزول ومقرر کرنے کے لیے سازش رچاتی تھیں، اس عہد میں وزراء وحکام اور ان کے نائبین غیر ملکی طاقتوں اور ایجنٹوں ووکیلوں کی سازشوں سے دوچار ہوتے ہیں۔

موجودہ کشمکش جو خلیج میں چل رہی ہے یہ دوملکوں کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہ کشمکش چند بڑی طاقتوں کے درمیان ہے اور ان دونوں کے درمیان مصلحتوں کے حصول کی دوڑ ہے، یہ علاقہ مشرقی ومغربی طاقتوں کے لیے ہر دور میں کشمکش کا اسٹیج رہا ہے اور اس میں خونریز جنگیں ہوئی ہیں، ہمیشہ یہ علاقہ مشرقی ومغربی بلاکوں میں تقسیم رہا ہے، اس لیے کہ یہ وسیع علاقہ مشرق ومغرب کے درمیان پل کا کام دیتا ہے اور یہ تجارت کی گزرگاہ ہے، عالمی طاقتوں کے نقشے میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے، مغربی سامراج کے طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد کمیونسٹ بلاک طویل مدت اس میں گزار چکا ہے اور اب بھی اس علاقے میں اشتراکیت کے آثار ہیں اور کئی ممالک میں ایسے لوگ حکومت کررہے ہیں جن کا پس منظر اشتراکی ہے اور ان کے کمیونسٹ رہنماؤں سے اب تک تعلقات ہیں، روس کے افغانستان پر حملہ کرنے اور یورپ میں اشتراکی ستونوں کے گرنے کے بعد اس علاقے میں جھٹکے محسوس کیے گئے، کئی ملک جو

اشتراکیوں کے زیر اثر تھے، وہ دوبارہ مغربی یورپ کے زیر اثر آنے لگے، مشرقی یورپ میں اشتراکی نظام کی شکست سے ایک خلا پیدا ہو گیا تھا تو سوشلسٹ ممالک کو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ پورا علاقہ مغربی یورپ کے زیر اثر نہ چلا جائے اور ساتھ ہی بہت سے ملکوں میں اسلام پسندی کے رجحان کے غلبے سے بھی ایک خطرہ نمودار ہونے لگا تھا اور عالم اسلام میں لاکھوں روسی یہودیوں کے اسرائیل ہجرت کرنے کی وجہ سے روس مورد الزام ٹھہرایا جا رہا تھا اور روس کو سخت مذمت سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، ان حالات کے پیش نظر ایک اسکیم تیار کی گئی تا کہ بڑی طاقتوں کو اس علاقے میں دخل اندازی اور ان کی نگرانی کا موقع ہاتھ آ جائے اور ان کو پرانی حالت پر واپس لایا جا سکے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس ان نقصانات کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اس کو افغانستان اور مشرقی یورپ اور اسلامی جمہوریتوں میں لاحق ہوئے ہیں اور وہ اپنے اقتصادی وسیاسی اثر کو واپس لانا چاہتا ہے، امریکہ روس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

اس واقعہ کی سب سے بڑی دلیل موجودہ حالات سے دور دراز ممالک کی غیر معمولی دلچسپی، براہِ راست دخل اندازی اور وہ تیزی ہے جس کے ساتھ انھوں نے اپنے کو اس قضیہ میں ملوث کر لیا ہے، روس نے جارحیت پسند عراق کی تائید کو مخفی نہیں رکھا، اس نے تمام اخلاق اور عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جارحیت کی تائید کر کے دنیا کے مختلف ممالک کے شہریوں کو طرح طرح کی مشکلات اور مسائل کا جو سامنا کرنا پڑا اور کویت جس تباہی و بربادی سے دوچار ہوا اور عراقی فوجوں نے لوٹ گھسوٹ، چوری وعصمت دری کا جو شرمناک مظاہرہ کیا، اس پر ان اشتراکی ملکوں کو کوئی تشویش نہ ہوئی اور عراق کے خلاف کارروائی کو انھوں نے روکنے کی کوشش کی۔ یورپی ممالک نے ضرورت سے زیادہ جوش وخروش کا اظہار کیا اور اس مسئلہ کے حل کے لیے اس جلد بازی کا مظاہرہ کیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، یہ تمام چیزیں

اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہیں کہ متعلقہ فریق ایسے نہیں ہیں جیسا کہ بظاہر وہ نظر آتے ہیں صدام وہ ہیرو نہیں ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیانات ومواقف سے نظر آتے ہیں اور نہ وہ ایسے تجربہ کار سیاست داں ہیں کہ پوری دنیا کا سامنا کرسکیں اور اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرسکیں جیسا کہ ظاہر ہورہا ہے اور نہ ہی یہ حکومتیں جو اس جارحیت کے مقابلے کے لیے پیش پیش نظر آرہی ہیں، سلامتی وامن چاہنے والی ہیں، اس لیے کہ ان کا دامن خود داغدار ہے، یہ فوجی نقل وحرکت اور ہنگامہ آرائی ہے کچھ، نظر آتی ہے کچھ۔

معاملہ جو بھی ہو، وہ بات جو ان واقعات سے ظاہر ہے، یہ ہے کہ سامراج کا تجربہ کرنے کے باوجود عالم اسلام کے بعض رہنماؤں میں سابق حاکموں کے اوامر پر عمل پیرا ہونے اور ان کی مکاریوں کا نشانہ بننے کی صلاحیت اب بھی موجود ہے، دشمنوں کے ارادوں سے ناواقفیت اور سابق سامراجی طاقتوں پر ان کا اعتماد اب بھی قائم ہے اور ان پر انھوں نے ایسا بھروسہ کرلیا ہے جو تلخ تجربہ کے باوجود ختم نہیں ہوتا، بلاشبہ عالم اسلام کے ان رہنماؤں کی یہ صلاحیت کسی ملک کی غلامی وفقر وافلاس سے زیادہ خطرناک ہے، اس لیے کہ فکری افلاس مالی افلاس سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، اور فکری غلامی فوجی غلامی سے زیادہ مضر ہے اور ناعاقبت اندیش قیادتیں جو کہ اس عرب علاقے میں سامراج کی حکومت کے سائے میں زندگی بسر کررہی ہیں، انھوں نے اس علاقے کو ایسی مصیبتوں، آزمائشوں وبربادیوں میں مبتلا کردیا ہے جو براہ راست سامراج کے عہد میں نظر نہیں آتیں۔

عراق نے کویت میں جس بے رحمانہ سلوک کا مظاہرہ کیا وہ کسی سامراجی ملک کے رویہ سے کسی طرح کم نہیں، مغربی ملکوں کی فوجی طاقتوں کا عرب علاقے میں اس تیزی سے پہنچنے اور قدم جمانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سازش بہت پہلے تیار کی گئی تھی اور ان ملکوں کے پروگرام کے ماتحت انجام پائی اور دونوں واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

غیر اسلامی نظام میں
اسلام کے ساتھ معاندانہ سلوک (☆)

کسی مذہب کے احیاء، یا کسی تہذیب کے زندہ کرنے یا کسی زبان کی اشاعت وترویج کی فکر یا اپنی عبادت گاہوں کی تجدید وتعمیر اور اپنے خیالات ونظریات اور تصورات کو پھیلانے کے لیے جدوجہد کرنا، اس کے ماننے والی قوم یا طبقہ کا بنیادی حق ہے اور اس کا فطری تقاضہ، خاص طور سے جب کہ اس کا تعلق ملک کی بڑی اکثریت سے ہو، یہ اس وقت تک قابل اعتراض نہیں جب تک کہ یہ ایجابی نہج سے ہو، اور تعمیری ہو اور اس میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو رہی ہو، اقلیت کو بھی اس بات کا حق حاصل ہے، بلکہ اس کے لیے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان، ثقافت، اپنی عبادت گاہوں اور رسم ورواج اور طور وطریقوں کی حفاظت کرے اور اسکے لیے جدوجہد کرے، اس کے لیے اکثریت کے مقابلہ میں یہ جدوجہد زیادہ ضروری ہے تاکہ وہ اپنا تشخص برقرار رکھ سکے اور گھٹن کا شکار نہ ہو، اگر اس سے روکا جائے یا اس کو اکثریت میں ضم ہونے کی دعوت دی جائے تو اس میں ردِ عمل پیدا ہوگا، اور اکثریت سے بدگمانی اور نفرت پیدا ہوگی، اس زندگی اور دنیا کا حسن بھی اس میں ہے کہ اس میں تنوع ہو، یہ ایک بڑا مغالطہ ہے جس میں بعض ارباب اقتدار مبتلا ہوئے کہ سب انسانوں کو ایک رنگ میں رنگا جاسکتا ہے، ماضی میں ایک رنگ میں رنگنے کی

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/دسمبر ۱۹۹۰ء۔

تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، آخری کوشش مغربی سامراج اور روسی کمیونزم کی طرف سے کی گئی جو ناکام ہوئی، اگر یہ بات کسی نظریہ یا مسلک کے لیے ممکن تھی تو وہ اسلام کے لیے اور اسلامی منہج کے لیے ممکن تھی کیونکہ وہ اللہ کا دین ہے اور دین فطرت ہے، اس میں تنوع اور اختلاف کی رعایت اور انسانی مزاج کا خیال رکھا گیا ہے، وہ آخری دین ہے، لیکن اسلامی منہج دعوت وترغیب کا منہج ہے، جس میں کوئی جبر واکراہ نہیں، وہ دوسروں کے نظریات کو احترام سے دیکھتا ہے، اور دوسرے طرز زندگی میں خیر وشر کے درمیان موازنہ کر کے اس کے خیر کو اختیار کرتا ہے، اوہ علم، فکر کے مقابلہ میں ایجابی پہلو اختیار کرتا ہے اور عداوت اور عصبیت سے محفوظ رہتا ہے، اس میں اپنے اور غیر میں امتیاز نہیں برتا جاتا، اسلامی تاریخ اس کی بہترین ناقابل انکار مثال ہے، موجودہ عہد کی یہ عجیب وغریب منطق ہے جس کو اسلام دشمن اپنا رہے ہیں کہ وہ اسلام پر طاقت استعمال کرنے کی تہمت لگا کر خود اسلام کے خلاف تلوار استعمال کرنے کا جواز پیدا کرتے ہیں، شاید ان کا یہ فلسفہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تلوار استعمال کرنے کی غرض ہی سے پیدا ہوا ہے، یورپ میں اور خود ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے خلاف جو اپنی رواداری میں مثال نہیں رکھتے تھے، معاندانہ پروپیگنڈہ موجودہ مسلمانوں پر حملہ کو جواز پیدا کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں پر الزام لگایا جارہا ہے کہ انھوں نے طاقت کا استعمال کر کے اسلام کو پھیلایا، جیسا کہ ان پر اہل مغرب نے الزام لگایا تھا، اس بہانہ ان کے خلاف طاقت کا استعمال کر کے اسلام مخالف افکار اور تہذیب کو پھیلایا جارہا ہے، اور مسلمانوں کو اسلامی تشخص سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جارہا ہے، یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا، جب کہ سینکڑوں برس حکومت کرنے کے بعد اقلیت میں رہنا اسکا سب سے بڑا عقلی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کا عمل

اس کے خلاف رہا اور وہ رواداری برتنے میں حدود سے تجاوز کر گئے، یہ بھی الزام لگایا جارہا ہے کہ انھوں نے عبادت گاہوں کو ڈھایا تھا اور ان کی جگہ مسجدیں بنائیں تھی، اس کے نتیجہ میں اب مسجدیں منہدم کی جارہی ہیں، جب کہ بڑی تعداد میں موجود قدیم مندر اور مسلمانوں کے دیے ہوئے اوقاف اس دعویٰ کے خلاف ہیں، مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا جارہا ہے کہ ان کے دورِ حکومت میں مذہبی اقلیتوں کے ساتھ دوسرے درجہ کے شہری کا معاملہ کیا گیا، لہٰذا مسلمانوں کے ساتھ بھی موجودہ غیر مسلم حکومتوں میں اکثریت کی طرف سے دوسرے درجہ کے شہری کا معاملہ کیا جانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، جب کہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں غیر مسلم اہم ترین عہدوں پر فائز تھے، مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ انتہا پسند، رجعت پسند اور شدت پسند ہیں، اس بہانہ مسلمانوں پر غیر اسلامی قانون، غیر اسلامی تہذیب تھوپی جارہی ہے، اور ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کو زندہ کیا جارہا ہے، مسلمانوں کی مخالفت میں کٹر انتہا پسند جماعتیں وجود میں آرہی ہیں، اور حکومت ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے، اسلام سے کئی صدیوں پہلے کی ثقافتوں کو زندہ کرنے کی تحریکیں چل رہی ہیں، اور یہ تمام تحریکیں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ کررہی ہیں، اسلام اور مسلمانوں کیخلاف تقریر وتحریر کی اجازت ہے، بلکہ مقدس ترین ذات بھی اس عداوت سے محفوظ نہیں، مسلمانوں پر عسکریت پسندی کا الزام ہے۔ اس الزام کے ساتھ غیر مسلم عسکری ونیم عسکری تنظیمیں علی الاعلان کام کررہی ہیں، اور ان کے لیے اسلحہ رکھنے، مالی وسائل بڑھانے پر کوئی روک نہیں لگائی جاتی۔

مسلمان اگر کہیں حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کو علیٰحدگی پسند کہا جاتا ہے اگر مسلمان ملکوں میں غیر مسلم کوئی تحریک چلاتے ہیں تو اس کو آزادی کی تحریک کہا جاتا ہے یہ سب اسلام دشمنی اور حق مبین سے عداوت رکھنے کی ذہنیت کا ایک حصہ ہے، جو

ذہنیت زبان ووطن کے بدلنے سے بدلتی نہیں، کیونکہ نفرت وعداوت اور حسد وانکار کی ذہنیت یکساں ہوتی ہے، اس ذہنیت کے حل اور علاج کا راستہ بھی ایک ہے، وہ ہے صبر وتحمل اور ایجابی دعوت، اس کا حل صرف یہ ہے کہ اسلام کو ایجابی پہلو سے پیش کیا جائے، اسلامی تعلیمات کی تشریح کی جائے، اسلامی اخلاق کا اچھا مظاہرہ کیا جائے، دشمنوں کے خرافات اور دوسرے نظاموں کی کمزوریوں، اور دوسری قوموں کی تاریخ کے تاریک گوشوں کو واضح کیا جائے۔

اسلامی شریعت اور دوسرے نظاموں کے نفاذ میں جو بڑا فرق ہے اس کو ایجابی شکل میں پیش کیا جائے، یہ بتایا جائے کہ اسلام غیر مسلم کو اپنی کسی بھی تعلیم، کسی بھی منہج کو اپنانے پر مجبور نہیں کرتا اور نہ تاریخ میں کبھی مجبور کیا، وہ کسی خاص قسم کے لباس کو اختیار کرنے، کسی خاص قسم کے کھانے پینے کے طریقے کو اپنانے، کسی خاص سیاسی نظام کا پابند بنانے، یا کسی خاص ثقافت کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا، ہر دین کا ہر متبع اپنے دین کی اتباع میں آزاد ہے، لیکن دوسرے مذاہب وادیان اور نظاموں کا مسئلہ ایسا نہیں ہے، وہ دوسروں کو اپنے فلسفہ کے تمام اجزاء کو قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں، ایک عقیدہ اختیار کرنے کی ان میں پابندی ہے، حد یہ ہے کہ کھانے پینے، لباس، ادب وفن اور فکر ومعاشرت میں بھی وہ دوسروں کو مجبور کرتے ہیں، اس لحاظ سے اسلامی نظام ہی وہ تنہا عادلانہ عالمی نظام ہے جس کے تحت تمام ادیان آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہیں، عبادت گاہوں کے بارے میں بھی اسلام کا یہی عادلانہ نظریہ ہے کہ تمام عبادت گاہوں کو پوری عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، لہٰذا اسلام کا پیام اور اس کے نظام کا قیام انسانی نظام کا قیام ہے، ضرورت ہے کہ اہل قلم اس فرق کو واضح کریں، اور اسلام کے نظام کی اس خصوصیت کو عام کریں۔

اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر لباس، کھانے پینے کی

عادتوں، اقتصادی اجتماعی طرز زندگی، عبادت، تعلیم، یہاں تک کہ شادی بیاہ کے طریقوں پر غیر اسلامی طرز کو اختیار کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے، الحاد، بت پرستی کی ان کو جبری تعلیم دی جاتی ہے، اگر وہ اپنی تعلیم، ثقافت کو اختیار کرنے کی آزادی چاہتے ہیں تو اس کو کٹر پن اور علیٰحدگی پسندی کہا جاتا ہے، یہ عجیب منطق ہے، جو موجودہ تہذیبی دور میں اختیار کی جارہی ہے، دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمان اس جبر کا شکار ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈہ بھی زور شور سے کیا جارہا ہے کہ مسلمان کٹر، تنگ نظر اور قدامت پرست ہیں، یہ اس عہد کا سب سے بڑا فریب ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برتا جارہا ہے، اس کی ابتدا مغربی سامراجیوں اور مستشرقین کے ہاتھوں ہوئی اور اب دوسری قومیں اس پالیسی پر عمل کررہی ہیں۔

جمہوریت چاہے جس شکل میں (☆)

سر ونسٹن چرچل نے ایک خاص موقع پر کہا تھا کہ جمہوریت ایک برا نظام ہے، لیکن دوسرے نظامہائے حکومت اس سے بھی بدتر ہیں۔ مسٹر چرچل نے اس خیال کا اظہار اس وقت کیا تھا، جب جمہوری نظام چند ہی ملکوں میں رائج تھا، اکثر ملک غلام تھے بہت سے ملکوں میں شاہی حکومتوں کا رواج تھا، جن ملکوں میں یہ نظام رائج تھا، ان ملکوں کے باشندے کسی نہ کسی حد تک تعلیم یافتہ اور انتخابات کی اہمیت، افادیت اور ضرورت سے واقف تھے، اور سیاسی زندگی آج کی طرح آلودہ نہ تھی، پھر بھی جمہوریت میں کچھ نہ کچھ عیوب ظاہر ہو گئے تھے، مسٹر چرچل نے مذکورہ بات اس نظام کے حکام کی، عوام کے سامنے ذمہ داری، امیدواروں کے سلسلہ میں ووٹ دینے والوں کی ذمہ داری، عوام کے مطالبات اور احتجاجات کے مطابق جمہوری حکومت کے طرز حکمرانی اور ممبران کی عدم تعاون سے منتخبہ حکومت کے خطرۂ سقوط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی ہوگی، غیر جمہوری طرز ہائے حکمرانی کے سلسلہ میں ان کی رائے کا غالباً مطلب یہ ہو کہ قوم کو غیر جمہوری نظاموں میں عوامی نمائندگی کا موقع نہیں ملتا، اور اس طرح ظلم واستبداد، قہر وغضب اور اقتدار پر بعض مخصوص افراد یا خاندان یا جماعت کے غلبہ کا زیادہ امکان رہتا ہے۔

مسٹر چرچل کو جمہوری نظام کے پھلنے پھولنے اور رواج عام کا زمانہ نہیں ملا کہ وہ اس کو ترقی یافتہ شکل میں دیکھتے، ورنہ ان کا نظریہ جمہوری نظام کے بارے میں مختلف

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اگست ۱۹۹۱ء۔

ہوتا، اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ یہ جمہوری تمام نظامہائے حکومت سے زیادہ ناقص اور ناپسندیدہ ہے اور یہ بات واقع کے خلاف نہ ہوتی، بلکہ حقیقت کا آئینہ دار ہوتی۔ کیونکہ جمہوریت آج اکثر ملکوں میں ناکام ہوچکی ہے اور اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن سے اس کے اچھے مقاصد متروک، اور اس کے اغراض اس کے غلط طریقہ کار سے بگاڑ کا شکار ہوگئے ہیں، آج کی جمہوریت، فساد وبگاڑ، بدامنی وانارکی، اور لاقانونیت کی آماجگاہ بن چکی ہے، اس نظام کی کمزوریاں اور اس کے مضر اثرات کا احساس ایشیائی ملکوں میں ہی نہیں بلکہ مغربی ملکوں میں بھی پایا جارہا ہے، ایک برطانوی جمہوری فکر کے فلسفی نے اظہار خیال کیا ہے کہ جمہوری نظام، اپنے تمام مقررہ اغراض ومقاصد کے حصول میں کلی طور پر ناکام ثابت ہوچکا ہے، موجودہ دور میں جمہوریت انتشار خودغرضی اور مفاد پرستی کی آماجگاہ ہے۔

درحقیقت جمہوریت ہی جمہوری ممالک میں فساد، انارکی، لاقانونیت، دہشت گردی اور اس طرح کی تمام برائیوں اور خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔

جمہوری نظام کی مثال درحقیقت جادوگری کی ہے جس سے عوام کو تماشہ دکھا کر ان سے تائید حاصل کی جاتی ہے اور اقتدار پر پہونچایا جاتا ہے، یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جمہوریت مشکلات کے حل سے زیادہ مشکلات کو جنم دیتی ہے، کیوں کہ جمہوریت صرف حقوق کے حصول پر ابھارتی اور برانگیختہ کرتی ہے، اور اس میں مناسب اور نامناسب کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتی ہے، بلکہ جمہوری حکومت، حقوق کو موثر ذریعہ سے حاصل کرنے کی پوری پوری آزادی دیتی ہے اور پھر ان حقوق پر خود پابندی لگاتی ہے جو قائدین کے مفاد سے متصادم ہوتے ہیں۔

مختلف اجناس اور عناصر کے مابین مساوات وبرابری، جمہوریت کا ایک دلفریب نعرہ ہے جس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں، کالے اور گورے کے درمیان امتیازی

سلوک و برتاؤ مہذب ترین عالمی ممالک میں برابر جاری وساری ہے، اس کے برعکس جمہوریت کے سایہ میں جاہل اور عالم، رذیل اور شریف اور ظالم ومظلوم کے مابین مساوات و برابری، مسلسل پروان چڑھ رہی ہے، نیز جمہوریت میں اخلاق واقدار کی کوئی قیمت نہیں ہے اس لئے کہ جمہوری نظام میں مقبولیت کا معیار کثرت تعداد پر ہے اور وہ تعداد جس طرح بھی حاصل کی جاسکے وہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

جمہوری نظام کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب ''طرز انتخاب'' ہے اس میں ہر بالغ مرد عورت کو ووٹ دینے اور امیدوار بننے کا حق حاصل ہے اس سلسلہ میں اس کی سیرت وکردار، اس کے اخلاق وعادات اور اس کی عملی صلاحیت ولیاقت کو نہیں دیکھا جاتا، چنانچہ بسا اوقات پارلیمنٹ میں فنکار، فتنہ پرور، اور اخلاقی وقانونی طور پر سزایافتہ لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو ذرہ برابر شک نہیں ہوگا جو کسی جمہوری ملک میں رہا ہو یا جس نے جمہوری انتخابات کا مشاہدہ کیا ہو، یا جس نے سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی فہرست دیکھی ہو اور ایوان پارلیمنٹ کے ممبروں پر تفتیشی نظر ڈالی ہو، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ہر جدید الیکشن میں حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں مقتولین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، بیلٹ بکس پر قبضہ، پولنگ اسٹیشنوں کی طرف ووٹروں کو جانے سے روکنا، نتائج کے اعلان میں جعلسازی، الغرض اس قسم کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے، اکثر وبیشتر ان امیدواروں کی کامیابی کا اعلان کردیا جاتا ہے جنھوں نے کم سے کم ووٹ پائے ہوں۔

انتخابات کے دوسرے وسائل وذرائع میں بے دریغ پیسہ کا استعمال، ووٹرس پر دباؤ، لالچ، دھمکی، مخالف کنڈیڈیٹ کا قتل اور اغوا اور ووٹروں کو جسمانی طور پر پولنگ

میں حصہ لینے سے روکنا، نتائج میں تبدیلی کے لئے رشوت یا طاقت کا استعمال، مذہب یا ذات پات کا سہارا لینا، جو اگرچہ قانون کے خلاف ہے، مگر اس پر کھلے طور پر عمل کیا جاتا ہے، اشتراکی اور فوجی جمہوریتوں میں حالات اور بھی زیادہ افسوسناک اور ناگفتہ بہ ہیں کہ ان جمہوریتوں میں الیکشن کے نتائج، برسراقتدار پارٹی کے حق میں ۹۹ فیصد ظاہر ہوتے ہیں اکثر الیکشن میں ہاں یا نہیں والا طریقہ استعمال ہوتا ہے، یا صرف ایک ہی پارٹی کے نمائندے الیکشن میں ہیں، یا فرضی الیکشن ہوتے ہیں، یا جمہوریت بلا انتخاب کے مدتوں قائم رہتی ہے۔

جن ملکوں میں ایسی جمہوریتیں قائم ہیں، جہاں انتخابات نہیں ہوتے، وہ حقیقت میں جمہوریت نہیں ہیں بلکہ ان کی مثال جاگیردارانہ نظام کی ہے جس میں صدر مملکت نے جمہوریت کا نام اپنے نظام کو قانونی بنانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہاں آزادی رائے نہیں ہے، قوم سربراہ کی تائید وحمایت پر مجبور ہے، وہاں کا پریس ریڈیو، سرکار کے قبضہ میں ہے، صدر مملکت کے قہر وغضب سے کسی میں اس کی مخالفت کی ہمت نہیں ہوتی ہے، وہاں کا پریس اور ریڈیو اس قائد اور اس کی جماعت کی تقدیس بیان کرتا رہتا ہے کہ اس کی زندگی قوم کی خوشحالی کے لیے وقف ہے، چنانچہ اس کی خدمات اور کارنامے قوم کے نام سے موسوم ہوتے ہیں، اور اس پر تنقید کرنے والے سامراج کے ایجنٹ قرار پاتے ہیں، وقتاً فوقتاً سازشوں کا انکشاف کر کے مخالفین کا صفایا کیا جاتا ہے۔

مسٹر چرچل نے جمہوریت کو خراب نظام اس وقت قرار دیا جب اس نظام کے عواقب ونتائج کھل کر سامنے نہیں آئے تھے اور یہی حال اس نظام کے مؤسسین اور مفکرین کا بھی ہے کہ ان کو اس کے انجام کا اندازہ نہ ہوسکا، تعجب خیز امر یہ ہے کہ موجودہ الیکشن کے نظام، اس کے نتائج، جمہوری نظام کے تحت الیکشن میں لیڈروں کی

سرگرمی اور جمہوری ممالک کے باشندوں کو زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی لوگ جمہوریت کے حامی نظر آتے ہیں، بعض لوگ ایسے جمہوریت نواز ہیں کہ اس کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اس کو سارے مسائل کا حل سمجھتے ہیں، انھیں جمہوریت مطلوب ہے، چاہے جمہوریت صرف نام کی ہو، جمہوری حاکم ظالم وجابر حکمراں ہو، قوم جمہوریت میں مظلوم ومقہور ہو، اور اس کے اقتصادیات کا دیوالیہ نکل چکا ہو، ان تمام برائیوں اور خرابیوں کے باوجود جمہوریت کے دل دادہ حضرات غیر جمہوری نظام کو ناپسند کرتے ہیں، چاہے غیر جمہوری نظام کا سربراہ عدل وانصاف اور جود وسخا کا علمبردار ہو، اس کے عوام کی زندگی راحت وسکون کی آئینہ دار ہو ، اور غیر جمہوری ملک خوشحالی وفراوانی کا نمونہ ہو، بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں جمہوریت، اشتراکیت دیدو، ہماری دولت لے لو، یہ اصطلاحات سے مرعوبیت کی ایک مثال ہے، موجودہ طرز جمہوریت اور اشتراکی نظام دونوں قوموں کی خوشحالی، امن وامان، اور ترقی کے حصول میں ناکام ہو چکے ہیں، اب نئے تجربہ کی ضرورت ہے جو قوم کے مزاج، حالات تعلیمی معیار اور صلاحیت کے مطابق ہو۔

شراب - سم قاتل (☆)

یا أیھا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان۔

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور پانسے بری گندی باتیں ہیں شیطان کے کام۔

روایت پسند اور مثالی اقدار اور روایات کے حامل معاشرے میں شراب ایک عظیم گناہ اور سنگین جرم تصور کی جاتی تھی، شراب نوشی کرنے والے کو سزائیں دی جاتی تھیں اور قابل مذمت سمجھا جاتا تھا اور شراب نوشی کرنے والے کو کسی بھی معاشرے اور سوسائٹی میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا ان کے یہاں یہ تصور پایا جاتا رہا ہے کہ ایک بری لت ہے اور صحت کے لئے انتہائی مضر اور مہلک ہے اور اس سے بہت سے ایسے امراض پیدا ہوتے ہیں جس کا علاج بسا اوقات ڈاکٹروں کے لئے بھی دشوار ہوتا ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ شراب اخلاقی گراوٹ کا باعث بنتی اور بہت سے مفاسد کو جنم دیتی ہے اور انسانی صلاحیتوں کو تباہ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: الخمر جماع الاثم'' (شراب تمام گناہوں کی جڑ ہے) شراب نوشی کو روکنے کے لئے بہت سے ملکوں نے مختلف تدابیر اختیار کیں اور بے پناہ دولت صرف کی اور قوانین بنائے اور اس کے روک تھام کے لئے وسائل اختیار کئے لیکن نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ تمام کی تمام کوششیں بے سود اور بیکار ثابت ہوئیں اور اس کی مذمت بیان کرنے والے ذرائع ابلاغ (Media) کا بجائے اس کے کہ شراب کی روک تھام میں انھیں خاطر

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رجنوری ۱۹۹۲ء۔

خواہ کامیاب ملتی وہ مزید اضافے کا باعث بننے اور ان سے شراب نوشی کو اور فروغ حاصل ہوا، اس لئے کہ شراب کے نقصانات بہت مخفی اور پوشیدہ اور جلد نہ ظاہر ہونے والے اور غیر شعوری ہیں، انجام کار ان تمام کوششوں کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور سبھی ملکوں میں میخواری اپنی جگہ پر برقرار رہی۔

انھیں نقصانات اور شراب نوشی سے پیدا ہونے والے مختلف النوع امراض اخلاقی فساد اور بے حیائی کے پیش نظر امریکہ کی پارلیمنٹ میں قانون تحریم خمر اکثریت سے پاس ہوا، لیکن اس قانون کے باوجود دن بدن شراب نوشی میں اضافہ ہوتا رہا اور اس قانون کو آخر کار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

قانون کے ذریعہ سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اٹھارہویں ترمیم سے پہلے کئی سال تک اینٹی سیلون لیگ (Anti Saloon Lague) رسائل و جرائد، خطبات، تصاویر ہیچیک لنیٹر، سینما اور ہمت سے دوسرے طریقوں سے شراب کی مضرتیں اہل امریکہ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی رہی اور اس تبلیغ میں اس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا، اندازہ کیا گیا ہے کہ تحریک کی ابتداء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک نشر و اشاعت پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے اور شراب کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع کیا گیا وہ تقریباً ۱۹ ہزار صفحات پر مشتمل تھا اس کے علاوہ قانون تحریم کی تنفیذ کے مصارف کا جس قدر بار گذشتہ چودہ سال میں امریکی قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کی مجموعی تعداد ۴۵ کروڑ پونڈ بتائی جاتی ہے اور حال میں متحدہ ممالک امریکہ کے محکمۂ عدل نے جنوری ۱۹۲۰ء سے اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی تنفیذ کے سلسلہ میں دو سو آدمی مارے گئے، ۵۳۴۳۵ قید کیے گئے، ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرمانے عائد کیے گئے، چالیس لاکھ پونڈ کی مالیت

کی املاک ضبط کر لی گئی، (تنقیحات ص ۳۷) لیکن آخر کار تاریخ عالم کا یہ بڑا اصلاحی جہاد بے سود ثابت ہوا۔

ہندوستان بھی لوگوں کو اس بری عادت سے نجات دینے کا خواہشمند تھا، اس نے شراب نوشی پر پابندی عائد کرنے کی بھرپور کوشش کی، اس لیے کہ آزادی سے قبل کانگریس پارٹی کے منشور میں یہ بات تھی کہ جب کبھی زمام حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی اور اقتدار حاصل ہوگا تو وہ شراب نوشی پر مکمل پابندی لگائے گی اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے پابندی عائد کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی تمام کی تمام کوششیں ہندوستانیوں کے عزم میخواری کے آگے ناکام ہوگئیں اور شراب نوشی میں بجائے کمی کے روز افزوں اضافہ ہی ہوتا گیا اور شراب کی تجارت کو مزید فروغ ملا، تہذیب وتمدن اور وسائل کی فراوانی اور مال ودولت کی بہتات کے ساتھ ساتھ شراب نوشی بھی عام ہوتی گئی ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' عہد ماضی میں شراب پینا ایک سنگین جرم تھا، اس لیے کہ وہ اخلاقی بگاڑ اور صحت جسمانی میں فساد پیدا کرنے والی تھی اور طبی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک مضر شئے ہے لیکن چونکہ اس کے نقصانات کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات غیر شعوری طور پر مرتب ہوتے ہیں اس لئے جو لوگ دینی مزاج اور دینی فکر نہیں رکھتے، وہ ان ملکوں او راسلام کی عائد کردہ پابندیوں پر طرح طرح کے عیب لگاتے رہے اور نکتہ چینی کرتے رہے اور ان پابندیوں کو تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے رہے اور اس کو فکری جمود کا نتیجہ تصور کرتے رہے۔

شراب کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر ہے بعض لوگ اس کے زہر ہونے کے بھی قائل نہ تھے، بلکہ اس کو محض دینی یا اخلاقی کمزوری سمجھتے تھے لیکن گذشتہ عرصہ میں پیش آنے والے واقعات سے ثابت ہوا کہ شراب سم قاتل ہے

اس کی زندہ مثال ہندوستان کے بعض شہروں میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات ہیں جن کا لوگ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، چنانچہ دہلی میں پیش آنے والا واقعہ اس کا شاہد ہے اور یہ انتہائی سبق آموز اور دردناک واقعہ ہے، اس طرح کے واقعات شادی بیاہ اور تہواروں کے موقعوں پر بھی پیش آچکے ہیں، لیکن اسے ایک اتفاقی چیز سمجھ کر بجائے اس کے کہ عبرت حاصل کی جائے نظر انداز کیا گیا، دہلی کا واقعہ آپ کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے جس میں سرکاری شمار کے مطابق دوسو افراد لقمۂ اجل بن گئے اور ان میں ایک بڑی تعداد خطرناک جسمانی امراض میں مبتلا ہے۔ راجکوٹ میں بھی پچیس اشخاص ہلاک ہوگئے اور انھیں دنوں جنوب ہند میں دس افراد کی جانیں ضائع ہوئیں اور اس کے علاوہ بڑے پیمانہ پر حادثات رونما ہوئے جن کا نہ تو اخبارات میں کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی اس کے متعلق ذرائع ابلاغ سے کوئی معلومات فراہم ہوئیں۔

یہ لرزہ خیز اور دردناک حادثات ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا کرتے ہیں، ان واقعات کے بعد شراب نوشی امن وسلامتی، انسانیت کے لئے موت وزیست کا مسئلہ بن چکی ہے اور اس کے نقصانات بالکل آشکارا ہو چکے ہیں اس کی پردہ پوشی ناممکن ہے۔

اب یہ مسئلہ صرف دینی ہی نہیں رہا کہ دینی افکار وخیالات کے حاملین ہی اس پر غور کریں بلکہ صورت حال یہ ہے کہ ارباب سیاست اور قانون کے پاسبانوں کو بھی اس پر سنجیدگی اور غور وفکر کر کے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہئے۔

تمام ذمہ دار حکومتیں ان تمام دواؤں پر جن میں ایک ذرا بھی نقصان کا احتمال ہوتا ہے پابندی لگاتی ہیں، اور لائسنس اور پرمٹ ضبط کئے جاتے ہیں۔

شراب کے نقصانات اس کے منافع سے کہیں زیادہ ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ویسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیھما إثم کبیر ومنافع للناس وإثمھما أکبر من نفعھما۔

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں۔آپ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے منافع سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ شراب پر پابندی عائد کرنے کے لئے اور نوجوان نسل کو اس بری عادت سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی فیصلہ کن اقدام کیا جائے کیونکہ یہ ایسا زہر ہلاہل ہے جو تباہ کن اسلحوں سے بھی زیادہ خطرے کا باعث ہے، اگر اس سلسلہ میں کوئی روک تھام نہ کی گئی اور کوئی ٹھوس اقدام نہ ہوا تو مستقبل میں اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ (شراب سے بچے رہو تا کہ کامیاب ہو جاؤ)۔

دانشوروں کی ذمہ داری (☆)

مغربی سامراج کے عہد میں مغرب سے ثقافتی اور فکری سطح پر تاثر کے نتیجے میں بعض مسلم اہل قلم نے مشرق کے سلسلے میں ناقدانہ موقف اختیار کیا، اور مغرب کے سلسلے میں کامل تقلید کا، انھوں نے ہر مغربی فکر کو سراہا اور ہر مشرقی چیز کی مذمت کی، ادیبوں، ناول نگاروں، قصہ نویسوں اور افسانہ پردازوں نے اپنے معاشرہ کی نہایت گھناؤنی شکل پیش کی، سوسائٹی میں جتنی بھی برائیاں تھیں، انھیں ایک ایک کر کے چن لیا اور اسے اپنی ادبی تخلیقات میں نہایت وسیع پیمانہ پر اور خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا، مشرقی معاشرہ کی یہ تصویر اتنی تاریک تھی کہ خود مشرقی ذہنوں میں اس سے نفرت پیدا ہوئی، اہل قلم نے اپنے اس رویہ کی یہ تاویل پیش کی کہ اس طرح مشرقی معاشرہ کی برائیوں اور کمزوریوں کو نمایاں کر کے اور دوسرے معاشرہ کے محاسن اور خوبیوں کے پہلوؤں کو اجاگر کر کے مشرقی معاشرہ کی برائیوں اور کمزوریوں کی اصلاح اور علاج ہو سکے گا۔ اس لئے کہ انسان کو جب اس کی شخصیت کو داغدار کرنے والی چیزوں اور دوسروں کی عزّت و وقار کو چار چاند لگانے والی چیزوں کا علم ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی خوبیوں کو اختیار کر کے اپنے اخلاق و سلوک اور موقف میں بہتری لانے کی زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تاویل بعض ادیبوں کے حق میں صحیح اور درست ہو اور بعض اہل قلم کے اخلاص و ذہانت میں شک بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، مگر محض کسی کے برے پہلوؤں کو پیش کرنے سے دو طرح کے ردعمل ظاہر ہوتے ہیں ایک تو غضب و غصہ،

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر نومبر ۱۹۹۳ء۔

کینہ وحسد، نفرت وناشکری، دوسرے احساس کمتری، احساس شکست اور ذاتی ناکامی کا شعور۔ مشرقی معاشرہ انفعال وتاثر کے ان دونوں قسموں سے گذرا ہے البتہ احساس کمتری کی راہ پر لے جانیوالا ردعمل ماضی میں کچھ زیادہ اثر انداز رہا ہے، مشرقی ادیبوں اور قلم کاروں کی اس طرح کی تحریروں سے مغرب نے مشرقی قوموں کے دلوں پر اپنی عظمت وبرتری کا سکہ بٹھانے اور اپنے طرز زندگی کو ان پر مسلط کرنے کے سلسلے میں کافی فائدہ اٹھایا ہے۔

اور علی الاطلاق یہ الزام عائد کرنا بھی انصاف کی بات نہیں کہ اس عہد کے تمام ہی شعراء دانشور اور اہل قلم مشرق بیزار اور مغرب کے مقلد تھے، اور اپنے وطن وقوم اور معاشرہ کے لئے مخلص نہ تھے، لیکن یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ان کی اکثریت نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ مرعوبیت کا موقف تھا۔ اور ان کا یہ موقف غیر فطری عمل نہ تھا، بلکہ تہذیب وتمدن کے عروج وزوال اور فکر ونظر کے تصادم کی تاریخ کے ابتدائی مرحلہ کا قدرتی نتیجہ ہے، خصوصاً کمزور طبیعتوں اور مادی ذہن رکھنے والوں کے اندر یہ صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ موقف میں تبدیلی آنا بھی اصول فطرت ہے،.....اس وقت جب کہ اصل حقیقت حال کھل کر سامنے آگئی اور جن کی نگاہیں مغرب کی چمک دمک سے خیرہ ہورہی تھیں ان پر تمام برائیاں اور کمزوریوں کے اسباب وعوامل اور مقامات واضح ہوگئے اور اس سلسلے میں جتنی رکاوٹیں تھیں وہ بھی دور ہوگئیں، اور مختلف ملکوں کے درمیان بلکہ مشرق ومغرب کے درمیان کے فاصلے سمٹ گئے اور بکثرت لوگوں نے یورپ کا دورہ کیا، یا اس کے بارے میں پڑھا، تہذیب یورپ کے نقش قدم پر چلنے والوں کو دیکھا اور مغربی تہذیب کی حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہوگئے۔

آج جو شخص بھی مغرب کے کسی ملک کا دورہ کرتا ہے اسے وہاں بعض خوبیوں

کے ساتھ ساتھ برائیاں بھی نظر آتی ہیں اور خوبیوں میں زوال بھی نظر آتا ہے، حتیٰ کہ نظافت ونفاست اور صفائی وستھرائی، امانت وایمانداری اور امن وآشتی جیسے امور بھی مغربی زندگی کی اب خصوصیت نہ رہے بلکہ دن بدن ان تمام میدانوں میں حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔

اور روز بروز پرانے پیمانے ٹوٹتے نظر آرہے ہیں اور قدیم سکے کھوٹے ثابت ہورہے ہیں، چنانچہ غریبی وجہالت ،فقر وبے روزگاری ، تشدد وبنیاد پرستی، دینی عصبیت، مذہبی منافرت فرقہ وارانہ فسادات صرف مشرقی زندگی کے خصائص یا مسائل نہ رہے، بلکہ ان مسائل اور مشکلات نے پورے یورپی معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور مشرقی یورپ میں تو اسے سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے۔

اس ضمن میں کچھ ایسی خرابیاں اور بیماریاں بھی ہیں جن میں یورپ کو قیادت عظمیٰ کا شرف حاصل رہا ہے، مثلاً انسانی ناموس کی پامالی، انسانوں کی زبوں حالی کا استغلال، نسلی امتیاز، طبقاتی ناہمواری وتفاوت، انسانی حقوق سے انحراف، زبان وکلچر تہذیب وثقافت فکر وخیال میں سخت گیر رویہ، حقائق کا الٹ پھیر اور موقع پرستی ونفع اندوزی کی خاطر حادثات کی مصنوعی صورت حال پیدا کرنا، نیز مقاصد اور اغراض کے حصول کے لئے ناجائز وسائل وذرائع کا استعمال وغیرہ۔

رہ گئیں اخلاقی برائیاں اور خرابیاں تو یورپ اس میدان میں پہلے سے ہی پسماندہ تھا، اس نے پہلا وار اخلاق ہی پر کیا، اسے عقلیت اور حقیقت پسندی کا بڑا دعویٰ تھا، عقلیت پسندی آج یورپ والوں کے لئے وبال جان بن چکی ہے، کبھی تو اس سے عاجز آکر لامعقولیت کا چولہ پہن لیتے ہیں اور یہ طریقہ بھی پوری زندگی میں ایک مذہب ومسلک کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور عقلاء، اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ لامعقولیت اور لاابالی پن میں گذارنے لگے ہیں۔

یورپ کی وہ اجتماعی وانفرادی زندگی جس میں مغرب کا انسان اقدار وروایات اور معقولیت واخلاقیت سے بالکل کٹ چکا ہے، یورپ کے سیاسی رجحانات ومیلانات کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یورپ اس وقت لامعقولیت کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یورپ کی سیاست کی بنیادیں تحفظ مصالح اور مفادات کے تصورات پر استوار ہوتی تھیں، لیکن مغرب کی موجودہ سیاست ان بنیادوں پر بھی الگ ہو چکی ہے، اب وہ انتشار وبدنظمی، لاقانونیت وانارکی کا شکار ہے، یورپ کی بیشتر حکومتیں گومگو اور شک وتردد، قوت ارادی کی کمزوری، غیر یقینی صورت حال کی کیفیت سے دوچار ہیں تمام معاملات ان کے قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں، ہر طرف یاس وناامیدی کی مہیب تاریکی ہے، روشنی، صبح امید، صحیح لائحہ عمل اور حالات کا صحیح رُخ نگاہوں سے اوجھل ہے، چنانچہ انھیں نامساعد حالات کے تحت بہت سی تنظیموں، اداروں اور ایجنسیوں نے اپنی تاثیر وقوت اور موضوعیت ومعنویت کھودی ہے، اس لچک دار اور خودفراموشی کی زندگی مثال اقوام متحدہ ہے جو کسی زمانے میں اتنی نکمی، غیر موثر بے وزن، بے قیمت اور قراردادوں وتجاویز کے پاس کرانے سے عاجز نہ رہی جتنی کہ موجودہ زمانے میں بعض طاقتوں سے بندھ جانے کے بعد ہے۔

کسی کی تابعداری میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی یہ کوئی قابل معافی جرم ہے، لیکن سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی نہایت کمزور شخص کی تابعداری کرے، اقوام متحدہ آج کل ان کمزوروں کے تابع ہے جو قراردادوں اور تجاویز کو پاس کرانے، یا پیش کرنے، نشان راہ معلوم کرنے، یا ان حقائق کو سامنے لانے کی بھی طاقت نہیں رکھتے، چنانچہ آج اقوام متحدہ کی حالت ایک مجلس یا ادبی کلب یا اسٹیج سے بھی بدتر ہے۔

انسانوں کی طرح قومیں بھی کمزور وطاقتور، طاقتور وکمزور ہوتی ہیں، تاریخ کا یہ غیر متبدل اصول ہے، تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سی سلطنتیں، اور امپائرس وجود میں

آئے، مگر ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا، کسی زمانے میں ترکی کو آقائے عالم کی حیثیت حاصل تھی، پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب اہل یورپ نے ترکی کو یورپ کے مرد بیمار سے تعبیر کیا۔ دیگر قومیں ان پر ہر طرف سے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑیں، ترکی کبھی دیگر قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتا تھا لیکن اس کے بعد اس سے کمزور قومیں اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگیں، ترکی کے زوال کے بعد روس ایک بڑی طاقت بن کر ابھرا، اس کا زوال بھی سب نے دیکھ لیا، کتنوں کے عقیدہ خراب ہوئے، اور کتنے الحاد کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے، اس خصوص میں برطانیہ کا زوال بھی ایک زندہ حقیقت ہے، جرمنی، جاپان، اور دیگر ملکوں کا انجام بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن بعض یورپی حکومتیں ابھی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتی ہیں، اس کا اس بات پر شدید اصرار ہے کہ وہ جس حال پر ماضی میں تھیں اسی حال پر برقرار رہیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ طاقتور ہیں، اگر چہ وہ کمزور ہوں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی ہیں اگر چہ وہ چھوٹی ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خوشحال ہیں اگر چہ وہ پسماندہ ہوں۔

دنیا میں رونما ہونے والے حوادث پر جس کی نظر ہے خصوصاً بوسنیا ہرزے گودینا، صومالیہ سوویت یونین کی سابق جمہوریاؤں، سابق یوگوسلاویہ اور دیگر جگہوں پر جہاں خونریز تصادم، المناک حوادث سخت حالات درپیش ہیں، اور انسانی خون کی نہریں رواں ہے، اور جائداد، پراپرٹیاں تباہ کی جارہی ہیں، مسائل اور مشکلات دن بدن پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں، ان تمام حالات پر جس کی نظر ہے وہ اپنے اس احساس کو کبھی نہیں چھپا سکتا کہ دنیا کسی ایسی طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے جو توازن کو برقرار رکھتی، بڑی تیزی سے انارکی، بدنظمی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

آج دنیا میں کوئی طاقتور ہے نہ کوئی بڑا، امریکہ کا گمان ہے کہ وہ آقائے عالم ہے، دنیا کا واحد سُپر پاور، اور یہ کہ دنیا کا نیا عالمی نظام صرف وہی قائم کرسکتا ہے

مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی عالمی بالادستی اور بین الاقوامی کنٹرول وجود میں آنے سے پیشتر ہی زمیں بوس ہوگیا اور پوری دنیا کو یہ معلوم ہوگیا کہ امریکہ اپنے تین چار فوجیوں کا بھی خسارہ برداشت نہیں کرسکتا، اور نہ ہی وہ کسی علاقائی جنگ کے اخراجات یا اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور نہ ہی وہ اپنی بالادستی کو کسی پر نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رہ گئیں دوسری حکومتیں تو وہ تو اور بھی عاجز اور بے دست و پا ہیں، وہ کسی طرح کے نقل وحرکت اور عملیت وفعالیت کی تمام تر توانائیوں سے محروم ہوچکی ہیں۔

ان تمام ترقی یافتہ ملکوں کا سیاسی کھوکھلا پن اسی طرح طشت از بام ہوچکا ہے جس طرح ان کا اخلاقی دیوالیہ پن بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے، اور کچھ عجیب نہیں کہ ان حکومتوں کے اندر یہ ضعف وناتوانی بھی جلد سرایت کرجائے کیونکہ وہ شباب کے مرحلے سے گذر کر پیری کے حدود میں قدم رکھ چکی ہیں۔ آج اقوام متحدہ کی باگ ڈور انہیں ماضی کی بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے، جو اس بات کی منتظر ہیں کہ اولوالعزم اور صاحب بصیرت افراد ہمت کرکے ان کے اس کھوکھلے پن کو ظاہر کردیں اور عالمی قیادت میں تبدیلی لائیں۔ جب تک زمانۂ قیادت معذوروں کے ہاتھ سے دست وبازو رکھنے والے اور چشم بینا کے مالک افراد کے ہاتھ میں نہیں آجاتی دنیا کا توازن درست نہ ہوگا۔

یہ فرسودہ قیادت اصحاب بصیرت کا راستہ روکنے کی کوشش کررہی ہے لیکن ان کے سیاہ کرتوت اور ظالمانہ طرز عمل اور عاقبت نااندیشانہ تدبیریں ان کے انجام کو قریب کررہی ہیں اور ان کا ظلم واستبداد اور چیرہ دستی وسفاکی ان کی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس دردناک انجام کے سامنے آنے، اور متوقع ردعمل کے ظہور پذیر ہونے سے مانع یہ ہے کہ ان کا ان ملکوں کے ذرائع ابلاغ پر مکمل قبضہ ہے جو ''مسخ حقائق'' کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیتا ہے۔ چنانچہ ذرائع ابلاغ اپنے ملکوں کی برائیوں پر تو پردہ

ڈالتے ہیں مگر یوروپی حدود کے باہر مشرقی ملکوں کی برائیوں پر اپنی تمام توجہات مرکوز رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان مکروفریب، غلط فہمی ودسیسہ کاری کی زندگی گزار رہا ہے اور اگر کوئی اہل قلم یا صاحب فکر ونظر اور آزاد ذہنیت کا مالک فرد اس پروپیگنڈہ کے کھوکھلے پن کی پردہ درازی کرنے اور عصر حاضر کے فرمارواؤں کی کمزوریوں پر انگلی رکھنے کی جسارت کرتا ہے تو بہت جلد موت اس کے دروازوں پر دستک دینے لگتی ہے یا وہ کسی سازش کا شکار ہو جاتا ہے۔

آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان جابر وظالم نظاموں کے خود ساختہ اصنام کو منہدم ومسمار کیا جائے جو انسانیت کی تباہی وبربادی ہلاکت خوں ریزی، فتنہ وفسادات کے سوا کچھ نہیں دیتے، اور یہ نظام شمشیر وسنان کی نوک سے نہیں مٹے گا، اور نہ ہی اسے میدان جنگ میں شکست دی جاسکتی ہے، اس کی شہ رگ صرف آبدار اور حریت پسند، تنقید نگار قلم اور مضبوط وپائیدار فکر سے ہی کاٹی جاسکتی ہے جو ان کے مکروفریب اور کھوکھلے پن کو پوری طرح دنیا کے سامنے واشگاف کردے۔

اور ان کی وجہ سے دنیا میں جو گمراہیاں یا گمراہ گریاں پیدا ہوئیں یا انھوں نے جس طرح انسانیت کو گمراہیت کے عمیق غار میں پہونچا دیا وہ سب آشکارا ہو جائے اور ان تمام اہم کاموں کی ذمہ داری انہیں لوگوں کی ہے جو تہذیب وتمدن کے مزاج، اجزائے ترکیبی اور اس کے نمائندوں کی شخصیتوں سے آگاہ ہو اور بڑی طاقتوں اور اس کے قائدین وسیاست دانوں سے باخبر ہوں، ایسے تمام لوگوں کا فریضہ ہے کہ وہ ان چیزوں کی نقاب کشائی کریں، اور مغرب کے اس طویل عہد میں جو گمراہیاں پھیلائی گئیں ہیں ان کی حقیقت کو واضح کریں تاکہ مغرب کا علمی اور فکری تسلط ختم ہو، گذشتہ عہد کی تحریروں کی روشنی میں یہ کام اب بہت آسان ہے اس کے لے اسلام سے واقفیت رکھنے والے دانشوروں کی ضرورت ہے، اور یہی ان کا جہاد ہے۔

مذہب بیزاری - سامراجی عہد کا ورثہ؟ (☆)

انسانی دنیا پر یورپ کی فکری بالادستی اور سیاسی اقتدار کے عہد سے یورپ کا نظام تعلیم وتربیت چھایا ہوا ہے، فکر وادب، سیاست واقتصادیات کے میدان میں مغربی افکار ونظریات کا غلبہ ہے، مسلمانوں کی متعدد نسلوں نے مغربی دانشگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی جس وجہ سے عالم اسلام میں مختلف قسم کے مذاہب فکر، مکاتب خیال اور رجحانات پیدا ہوئے جن کا سرچشمہ مغربی تصورات اور افکار ونظریات تھے، ان افکار ونظریات میں بعض وہ ہیں جو اصل اسلامی مسلمات اور تعلیمات سے ماخوذ ہیں اور اب وہ مروجہ طرز فکر کا اس طرح حصہ بن گئے ہیں کہ اصل اور نقل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوگیا ہے، بعض افکار مغرب کی زندگی، اور ان کی علمی تحقیق اور سیاسی مصالح وتقاضوں سے تعلق رکھے ہیں، اس عہد میں بعض تعبیرات واصطلاحات اور الفاظ ومحاورات عوام الناس کی زبان زد ہوکر ان کی زبان کا حصہ بن گئے، اسلامی معاشرہ کی عام زندگی میں مغرب سے تعلق کے نتیجے میں بعض ایسے تصورات اور رجحانات پیدا ہوئے جو اسلامی تصور کے خلاف ہیں، جیسے انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی کے مقابلے میں اور موقع پرستی وخودغرضی، ایثار وقربانی کے مقابلے میں، مال ودولت کی حرص وہوس، خودداری وقناعت کے مقابلے میں، اعلیٰ طرز زندگی اور معیاری انداز معیشت، غیر ضروری سامان، عیش وعشرت کی چاہت ومحبت معمول اور معتدل زندگی کے مقابلہ میں یہ صورت حال محض مغربی تہذیب وتمدن اور الحادی ومادی طرز فکر کی یورش وآویزش کا نتیجہ تھی۔

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ر جنوری ۱۹۹۴ء۔

عالم اسلام پر مغربی تہذیب وتمدن کے فکری، عقلی، نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے گہرے اثرات مرتب ہوئے، اس کی وجہ سے عالم اسلام کے طرز فکر اور بعض ان امور کے متعلق نقطۂ نظر میں کافی تبدیلی واقع ہوئی جن کا زندگی ودستور زندگی اور انسانی سلوک وکردار، عقیدہ ودین، نظام حکومت اور اخلاق واقدار سے گہرا رشتہ ہے۔

مغربی افکار کے براہِ راست اثر انداز ہونے کا یہی نتیجہ تھا کہ دین واخلاق کے بارے میں سلبی موقف اختیار کیا گیا، یورپ کو چونکہ کلیسائی اقتدار کے سخت گیر ٹھیکیداروں کا بہت تلخ تجربہ تھا نیز وہ دیندار طبقے اور علم وادب، آزاد تحقیق اور مطالعہ کے علمبرداروں کے درمیان شدید کشمکش کا مشاہدہ بھی کر چکا تھا، یورپ نے ہزار سال کے عہد میں پھیلا ہوا جو تلخ تجربہ کیا تھا اس میں دینی نقطۂ نظر کے حامل بنیاد پرست، رجعت پسند عناصر، آزادانہ تحقیق ونظر اور آزادانہ بحث ومطالعہ کی راہ میں حائل تھے، وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور ظالم وجابر حکمرانوں کی پشت پناہی کرتے تھے، یورپ ایک طویل عرصہ تک ان جاگیرداروں اور ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں علمائے دین کی چیرہ دستیوں اور جبر وتشدد کا شکار رہا جس کی وجہ سے آزادانہ تحقیق ومطالعہ اور آزادیٔ خیال کے حامیوں کے ذہن ودماغ میں دین اور دین کے حامل عناصر کے بارے میں نہایت گھناؤنا اور غلط تصور بیٹھ گیا۔

لیکن اسلام کا دامن اس طرح کی افراط وتفریط سے پاک ہے، اس نے کبھی بھی علم وادب اور فکر وفن کی راہ میں روڑے نہیں ڈالے، بلکہ اسلام تو علوم ومعارف میں توسیع وترقی کا داعی ہے، علمائے اسلام نے علم وفن کے مختلف شعبوں میں یک رنگی اور وحدت پیدا کی ہے، انہیں کے درمیان سے فلاسفہ اور اطباء اٹھے، انھیں کے درمیان سے ریاضیات وانجینئرنگ کے ماہرین بھی اٹھے، اور انھیں کی صف سے میدان سیاست کے شہسوار بھی اٹھے اور علوم نقلیہ کے ترکتاز اور باکمال بھی۔

یہ علماء ومحققین انھیں قدیم مدارس کے پروردہ تھے جن سے شریعت کے

ماہرین پیدا ہوئے، اوران میں بعض اہل کمال دونوں علوم عقلیہ ونقلیہ میں کمال رکھتے تھے، ان میں بعض ایسے باکمال علماء تھے جو ایک وقت میں ادیب، شاعر، اچھے نثر نگار، فن میں باکمال اور فلسفہ، طب، انجینئرنگ حتیٰ کہ موسیقی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، فلسفی، محدث، لغوی، فقیہ اور ادیب تھے، اسلام نے علم کے تئیں کسی طرح کا کوئی امتیاز یا منفی رویہ نہیں برتا، اس نے غور وفکر، بحث ونظر اور تحقیق وتدبر کا دائرہ محدود نہیں کیا، اور نہ ہی اسکے دروازے پر پہرہ بٹھایا، بلکہ آزادانہ انداز فکر اور روشن اسلوب نظر اور عقل کی جائز حدوں میں رہ کر اس کی تمام شروط کی رعایت کرتے ہوئے اسے استعمال کرنے کی اجازت دی، حریت فکر کے تصور کیساتھ اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور اسلام میں اس بات کو بڑی اہمیت دی گئی۔

عقل کا دائرہ محدود ہے اور کسی نہ کسی مرحلہ میں اس کو کچھ امور کو مسلمات تسلیم کرنا پڑتا ہے، عام زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ محض عقل کو کسی چیز کے قبول کرنے یا مسترد کرنے کی بنیاد بتانے کے پرجوش داعی اور مبلغ ہیں وہ خود اپنی عام زندگی میں ان ضوابط اور اصولوں کو منطبق نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت سے ادباء، اہل قلم دین واخلاق اور روایات واقدار اور معتقدات ورجحانات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں مگر اس کے ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں کا استثناء کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے وضعی قوانین ودستور اور سیاسی نظام کو تنقید کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کرتے، اور نہ ہی اسے قبول کرنے یا مسترد کرنے میں عقل کو آڑے آنے دیتے ہیں اور نہ ہی اس میں کسی طرح کے جرح وقدح کی اجازت دیتے ہیں، یہی لوگ احادیث نبویہ اور آیات قرآنیہ ونصوص شرعیہ نیز سلف صالحین محدثین ومفسرین کی تاویلات وتشریحات کو کھل کر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، اوران نصوص کی عقلی توجیہیں کرتے ہیں، اور اگر ان کے فہم وادراک سے متصادم ہو تو اسے بلاتردد رد کردیتے ہیں۔

حالانکہ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی عقل وفہم کے درجات باہم متفاوت اور مختلف ہوتے ہیں، ماحول، حالات، تجربات اور معاشرتی مرتبے اور ذہنی کیفیات کے اعتبار سے بھی انسان کا عقلی ادراک مختلف اور متفاوت ہوتا ہے، اگر تمام معاملات کو صرف عقل انسانی پر ہی چھوڑ دیا جائے تو اس سے برآمد ہونے والے نتائج بالکل مختلف ہوں گے، ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر سوسائٹی اور ہر طبقہ کا الگ ایک مستقل دین ہوگا۔ اور اسی عقلی رجحان کی وجہ سے بعض عقلیت پسندوں نے بہت سی احادیث نبویہ کا انکار کیا، اور بہت سے قرآنی الفاظ کی نہایت رکیک اور کمزور تاویلیں کیں نیز دیگر دینی اصطلاحات کی عقلی توجیہیں کیں جو سلف صالحین کی تاویلات وتشریحات سے بالکل جداگانہ اور متغائر تھیں۔

کلیسائی نظام اور علم وادب کے درمیان کشمکش اور حکومت پر کلیسائی اقتدار کے چھا جانے نیز اس کے عہد اقتدار میں سائنسدانوں کی اذیت رسانی کی وجہ سے لادینیت نے جنم لیا، لادینیت کا پہلا نصب العین دین کے رول اور اس کے اثرات کی حد بندی کرنا ہے اور اسے ایک شخصی مسئلہ بنانا ہے جو چند عبادات اور دینی تقالید ورسوم کے علاوہ حکومت وسیاست اور اجتماعیت ومعاشرت میں بالکل دخیل نہ ہو یا اس سے خود اپنے کو الگ کرنا ہے۔

یورپ کے اثر سے عالم اسلام کے بڑے حصے میں سیکولر حکومتیں قائم ہوگئیں اور انھیں کافی مقبولیت وقوت حاصل ہوئی، اسی فلسفہ کی مدد سے یورپ دین کو نظام حکومت سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اور بعض حکومتیں تو براہ راست دین اور اہل دین کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئیں، کیونکہ انھیں وہ سیکولرزم کا دشمن خیال کرتی تھیں، اسی فکر کے نتیجے میں بہت سے علماء اسلام اسلامی ملکوں میں ابتلا وآزمائش اور دار ورسن کے روح فرسا مرحلے سے گذرے، یہ تکلیف دہ صورت حال تاہنوز قائم ہے۔

مسلم ملکوں میں سرکاری سطح پر لادینیت اختیار کرنے سے عیسائیت اور غیر اسلامی اور غیر دینی نظریات ورجحانات کو فروغ حاصل ہوا اور ایسے افکار و معتقدات کا رواج ہوا جو اسلامی فکر و روح سے متصادم تھے، اباحیت، الحاد، دہریت، نیچریت کا دور دورہ ہوا، ادباء اور اہل فن کھلے عام دین و اخلاق پر تنقید کرنے لگے اور اسے حریت فکر کا نام دیا، لیکن یہی ناقدین حکومت پر تنقید کرنے کی جرأت نہ کر سکے، اسلام کے بارے میں غیر جانبدارانہ ہونے کی وجہ سے مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا اور مسلمانوں کی طاقت و قوت اکثریت میں ہونے کے باوجود کم ہوئی، بعض حکام کے سر پر سیکولرازم کا بھوت کچھ اس طرح سوار ہوا کہ وہ لفظ ''اسلام'' کے استعمال سے بھی گریز کرنے لگے، اور ہر اس تحریک کو انھوں نے کچلنے کی کوشش کی جو اس کے نام سے معرض وجود میں آئی اور رہی سہی کسر ملک کے دستور اساسی سے اسلام کا نام خارج کر کے پوری کر دی گئی۔

سیکولرزم کو آج کل دین و اخلاق اور دین کے علمبرداروں اور اس کے داعیوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے، دینی رجحانات و خیالات کے حامل افراد کو روزگار کے مواقع سے محروم اور اہم سرکاری عہدوں اور حساس مراکز خصوصاً ذرائع ابلاغ، تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت کے میدانوں سے دور کیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں صرف انھیں افراد پر انحصار کیا جا رہا ہے جنھوں نے دینی تربیت و تعلیم سے بے گانہ حلقوں میں شعور کی آنکھ کھولی ہو، یا ان کی نشو و نما اور ذہنی و فکری تربیت، غیر اسلامی ماحول میں ہوئی ہو، یا وہ اس کے بارے میں معاندانہ رویہ اپناتے ہوں۔

بعض ملکوں میں اسلام دشمن عناصر کے اثرات میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے جو قوم و وطن کے لئے اپنے دل میں کوئی ہمدردانہ جذبہ نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی تڑپ ہے۔ ان کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ مسلم

اکثریت کے دینی رجحانات ونظریات کی سرکوبی کرنے اوران کے جذبات سے کھلواڑ کرنے سے باز نہیں آتے، مسلم ملکوں میں اسلامی شعائر اور مقامات مقدسہ کا مذاق اڑایا جارہا ہے اور اگر کوئی غیرت مند مسلمان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو اسے دہشت گردی رجعیت پرستی اصول پروری اور تشدد پسندی کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی تحریکوں پر پابندی لگائی جاتی ہے اور دوسری طرف اسلام کے خلاف تشدد استعمال کرنے والوں کو کھلی چھوٹ دی جاتی ہے، اپنے سامراجی مقصد کے حصول کے لیے اصولیت کا جو ہوّا کھڑا کیا گیا ہے یہ ممالک آنکھ بند کرکے اس کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن یہ صورت حال غیر فطری اور غیر منطقی ہے کیوں کہ ملک کے عوام کے جذبات کو زیادہ دنوں تک دبایا نہیں جاسکتا، اور وطنی اور قومی تقاضوں کو غیر ملکی مفاد کا تابع نہیں بنایا جاسکتا۔

حاکم کون اور محکوم کون؟ (☆)

کچھ عرصہ سے اصلاح پسند اخبارات، ریڈیو اور رسائل وجرائد میں عالمی ذرائع ابلاغ کے نئے وسائل زیر بحث ہیں خاص طور سے ڈش اینٹینا جو عالمی افکار وتصورات کو براہ راست نقل کرنے کے لئے جدید ترین وسیلہ ہے جس نے قومی اور وطنی ذرائع ابلاغ کو بے اثر بنادیا ہے اور جس سے ہر خاندان متاثر ہے، خصوصاً نوجوان اور نوخیز بچے جن کے اندر ہر سنی ہوئی اور دیکھی ہوئی چیز سے متاثر ہونے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، لیکن یہ تشویش ابھی بہت محدود ہے اور اس کی آواز کمزور، اس نظام کے نقصان دہ اثرات کو دیکھتے ہوئے یہ ردعمل بے اثر ہے، اس لئے کہ ابھی اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکا ہے۔

ڈش اینٹینا اس وقت عصری تہذیب وتمدن کا نشان سمجھا جارہا ہے اور فیشن کی طرح نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے، کوئی ایسا ترقی یافتہ علاقہ نہیں جہاں نہ پایا جاتا ہو، حد تو یہ ہے کہ مقامات مقدسہ بھی اس کی زد سے باہر نہیں، فلک بوس عمارتوں پر جدید تہذیب وتمدن کی علامت کے طور پر نصب کیا جاتا ہے۔ جس سے عالمی ذرائع ابلاغ کی رسائی عام ہوتی جارہی ہے، پروگراموں میں برابر اضافہ ہورہا ہے، اس کے مصارف کو کم کرنے کے لئے کرائے پر بھی ڈش اینٹینا اب دستیاب ہونے لگا ہے، اور دنیا کے مختلف ٹی وی چینلوں سے نشر ہونے والے پروگراموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے سہولیات مہیا کرکے وقت گذاری اور تعیش پسندی نیز حظ اندوزی کا یہ

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اپریل ۱۹۹۴ء۔

نیا نظام پھیل رہا ہے، ان پروگراموں کو دیکھنے کے لئے سینما ہالوں کی طرح جگہیں مخصوص کی جاتی ہیں، اور نہایت کم اجرت پر اس نظام سے استفادہ کو ممکن بنایا جاتا ہے جو لوگ انفرادی طور پر ڈش اینٹینا اپنے مکانوں پر نصب نہیں کر سکتے وہ اس سے لائن لے کر فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہی دراصل اس نظام کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے، یہ سہولیات اب شہروں کے علاوہ پچھڑے علاقوں اور پسماندہ دیہاتوں میں بھی فراہم کی جارہی ہیں۔

اس جدید نظام کے مضر اثرات صرف اخلاق وعقائد اور طرز زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ افکار ونظریات، اور سیاسی واجتماعی رجحانات ومیلانات بھی اس سے مسلسل متاثر ہورہے ہیں، اور آہستہ آہستہ یہ نظام مقامی ریڈیو اور دیگر تعلیمی وتربیتی ذرائع کا متبادل بنتا جارہا ہے اس کے دلکش پروگراموں سے تخلیقی صلاحیتوں اور پیداوار کے تناسب پر بھی اثرات مرتب ہونے لگے ہیں، اس سے نشر ہونے والے پروگرام صرف تفریحی نہیں ہوتے، بلکہ ان پروگراموں میں مغربی افکار وتصورات بھی شامل ہوتے ہیں، جن کا نوجوانوں کے ذہنوں پر گہرا اثر پڑتا ہے، اس نظام کے ساتھ ترقی پذیر ملکوں میں غیر ملکی عناصر چاہے وہ ماہرین کی شکل میں ہوں یا مزدوروں کی شکل میں مقامی تہذیب اور طریقۂ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہ عنصر ملک کی طبیعت ومزاج، اور تہذیب وتمدن اور رسم ورواج اور اقدار وروایات، نیز معتقدات ونظریات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ماضی میں یہی خارجی عناصر اجتماعی اور سیاسی خطرات کے باعث بنے، اور ملک کی سلامتی اور وحدت کو خطرہ لاحق ہوا، ملک کے مخلص دانشوروں اور ہمدردوں کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود حکومتوں کو ان خارجی عناصر کی طرف سے کوئی تشویش نہیں ہوئی بلکہ غیر ملکی عناصر کے اثرات میں نمایاں طور سے اضافہ ہوتا رہا، بعض اسلامی ملکوں میں غیر ملکی عناصر آہستہ آہستہ زندگی

کے بہت سے حساس مراکز پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگے ہیں ان عناصر اور مغربی ملکوں کی بعض تنظیموں کے درمیان جوان ماہرین اور کاریگروں کو سپلائی کر رہے ہیں گہرے روابط ہو جاتے ہیں، ان عناصر کو ان ملکوں کی بعض تنظیموں کی طرف سے ہدایت ملتی رہتی ہیں اور جو شعبے ان کی زیر نگرانی ہیں، مثلاً اقتصادیات، سیاسیات، تعلیم وتربیت اور ثقافت کلچر، ان میں وہ اوپر سے ملنے والے اشارات کی روشنی میں کام کرتے ہیں چنانچہ بہت سے مشرقی ملکوں کے طریقۂ کار اور جن ملکوں سے یہ عناصر تعلق رکھتے ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت میں ان عناصر کا کافی عمل دخل ہو گیا ہے، حتی کہ ان ملکوں میں بعض خطوں کے داخلی معاملات میں بھی یہ مغربی عناصر غیر معمولی حد تک دخل انداز ہو گئے ہیں۔

بعض اسلامی ملکوں میں ان عناصر کے اثر ورسوخ میں اس حد تک اضافہ ہو گیا ہے کہ انھوں نے بعض علاقے خاص کر لئے ہیں۔ جس میں ان کے عقائد اور ثقافت کے مطابق ان کی عبادت گاہیں اور تعلیمی مراکز ہیں، اس کے اندر ان کے ذاتی کارخانے، فیکٹریاں، کمپنیاں اور ورک شاپ ہیں جس میں دوسروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں، اور اگر خوش قسمتی سے کسی کو کام کرنے کی اجازت بھی مل گئی تو وہ اس ماحول میں بالکل غیر ملکی اور غریب الدیار مسافر کی طرح رہتا ہے۔

ماضی میں اسی طرح کی غیر ملکی کمپنیوں کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے برطانوی سامراج کو بہت سے مشرقی ملکوں میں دراندازہونے کا موقع مل گیا تھا، اور جو لوگ، ڈاکٹر، فنکار، اور ماہرین کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے، وہ حکمراں بن بیٹھے۔

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو اسلامی ملکوں میں تعلیم وتربیت، ذہن سازی ومردم گری اور ذہنی اثر اندازی کے غیر ملکی نظام نے حالات کو نہایت سنگین بنا رکھا ہے، کیونکہ کسی بھی ملک میں غیر ملکی فکری قیادت، اور غیر ملکی کاریگر وماہرین کے

دو عنصروں کا اخراج بہت جلد اصل شہریوں کے ہاتھوں سے زمام اقتدار غیر ملکی ہاتھوں میں پہونچا دیتا ہے۔

یہ مسئلہ کوئی محدود فروعی اور اخلاقی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بنیادی اور حساس مسئلہ ہے، جس کے اوپر کافی حد تک ملک کے انجام کار، اور اس کے مستقبل، نیز ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اس کی بقا کا انحصار ہوتا ہے ہماری فکری اور سیاسی قیادت نے اگر سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور نہیں کیا تو عنقریب ہماری قیادت خود اپنے ہی ملک میں غریب الدیار مسافر بن کر رہ جائے گی، اور اسے خود اپنے ہی دیش سے بے آبرو کر کے نکال دیا جائے گا بے اثر گردانا جائے گا اور اس کا بھی وہی عبرت ناک انجام ہوگا جو ان ملکوں کا ہوا جن کا رشتہ ماضی سے کٹ گیا تھا، اور ثقافتی اور جمہوری نیز نسلی حیثیت سے بالکل بدل گئے تھے۔ ایسی صورت حال میں جب کہ مغربی ذرائع ابلاغ کا اثر گھر گھر پہونچ رہا ہے ان کے نمائندے زندگی کے مختلف شعبوں میں اثر انداز ہو رہے ہیں۔

اہل مغرب نے مسلم حکمرانوں کو اسلامی اصول پرستی، اور مسلم اصول پروروں اور اس کے علمبرداروں کے تعاقب میں الجھا رکھا ہے، اور ان کو ہر شعبے سے نکالنے پر ان کو مجبور کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں سے وہ اپنے اثر ورسوخ کا دائرہ وسیع کر رہے ہیں، اور عالم اسلام کے بہت سے ملکوں میں عملی اعتبار سے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے، بعض ملکوں میں ایسی ہی صورت حال قائم ہوگئی ہے جو سامراجی عہد میں قائم تھی، جس میں اسلام اور مسلمانوں. اور اسلامی تہذیب وثقافت، اور اسلامی تعداد وروایات کے خاتمہ کے لئے ریشہ دوانیاں کی گئی، مغرب پرستی کو فروغ دیا گیا، لوگوں کی زبانوں پر تالے ڈالے گئے، اظہار رائے پر قدغن لگایا گیا، بالآخر غیرت مند شہریوں نے آزادی کی تحریک شروع کی، مجاہدوں کا خون پانی کی طرح بہا، تب کہیں جا کر ان

ملکوں نے آزادی حاصل کی، اس زمانے میں ایسے افراد موجود تھے جو نیکی اور بھلائی کی دعوت دیتے تھے، اچھی باتوں کا حکم دیتے تھے، بری باتوں سے روکتے تھے، اور اہل وطن کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتے تھے، اور لوگوں کو ہر ایسے عمل سے باز رکھتے تھے جس سے ملک کی عزت ووقار، اور اس کی شہرت وناموس داغدار ہو، لوگوں کے اقتدار وروایات اور معتقدات ونظریات کے تحفظ کی کوششیں کرتے تھے، ایسے افراد ملک کی سلامتی اور اس کی وحدت نیز اس کی قدیم تہذیبی خصوصیات کے بقا کی ضمانت تھے، اور جب سے یہ صالح عنصر کمزور پڑا ہے، ملک میں غیر ملکی عناصر کا خطرہ بڑھ گیا ہے، جو ملک کو غیر فطری سمت میں لے جارہے ہیں، اور اسے اس کی قدیم تہذیبی، خصوصیات اور رنگارنگی امتیازات سے الگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کررہے ہیں۔

ترقی پذیر ملکوں میں غیر ملکی عناصر چاہے وہ خادم اور خادمان کی شکل میں ہوں، یا ملازمین اور مشیر کی شکل میں ہوں، یا خارجی نظام ابلاغ وتربیت کی شکل میں ہوں۔ ان ملکوں کی ثقافتی، سیاسی اور نظریاتی سالمیت کے لئے خطرہ ہے۔ وہاں کے شہریوں کے معتقدات وروایات اس عنصر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں، ان عناصر کی سرگرمیوں کا انکشاف اکثر ہوتا رہتا ہے۔ صلیبی وصہیونی تنظیموں، نیز دیگر عالمی تنظیموں کے ذمہ دار افسران کو لکھے گئے خطوط سے جو اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، ان خطرات کا انداز ہوتا رہتا ہے۔

ان حالات کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو جو لوگ اصلاح پسند عناصر کے تعاقب میں لگے ہیں، اور ملکوں میں کام کرنے والے ایسے عناصر سے چشم پوشی کررہے ہیں، وہ یا تو سادہ لوح ہیں، یا وہ اپنے ملک کے بجائے دوسرے ملک کے نمک خوار ہیں یا حالات ان کے قابو سے باہر ہوچکے ہیں، اور ان کے اندر خطرات سے نبرد آزما ہونے کی بالکل صلاحیت نہیں، وہ تحریک وعمل کا ہر حوصلہ کھوچکے ہیں۔

اک عالم نو ہو رہا ہے پیدا؟ (☆)

عالمی بساط سیاست پر ایسی زبردست اور فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو اگر جاری رہیں تو مستقبل میں دنیا کا نقشہ موجودہ نقشے سے مختلف ہوگا، یہ تبدیلیاں اس بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ ایک نئی دنیا وجود میں آرہی ہے، جو موجودہ دنیا سے سیاسی، اقتصادی، اور اخلاقی لحاظ سے یکسر مختلف ہوگی۔

کچھ عرصہ پہلے دنیا تین نظاموں یا تین عالموں میں منقسم تھی، ایک وہ دنیا جس کی قیادت کی رسی اور زمام کار سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت تھی، دوسری دنیا میں اشتراکی نظام کی فرماں روائی وحکمرانی تھی، رہی تیسری دنیا تو یہ ان ترقی پذیر ممالک پر مشتمل تھی جو طویل عرصہ تک مغربی سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنی رہی، اور دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کے پنجۂ استبداد سے اس کو نجات ملی، اس کو اشتراکی دنیا کی ہمدردی حاصل تھی، لیکن اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے اصول وقوانین، اغراض ومقاصد میں غیر معمولی فرق کے نتیجہ میں دو بڑے عالموں کے درمیان مسلسل کشمکش جاری رہی۔

اس لیے ایسے حالات میں یہ تیسری دنیا مجبور تھی کہ وہ کسی ایک کا سہارا لے، لیکن چونکہ اس کا طبعی میلان اشتراکی دنیا کی طرف تھا، اس لئے اس نے محبت کا ہاتھ بڑھا کر اس کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرلیا، لیکن بعض ممالک اپنے مفادات کے لحاظ سے مغربی دنیا سے وابستہ تھے۔

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر جون ۱۹۹۴ء۔

یورپ کی استحصالی سیاست کی وجہ سے اشتراکیت کو ترقی پذیر ممالک میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا، اس کو اس لئے بھی فروغ حاصل ہوا کہ اشتراکیت نے یہ دلفریب نعرہ لگایا کہ وہ اقتصادی اور دفاعی اعتبار سے اس کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گی۔

لیکن افغانستان کی جنگ کے نتیجہ میں اشتراکی دنیا جس کی قیادت روس کر رہا تھا، زوال کا شکار ہوگئی، اور اس کی طاقت ٹوٹ کر مختلف چھوٹے چھوٹے ممالک میں بٹ گئی، اب ان ترقی پذیر ممالک ہی میں جن کو اشتراکیت نے اپنا گڈھ بنایا تھا، کہیں تو کلی طور پر اور کہیں جزئی طور پر اشتراکیت کا خاتمہ ہوگیا۔

زوال روس اور قصر اشتراکیت کے زمین بوس ہوجانے کے بعد اب صرف ایک ہی طاقت رہ گئی ہے، جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں تھی، ایسے وقت میں تیسری دنیا کے لئے یہ ناگزیر ہوا کہ وہ اس سے مصالحت کے لئے ہاتھ بڑھائے، اور اس کے ساتھ اپنے تعلق اور وفاداری کا اظہار کرے۔

مغربی ممالک کا مزاج ہے کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی سے برسر پیکار رہتے ہیں، اس لئے سقوط روس کے بعد ان کو ایک خلا محسوس ہوا، چنانچہ انھوں نے عالم اسلام کو اپنا حریف قرار دے کر اپنی توانائی اس کی مخالفت بلکہ اس سے ٹکراؤ پر صرف کرنی شروع کردی، عالم اسلام کے پاس نہ وہ مادی طاقت ہے، اور نہ وہ جاہ وسطوت اور نہ وہ ہتھیار واسلحہ جس سے امریکہ کے جنگی خزانے معمور ہیں، اور نہ روس کی طرح اس کے پاس زہریلے اور خطرناک اسلحے ہیں، جس کو ابھی کچھ عرصہ قبل سپر پاور کے ڈراؤنے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، یہ عالم ان ممالک کا ایک مجموعہ ہے، جن کو مغربی سامراج نے اپنے عہد سامراج میں خوب جور وستم کا تختۂ مشق بنایا، اور ان ممالک کے اندر ایسی حکومتوں کی بنیاد ڈالی، جو بظاہر عوام کی خیر خواہ وبہی خواہ، لیکن فی الحقیقت مغربی سامراج کے پھلنے پھولنے اور اس کے قوی وتوانا ہونے کا ذریعہ تھیں۔

اس وقت مغربی میڈیا نے اسلامی بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کر کے دنیا کے توازن عقلی کو مختل کر دیا ہے، اور وہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ سقوط اشتراکیت کے بعد اگر کوئی طاقت یورپ کے لئے خطرہ بن سکتی ہے تو صرف اسلامی بنیاد پرستی بلکہ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت ہے، اور یہ ایسی طاقت ہے، جس سے دیار یورپ کے ایوانہائے عیش وعشرت پر زد پڑتی ہے، جن کو وہ مغربی تمدن سے تعبیر کرتا ہے، جن کی بنیاد مذہب بیزاری، اخلاقی قیود، اور اعلیٰ قدروں سے آزادی اور مادیت اور خود غرضی اور استحصال پر قائم ہے، جس کی وجہ سے دنیا میں فساد پھیلا ہوا ہے۔

اپنے اس مادی اور انسان دشمن اور سامراجی ذہنیت کے حامل تمدن کی حفاظت کے لئے اس نے اسلامی ذہنیت کی شدت سے مخالفت شروع کر دی ہے اور ساری دنیا کو اس ذہنیت سے لڑنے کے لئے اکسانا شروع کر دیا ہے، اور اسی کے اشارے پر اسلامی اصولیت جو دراصل انسان کی اصلاح کی تحریک ہر ملک وقوم کے لئے خطرہ کا نشان بن گئی ہے، اور بہت سے قائدین بغیر حقیقت کو سمجھے اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

یورپ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے، اور اپنی اسلام دشمن صف آرائی سے اس نے اس کا مظاہرہ کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں ہیں، پہلی طاقت غیر اسلامی قوتوں کی ہے، جو اسلامی بنیاد پرستی کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرائی میں مشغول ہے، دوسری طاقت ان مسلم عوام کی ہے، جو جذبۂ اسلامی سے معمور ہیں، اور ان کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ اسلام کو اپنے دیار میں ایک عملی شکل میں جاری وساری دیکھیں، اس کے لئے وہ حکومتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی قانونی بالادستی کو تسلیم کریں۔

پہلی طاقت جس کا دائرہ مشرق ومغرب پر محیط ہے، اس کے پاس زہر آلود

ہتھیاروں کا اسٹاک ہے، میڈیا اس کا، سراغ رساں ایجنسیاں اس کی، بظاہر دنیا میں سب کچھ اسی کے لئے ہے۔

اس طاقت کے مقابلے میں دوسری طاقت وسائل کی کمی کا شکار، فقر وافلاس کا سایہ اس کے سر پر، اس کے بیشتر افراد کی قسمت میں زنداں کی کال کوٹھری، اور بعض ان میں ایسے بھی جو کاموں سے معطل، عہدوں سے عاری، اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اسلام کو اپنا دین قرار دیتے ہیں۔

لیکن حیرت ہے اس پر کہ دشمن اپنے لاؤ لشکر، کثرت تعداد کے باوجود سہما ہوا، ڈرا ہوا، فکر اس کی کہ کہیں مسلمانوں کی یہ بکھری ہوئی ومنتشر قوت اس کے وجود کے تصفیہ کا سبب نہ بن جائے، چنانچہ ان کی طاقت وقوت کے راز کو جاننے کے لئے کانفرنسیں بلائی جاتی ہیں، ان کی طاقت کو توڑنے کے لئے اقتصادی اور سیاسی وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، حکومتوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔

اسلام کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کو یورپ اپنے لئے پیام موت اور اشتراکیت سے زیادہ خطرناک تصور کرتا ہے، اس لئے آج وہ پوری دنیا کے اندر اسلامی بنیاد پرستی ودہشت گردی کا نام لے کر واویلا مچا رہا ہے کہ یہ اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت اس اشتراکی قوت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، جس کا وہ تجربہ کر چکا ہے، بلکہ اس نے اس کے قصر فلک بوس کو ریت کے ذرات میں تبدیل کر دیا ہے۔

لیکن فلسفۂ اشتراکی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اساس غیر طبعی اور غیر عملی تھی، اور اس کے نحیف وناتواں جسم میں اتنی قوت ہی کہاں تھی کہ وہ عوام کے مسائل کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوار سکتا، اس لئے اس فلسفہ کے علمبرداروں نے یہ محسوس کر لیا کہ اس ترقی یافتہ دور میں یہ غیر طبعی نظام اب زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا، چنانچہ یہ سب ایک ایک کر کے اس سے دست کش ہو گئے۔

اور دوسری بات جو زوال اشتراکیت کے بارے میں سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ افغانستان کی تاریخی جنگ سے اس کی عسکری قوت تباہ و برباد ہوگئی، اور اس کو بڑے تلخ تجربات ہوئے، اور اپنے ہاتھوں اپنے بنائے ہوئے محل عالی شان کو نالۂ وشیون کا مصداق بنادیا:۔

"یخربون بیوتھم بأیدیھم و أیدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار"

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ اس نظام کے سقوط سے یورپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ عسکری قوت اور مادی وسائل کے اندر اتنا دم خم نہیں ہے، کہ وہ کسی ملک کو گہوارۂ امن اور نمونہ جنت بنا سکے، جب تک کہ اس نظام اور قوت کے پاس صالح دستور حیات نہ ہو، جس کے آئینہ میں لوگ اپنی زندگی چین وسکون کے ساتھ بسر کرسکیں۔

یہ تاریخ کا ایک عجیب وغریب کرشمہ اور عجوبہ ہے کہ صلیبی یورپ نے اپنے فکر وخیال سے غذا فراہم کرکے اس نئی قوت کو پروان چڑھایا، اسی پر بس نہیں بلکہ یہ اپنے پروپیگنڈہ کے ذریعہ اس کو مزید قوت وتوانائی بخش رہا ہے، ''فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدواً وحزناً''

چنانچہ عالمی ذرائع ابلاغ، یورپی اخبارات اور قائدین یورپ، اسلام اور اسلامی تحریک اور اسلام کی نشر واشاعت کے بارے میں جو تھوڑی بہت کوشش ہورہی ہے اس کا ذکر اس کثرت وتواتر کے ساتھ کرتے ہیں کہ جس کا منطقی فائدہ یہ ہورہا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم سب یہ سمجھ گئے ہیں کہ مسلمان، مضبوط عزم اور قوت کے حامل ہیں، اور اسلام بہت تیزی کے ساتھ اپنے قدم جمارہا ہے۔

یورپی اخبارات میں کبھی کبھار ایسے مقالات اور رپورٹیں شائع ہوتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خود دیار یورپ میں اسلام کا غلغلہ بلند ہورہا ہے اور لوگوں کے

قلوب اس کی روشن وفروزاں قندیلوں سے منور ہورہے ہیں، سرزمین امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہورہا ہے، اور اگر یہی صورت حال رہی تو مسلمانوں کی تعداد یہودیوں کی تعداد سے بڑھ جائے گی، یہی حال سرزمین فرانس کا بھی ہے کہ وہاں اسلام کی طرف ایک رجحان عام پایا جارہا ہے، اس لئے وہاں کی حکومت اس رجحان عام سے خاصی مضطرب ہے، چنانچہ جرمنی کے صدر ''کول'' نے امریکی صدر بل کلنٹن سے گفتگو کے دوران کہا تھا کہ ''اسلام ایک بین الاقوامی خطرہ ہے، اس لئے اس سیلاب کو روکنے کے لئے متحدہ کوشش کی ضرورت ہے، اور ضرورت پڑے تو بھرپور کارروائی سے بھی دریغ نہ کیا جائے تاکہ اس سیل بلاخیز کو روکا جاسکے ورنہ سب کو یہ اپنے تھپیڑوں میں بہالے جائے گا''۔

اسلامی بیداری کی اس لہر سے اور اس کا بڑھ چڑھ کر پروپیگنڈہ کرنے سے مغرب کی بزمِ عیش ونشاط برہم ہورہی ہے، جس کی وجہ سے ان کے غم وغصہ کا یہ عالم ہے کہ ان کے آبرو باختہ نوجوان دنیا کے مختلف ملکوں میں، مساجد، اسلامی مدارس اور مسلمانوں کی تجارتی کمپنیوں کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کردینا چاہتے ہیں، جرمنی، فرانس، امریکہ اور دیگر ممالک میں مسلمان شہریوں کے خلاف اقدامات کئے جارہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس مہم سے مسلمانوں میں چاہے وہ کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں ایک وحدت کا احساس پیدا ہورہا ہے، جرمنی میں ترکوں کے خلاف، فرانس میں مراکش اور الجزائر کے عربوں کے خلاف، امریکہ میں سیاہ فام مسلمانوں کے خلاف، اتھیوپیا میں مسلمان چینیوں کے خلاف، جب ظلم اور جبر کا معاملہ کیا جائے گا، اور مغربی میڈیا مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو مزہ لے کر بیان کرے گا، تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ دنیا کے مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ پیدا ہو، اور ان کے دل میں اپنے ان بھائیوں سے ہمدردی کا احساس موجزن ہو، اور ان میں اس کا

احساس پیدا ہو کہ ان کو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ان مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اس طرح ایک عالمی اسلامی قوت پیدا ہوگی، اور عالمی وحدت قائم ہوگی، اور نئی طاقت وجود میں آئے گی، یہ انسانی فطرت ہے کہ مظلوم مظلوم کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے، اور مظلوم کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ دنیا خدا کی بنائی ہوئی ہے، اور خدا کی سنت ہے کہ ظالم کو زیادہ مدت تک ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔

یورپ کو صلیبی ذہنیت سے ابھی تک آزادی نہیں ملی (☆)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ایسے قدیم موضوع کو جس کی خوب چھان بین کی گئی ہو، اور اس کے اسرار و رموز کو جاننے کے لئے بے دریغ مال خرچ کیا گیا ہو، اس کی تحقیق و تدقیق کے بہتر سے بہتر طریقے اختیار کئے گئے ہوں، بار بار کریدنے اور چھیڑنے سے اس کی اصلیت مجروح ہو جاتی ہے، اور پھر لوگوں کے ذہنوں میں اس کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات سر اٹھانے لگتے ہیں۔

بعینہٖ یہی حال واقعات زندگی و حوادث کا ہے کہ جب ان کا وقوع زیادہ سے زیادہ ہونے لگتا ہے تو لوگوں کے اندر اس کو جھیل لینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور مشکلیں آسان معلوم ہونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ کوئی مجرم جس کا جرم خواہ جتنا ہی شنیع کیوں نہ ہو، جب اس کی بہت زیادہ مذمت کی جاتی ہے، اور اس کو سزا دینے میں تشدد سے کام لیا جاتا ہے، تو طبعی طور پر لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے محبت و رحمت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں بہت سے باضمیر انسان اس کی نصرت اور دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

یہی قصہ جھوٹ و افترا پردازی اور غلط بیانیوں کا ہے کہ ان کی شناعت اور قباحت پر سب کا اتفاق ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ضمیر خواہ کتنا ہی مر چکا

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اگست ۱۹۹۴ء۔

ہو، اور وہ گناہوں کے خواہ کتنے ہی خوگر ہو گئے ہوں اور کذب وافترا، مکر وفریب کے ساتھ وہ کتنا ہی نرم گوشہ رکھتے ہوں لیکن جب معاشرہ کے اندر کوئی بھی انسان جھوٹ افترا پردازی اور جعل سازی، مکر وفریب میں حد سے گزرنے لگتا ہے تو ایسے لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کے اس عمل پر نکیر کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ اور وسائل نشر واشاعت نے اتنی ترقی کی ہے، اور اس کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ دنیا کا ہر گوشہ اس پر عیاں ہے اور ہر گوشہ میں اس کی پہونچ ہے، وہ جس واقعہ کو چاہے اس کا واقعی منظر پیش کر سکتا ہے، اور جس پر پردہ ڈالنا چاہے، وہ کتنا ہی اہم ہو پوشیدہ رہ جاتا ہے، لیکن اپنی اس وسعت اور ترقی کے باوجود بھی وہ عالم اسلامی اور مسلمانوں کی تصویر کشی میں اپنے ان پرانے خطوط پر قائم ہے، جن کو صدیوں پہلے اسلام دشمن طاقتوں نے تیار کیا تھا۔

چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کی نسبت اس کے خزانۂ خیال میں سوائے برائیوں کے اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی، جب کہ ان ذرائع کے اجارہ داروں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سیکولرزم، آزادی رائے اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے علمبردار ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ واقعے کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ ان کے عملی کردار سے وہی قدیم صلیبی ذہنیت اور اسلام دشمنی اور مغرب کی بربری تصویر کی جھلک ظاہر ہوتی ہے، مسلمانوں پر یہ الزام ہے کہ یہ غور وفکر اور تدبر کے بجائے جذباتیت پر عامل ہیں، دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کو تسلیم نہیں کرتے لیکن جو لوگ مسلمانوں کو یہ الزام دیتے ہیں وہ خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں، اور اپنا محاسبہ کریں کہ وہ خود کتنی سمجھ بوجھ کے مالک ہیں اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کی حقیقت سے کتنے آگاہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ یا تو مسلمانوں کے متعلق کچھ جانتے نہیں یا وہ حقیقت حال کو سمجھنے سے قاصر ہیں، یا تو

اپنی سامراجی قوت اور ذرائع ابلاغ پر زیادہ اعتماد کر کے حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔

اور وہ اقلیت واکثریت اور طاقت اور کمزوری کے پرانے تصورات پر قائم ہیں، وہ مسلمانوں کے جذبات، ان کے احساسات اور ان کے اقدار ومقدسات کو اب اسی سامراجی ذہنیت سے دیکھتے ہیں، اسی طرح بلندی سے اور قوت کی زبان سے خطاب کرتے ہیں، جس طرح ۵۰ رسال پہلے خطاب کرتے تھے، اور اسی نادانی یا تجاہل عارفانہ کا شاخسانہ ہے کہ اسلامی مقدسات ان کے زہرناک خنجر سے زخمی ہوتے رہتے ہیں، اور اس پر جب مسلمان اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی غیرت بھڑکتی ہے تو ذرائع ابلاغ کے اجارہ داروں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں، ان کو خاموشی سے اپنی ذلت برداشت کرنی چاہئے، ان کو تعجب ہوتا ہے کہ اچھا یہ مسلمان جو ہمارے محکوم تھے اور اب بھی اقتصادی اور سیاسی اور تعلیمی میدان میں ہمارے محتاج ہیں، اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اسی لئے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ''جب بھی کوئی بے ضمیر شخص اپنی شہرت یا مادی مفادات کے لئے اسلام کے خلاف کوئی ایسی بات کہتا ہے جو دشمنان اسلام کے فکر وخیال سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو اسکو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو خاموش رہنے بلکہ اس کے پراگندہ خیالات کو قبول کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، اور اس کے ان خیالات کو اکتشاف کا درجہ دے کر ان کی عالمگیر پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہے، اور اس کو دنیا کا اتنا بڑا ہیرو قرار دیا جاتا ہیکہ اس کے آگے عالمی فٹ بال کپ کا ہیرو بے وزن معلوم ہونے لگتا ہے، اور ذرائع ابلاغ کے دروازے اس کی حفاظت کے لئے اور اس کے دفاع کے لئے کھل جاتے ہیں، اور اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو اس کو قدامت پسند، تنگ نظر قرار دیا جاتا ہے''۔

قرآن مجید اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتوں کے حقوق کو جتنا

اجاگر کیا گیا ہے، کسی اور مذہب میں ان حقوق کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی ہے اس موضوع پر بے شمار کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، مختلف زمانوں میں یہ مسئلہ زیر بحث رہ چکا ہے لیکن آج بھی اس مسئلہ کے بارے میں دنیا کے کسی حصہ میں اگر کہیں کوئی شگوفہ چھوڑا جاتا ہے تو یہ مسئلہ میڈیا کی دلچسپی کا موضوع بن جاتا ہے اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت اگر مظلوم ہے تو صرف مسلم سماج میں۔

قرآن وسنت، تاریخ اسلامی اور مسلمانوں کو ہدف بنا کر طرح طرح کے بے سروپا الزامات عاید کئے جاتے ہیں، اسی دوران دوسرے سماج میں عورتوں پر کتنا ہی ظلم ہو، وہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اسی طرح اگر کہیں مسلمان زوجین میں کوئی ناخوشگوار بات پیش آجاتی ہے تو میڈیا اس کو لے اڑتا ہے اور غیر اسلامی افکار کے حامل اہل قلم اپنی قلمی توانائیاں صرف کرنے لگتے ہیں، اور بغیر کسی رعایت وپاسداری کے مسلمانوں کے مقدسات پر اُن کے قلمی توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں اور مغرب ومشرق کی ساری زیادتیاں، بے حیائیاں اور عورتوں کے استحصال کے واقعات اور زوجین کی کشمکش کی داستانیں خیالی معلوم ہونے لگتی ہیں، اس طرح کے جارحانہ ویکطرفہ معاندانہ اقدامات سے مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا طبعی بات ہے، اور فطری طور پر ان کے اندر اس کے نتیجہ میں ردعمل پیدا ہوتا ہے، لیکن اس ردعمل کے ذمہ دار مسلمان نہیں ہیں، بلکہ وہ غیر منصف اہل قلم ہیں جو اپنے جارحانہ رشحات قلم سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہونچاتے رہتے ہیں۔

تعجب ہے کہ اس کے باوجود بھی موجودہ تہذیب کو یہ دعویٰ ہے کہ اس کی بنیاد انسانیت نوازی، بقائے باہم، صلح وآشتی، آزادی رائے، اور عقیدہ وعمل کی آزادی پر ہے، جس کی رُو سے ہر انسان کو یہ استحقاق ہے کہ وہ اپنی زندگی گذارنے کے لیے جو طریقہ چاہے اختیار کرے، ایک طرف اسکا یہ دعویٰ ہے، دوسری طرف اسی تہذیب نو

کے علمبردار ارمغربی میڈیا مسلم ملکوں کی اکثریت کے جذبات کو کچلنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور انہیں کے ملکوں میں ایسے نظام اور قوانین کے نفاذ کے خواہاں رہتے ہیں جو مسلمانوں کے دینی میلانات ورجحانات سے بالکل میل نہیں کھاتے اور اگر مسلمان اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں تو اس کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مغربی میڈیا و مغربی حکومتیں اپنی تابعدار حکومتوں کو مشورہ دیتی ہیں کہ ان مسلم عوام کو سختی سے کچل دیا جائے۔

بین الاقوامی اور عالمی ذرائع ابلاغ کے اسلام کے ساتھ اس معاندانہ رویہ سے مسلمانوں کی دینی غیرت بھڑکتی ہے کیونکہ وہ اپنے دین کو سب سے بہتر دین تصور کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ امت محمدیہ خیر امت ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کے اندر عدل وانصاف قائم کرے، فساد وبگاڑ کو مٹائے اور انسانوں کو غلامی کی زندگی سے نجات دلا کر امن وچین کی زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہونچائے، اس کا ایمان ہے کہ اس امت کو شاہد اور گواہ بنایا گیا ہے اور اس کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی ہے۔

موجودہ ذرائع ابلاغ عالمی مسائل کے بارے میں دوغلی پالیسی اختیار کرتا ہے، اور اس کا یہ دوغلا پن اور دورخی پالیسی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے اندر عیسائی مشنریوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ یہ مشنریاں اسلامی ممالک کی رگوں میں بھی داخل ہونے کی کوشش کررہی ہیں، ان کو متعدد مسلم ملکوں میں اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی اجازت بھی حاصل ہوگئی ہے۔ بنگلادیش، انڈونیشیا، ملیشیا اور متعدد ایشیائی افریقی مسلم ممالک میں حتی کہ عرب ملکوں میں ان کا مشن زور پکڑتا جارہا ہے، مغربی ممالک جو سیکولرازم کے دعویدار ہیں ان کی پوری مدد کرتے ہیں، سرمایہ اور وسائل فراہم کرتے ہیں، وہاں کے سرکاری دفاتر اور تعلیمی شعبوں

میں ان کو اچھا خاصا رسوخ حاصل ہے، ان کو طرح طرح کی مراعات وسہولیتیں فراہم کی جاتی ہیں تا کہ یہ کلی طور پر ان ممالک میں اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔

چنانچہ یہ عیسائی مبلغین کھلم کھلا اپنی کوششوں کے ثمر آور ہونے کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں علاقہ میں اتنے لوگوں کو شکار کرلیا، اور اتنی مدت میں اس علاقہ کے لوگوں کو دائرہ عیسائیت میں کرلیں گے، ان کی جرأت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری کوشش ہے کہ ہم مصر وترکی اور شام کے مسلمانوں کو جو کہ اکثریت میں ہیں اقلیتی فرقے میں تبدیل کردیں، یہ عیسائی مشنریاں جزیرۂ عرب میں بھی دراندازہونے کے لئے اب کوشاں ہیں، چنانچہ یورپین ممالک کے دباؤ سے خلیج عربی کے بعض ممالک میں گرجا گھروں کی تعمیر کی اجازت بھی دیدی گئی ہے۔

بعض اسلامی تنظیموں کے بیان کے مطابق ان عیسائی مشنریوں کا متشددانہ رویہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ممتاز اسلامی شخصیات کو یہ دھوکے سے قتل کرادیتی ہیں، اس کی دسیوں مثالیں موجود ہیں، یا ان کے دامن کو ایسے مسائل سے الجھا دیتی ہیں کہ ان کی شہرت کو بٹہ لگے، یا پھر ان کو نذر زنداں کردیا جاتا ہے، چنانچہ ہزاروں بے گناہ مسلمان قید وبند کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ بعض اسلامی شخصیات پر اظہار رائے اور اسلامی ممالک میں سفر کرنے پر بھی پابندی ہے۔ نیز ایسے مسلم ممالک بھی ہیں، جہاں اسلام پسند گروپوں کو انتخاب میں نمایاں کامیابی حاصل ہونے کے باوجود ان کو اس ڈر سے حوالہ زنداں کردیا گیا کہ کہیں یہ اسلامی انقلاب نہ برپا کردیں، اور اس کے لئے مغربی ممالک پوری طاقت وتوانائی صرف کررہے ہیں مغربی ملکوں کے دباؤ سے اسلامی ذہن رکھنے والے خود اسلامی ملکوں میں قید وبند کی تکلیفیں برداشت کررہے ہیں۔

یہ ایسے واضح اور نمایاں مسائل ہیں جو کسی بھی صاحب دانش وبینش سے مخفی نہیں ہیں، لیکن حیرت ہے کہ اب تک عالمی میڈیا پر یہ مسائل مخفی ہیں یا وہ جان بوجھ کر

اس کے بارے میں رائے زنی کو آزادیٔ رائے و آزادیٔ عقیدہ کے خلاف سمجھتا ہے، یا بر بنائے مصلحت ان مسائل سے چشم پوشی کرتا ہے، میڈیا کا یہ دورخا پن نہیں ہے تو اور کیا ہے؟، اگر کوئی اسلام کے خلاف کوئی بات کہے تو اس کو دنیا کا چمپین و ہیرو قرار دیا جائے، اور یہ کہہ کر اس کی حمایت کی جائے کہ اس کو اظہار رائے کی پوری آزادی ملنی چاہئے، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرے یا اسلامی مظاہر کی پیروی کی کوشش کرے مغرب کی مادی تہذیب کی شناعت کو بیان کرے تو اسکی مذمت کی جائے، اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے، اس کے لئے طرح طرح کی دردناک سزائیں تجویز کی جائیں، اس کی آزادی پر قدغن لگایا جائے، عالمی میڈیا کی یہ ایسی دوغلا پالیسی ہے کہ موجودہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کیا آزادی نام ہے فطرت سلیم سے بغاوت کا؟ (☆)

انسانوں کی فطرتیں مختلف النوع اور گوناگوں اوصاف کی حامل ہوا کرتی ہیں اور کارزارِ حیات میں درپیش مسائل کے تئیں ان کے طریقہ کار اور لائحہ عمل میں بھی فرق ہوتا ہے، چنانچہ کچھ افراد تو ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر فکر وتدبر، بصیرت وآگہی اور اسباب ومحرکات کی تہ تک پہونچنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو دوسروں کے حالات وکوائف سے درس عبرت لے کر اپنی اصلاح کرتے ہیں، جو فلاح ابدی اور خیر سرمدی کی راہوں کی جانب رہنمائی کرتے اور دعوت دینے والوں کو احترام واکرام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور جو اپنے فکر سلیم اور عمل صالح سے دوسروں کو بھی فائدہ پہونچاتے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی فطرت میں بغض وعداوت، ناپسندیدگی ونفرت، بدگمانی وغلط فہمی اور ایذا رسانی وریشہ دوانی کے جراثیم پل رہے ہوتے ہیں۔ بنابریں وہ شر وفساد اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے راستوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں مکر وفریب اور دغابازی وریاکاری کے وسائل وذرائع استعمال کرتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات وہیجان انگیز جذبات کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں انھیں صرف اپنی ہی پڑی رہتی ہیں۔ وہ اپنے افعال واعمال کے نتائج اور دوسروں کے گم گشتہ راہ ہونے کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اگر ان کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوجاتی ہے جو انھیں خیر کی دعوت دیتا اور شر وفساد سے روکتا ہے تو وہ خود اسے ہی اس کے راستے سے دور کردینے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو یا اس کی

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اپریل ۱۹۹۵ء۔

ذلت ورسوائی اور تذلیل وتحقیر کی غرض سے اس پر الزامات لگانے کی کوشش کرتے ہیں یا اس کو اپنے فریضے کی ادائیگی سے غافل کرنے کے لئے چالیں چلتے ہیں۔

طبائع کا یہ اختلاف عمومی طور پر پایا جاتا ہے جس کا ہم مختلف طبقوں اور قوموں میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جس کے اثرات ہمیں روزآنہ کی زندگی میں انفرادی اور جماعتی دونوں پیمانے پر دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ دراصل یہ جماعتیں اور معاشرے افراد ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

تاریخ انسانی کا کوئی بھی دور سرکشی وطغیانی، ضلالت وبغاوت اور شرانگیزی وشعلہ آفرینی کی قوتوں سے خالی نہیں رہا۔ اسی طرح ہر عہد میں چند ایسے مخلص وخداترس اور داعی الی الخیر مردانِ کار بھی موجود رہے جنھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا اور جن کی ہستیاں بندگانِ خدا کی ہدایت کا باعث بنیں، اسی طرح ایسے افراد بھی ملتے ہیں جن کو اپنے اعمال وکردار کے برے نتائج کا مشاہدہ کرنے کے بعد حقیقت کا ادراک ہوا۔ ایک قسم ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جس پر کسی سرزنش وتنبیہ کا یا نتائج کے خراب ہونے کا اثر مرتب نہیں ہوتا کیونکہ ان کی طبیعت ہی خودسری وہٹ دھرمی، انکار وسرکشی، تخریب وہلاکت انگیزی اور بدگمانی وذہنی فساد کے اجزاء سے مرکب ہوتی ہے، اور فساد ان کی سرشت اور فطرت بن جاتا ہے، بنی نوع انسان کی اسی قسم کی مانند کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنا نقصان کرتے ہیں؛ بلکہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بھی تخریب وہلاکت بربادی اور ضلالت کی راہوں پر لگادیتے ہیں اور پھر اس کے بعد نہ تو کوئی روکنے والا انھیں روک سکتا ہے، نہ ہی کوئی طاقت ان کو ایذا رسانی سے باز رکھ سکتی ہے اور نہ ہی عقاب وعتاب اور تنبیہات وہدایات ان کے حق میں نافع ہوسکتی ہیں، ایسے ہی افراد کے لئے انھیں تخریب کاری سے باز رکھنے، معاشرے کو ان کے ہمسر وہم مثل افراد سے پاک کرنے اور عوام الناس کی زندگی کو ان کی فتنہ پردازیوں وچیرہ دستیوں سے محفوظ ومامون رکھنے کے لئے سخت ترین سزائیں تجویز کرنی پڑتی ہیں یا معاشرہ کو ان سے پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

طبائع کے اس اختلاف کے پیش نظر اصلاح کے طریقے بھی معاشرتی ماحول ومزاج کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ دعوت اور اصلاح کا کام نصیحت اور خیر خواہی کے جذبہ سے شروع ہوتا ہے اور جملہ اصلاحی تحریکات بھی خواہ وہ دینی ہوں اجتماعی ہوں یا اخلاقی ہوں اسی مرکز ومحور پر گھومتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جملہ ادیان عالم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدا دعوت واصلاح سے ہوئی، داعیان خیر اور مصلحین قوم نے آلام ومصائب برداشت کیے، تکالیف وشدائد کا مقابلہ کیا اور راہ حق وصداقت میں لاتعداد افراد کو اذیتیں برداشت کرنی پڑی، اس منہج ولائحہ عمل کی وضاحت کے لیے قرآن کریم نے ان انبیاء کرام اور مومنین صالحین کے واقعات کو یکے بعد دیگرے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے جن کی دعوت پر کچھ افراد نے تو لبیک کہا اور سعادت دنیوی واخروی سے سرفراز ہوئے، لیکن کچھ نے انکار کیا اور بعد میں اس دعوت کو قبول کیا، اور بعض جو انکار پر قائم رہے وہ دردناک وعبرتناک عذاب کے مستحق قرار پائے۔

اصلاح کی کوشش اس کی نوعیت جو بھی ہو، درحقیقت کانٹوں بھری راہ ہے جو جُہد پیہم، صبر وتحمل اور قربانی کی متقاضی ہے، جہاں تک تخریب کاری وضرر رسانی کا تعلق ہے، بعض طبقوں کے لیے پرکشش اور نفع بخش کام ہے، اس لیے سرعت کے ساتھ ان لوگوں میں مقبول ہوجاتا ہے جن کی فطرت ایسی سرگرمیوں کے مطابق ہوتی ہے ان کو تخریب کاری کے اس عمل میں کسی قسم کی تلقین ودعوت کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ شر پسند مزاج اس کو خود بخود قبول کرلیتے ہیں اور اس میں طبیعت پر کوئی دباؤ یا کسی قربانی کی ضرورت نہیں پڑتی، بلندی سے پستی کی طرف آنا آسان کام ہے لیکن اوپر چڑھنا مشکل اور پرمشقت ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف عالی حوصلہ، بلند ہمت اور اولوالعزم لوگ ہی اصلاح کے متحمل ہوتے ہیں۔

اس وقت بھی عالم انسانیت شرانگیزی تخریب کاری وفساد پروری اور خیر وصلاح نیز خداترسی کی جانب رہنمائی کرنے والی دو متضاد قوتوں میں بٹا ہوا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مادہ پرست اور مکارم اخلاق واقدار انسانی کا مخالف مغرب انسانیت کے بگاڑ کی راہ پر گامزن ہے، وہ اپنے من پسند ومحبوب طریقہائے حیات کی نشر واشاعت کی غرض سے قیادت وتربیت، ابلاغ وخبر رسانی اور تشکیل ذہنی کے لیے ایسے اشخاص کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے افکار ومطمع نظر اور تہذیب وتمدن کی درگاہ کے مرید ہوتے ہیں، مغرب نہ صرف یہ کہ ہر اس نظام کو لائق نفرت وحقارت اور قابل ضیاع وہلاکت تصور کرتا ہے جو اسکی فکر کے منافی وغیر موافق ہوتے ہیں؛ بلکہ انسانوں کو تخریب کاری وخدا بیزاری کی تربیت دینے کے لیے مختلف مراکز کا قیام بھی عمل میں لاتا ہے، تخریب کاروں کو تعاون عطا کرتا ہے بھلے اور نیک کاموں کا خاتمہ کرتا ہے، اصلاح پسند داعیان خیر وصلاح کو رسوا یا برباد کرنا چاہتا ہے اور انسانیت کی فوز وفلاح کے لیے سعی پیہم کرنے والے نفوس قدسیہ کو میدان سے ہٹانا چاہتا ہے۔

ماضی میں تربیت وتزکیۂ نفس، جہالت کے ازالہ اور اخلاقی امراض کے مقابلے کے لیے مختلف مراکز ومدارس قائم تھے جہاں لوگ اپنے حالات وکوائف کی اصلاح ودرستگی کے لئے آیا کرتے تھے عصر حاضر میں ایسے مرکز اور ادارے اور تعلیم گاہیں پائی جاتی ہیں جو اخلاقی انارکی کا درس دیتی ہیں اور ہلاکت وضلالت کے وسائل اختیار کرنے کا فن سکھاتی ہیں۔ زمانۂ ماضی میں خیر وصلاح کے مراکز پائے جاتے تھے جن کے منتظمین وکارکنان اپنے معاشرے میں عزت ووقار کی زندگی گذارتے تھے، ان کے اندر صبر وثبات، تکالیف کے تحمل اور جان کی قربانی پیش کردینے کی صفات پائی جاتی تھیں نہ تو وہ مال ودولت اور زر کے حریص وطلبگار تھے نہ ہی کسی قسم کی کوئی دھمکی ان کے لئے باعث خوف ودہشت بن سکتی تھی اور نہ ہی نفسانی خواہشات انھیں اپنی جانب مائل کرسکتی تھیں، ان کی ہستیاں کسی درخشندہ وضیا بار منارے کا سا سماں پیش کرتی تھیں جن سے مخالفین حق وصداقت اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ ہدایت نصیب ہوتی تھی جنھیں

حکومتیں اور صاحبان اقتدار و تسلط بھی توقیر و تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے اور جنھیں نہ صرف عوامی مقبولیت حاصل تھی بلکہ عوام و خواص دونوں ہی میں ان کو عزت و وقار حاصل تھا۔

صلاح و تقویٰ اور اصلاح و رہنمائی کا عمل عصر حاضر میں ایک جرم اور اس کے عاملین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کو پہلے قدامت پرست اور پاکباز کہا جاتا تھا، اب ان کو دہشت گرد اور تمدن و انسانیت کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ وہ جرم عظیم جو چوری و ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری کے مقابلے میں کہیں زیادہ بدترین اور بھیانک ہے۔ قاتل ڈاکو اور چور آزاد و خود مختار ہو گئے ہیں، ان کی کارگذاریاں اس زمانے میں فن اور زیرکی و دور بینی کی علامت تصور کی جاتی ہیں اس فن کا ماہر اور باصلاحیت شخص ہیرو اور شہ زور بن گیا ہے۔ اسے اپنے معاشرے میں ایک ممتاز اور قابل لحاظ مقام حاصل ہے، قیادت و سیادت کے لئے لوگ اسی کا انتخاب کرتے ہیں اور اسے بلند ترین مراتب تک پہنچاتے ہیں جو کذب و دروغ بیانی میں حاذق و کامل ہوتا ہے وہی میدان سیاست میں زیادہ پختہ کار اور ماہر ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ ترین سیاسی مراتب و مناصب تک پہنچنے کا زیادہ حقدار قرار پاتا ہے، اسی طرح جو سفاک و بے رحم اور سنگ دل ہوتا ہے وہ عنان حکومت سنبھالنے کا زیادہ سزاوار سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ واحد ہستی ہوتی ہے جو روحانی تسخیر، ذہنی استیلاء و غلبہ اور قیام امن پر قدرت رکھتی ہے۔

ماضی میں جنگیں ہوتی تھیں، ان جنگوں میں کبھی تو وہ فریق فتحیاب و کامیاب رہتا جو زیادہ ہوتا اور جس کے پاس سامان جنگ اور آلات حرب و ضرب کی بہتات ہوتی اور کبھی ضعیف کو اپنی ایمانی قوت، خودداری و خوداعتمادی، جواں مردی و دلیری اور برتر و ممتاز شہسواری کی بدولت قوی پر کامرانی سرفرازی حاصل ہوتی، چنانچہ نہ جانے ایسی کتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جن کو اذن خداوندی اور حکم الٰہی سے بڑی بڑی جماعتوں پر غلبہ و تفوق حاصل ہوا۔

فسطائی طاقتوں کی تعبیر کے مطابق ''اسلامی بنیاد پرستی'' کے خلاف لڑی جانے والی جنگ درحقیقت ایک قدیم اور تقلیدی جنگ ہے لیکن اس نے اس دور میں ایک نئی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ یورپ نے اسلام سے اعلانیہ جنگ کی اور اسے منھ کی کھانی پڑی کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ وہ کالجیز اور یونیورسٹیاں جن کو اس نے لوگوں کی سرشت ومزاج میں تبدیلی پیدا کرنے، ان کو اپنی اقدار وروایات سے دور وبیزار کرنے اور دل ودماغ میں شر وفساد کی تخم ریزی کی غرض سے قائم کیا تھا۔ اب اسلامی دعوت کا مرکز ومنبع اور اسلامی تحریک کا سرچشمہ بن گئی ہیں۔ نیز یہ کہ موجودہ دور میں اسلام کی فعال وسرگرم قیادتیں انھیں مراکز کے فارغین سے وجود میں آرہی ہیں جن پر یورپ کو اعتماد تھا کہ یہ اسلام کے تئیں دشمنی وعداوت اور اجنبیت کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ آزادی اور بیداری کی تحریکوں کی قیادت مغربی تعلیم گاہوں میں پروان چڑھنے والے افراد ہی نے کی، موجودہ اسلامی تحریکوں کی قیادت میں ایسے لوگ نمایاں ہیں، یورپ کو ذہن سازی کی طویل مہم کے بعد احساس ہوا کہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہورہے ہیں۔ دانشمندان جہاں اور فلاسفۂ عالم میں اسلام کے تئیں اعتماد اور اطمینان پیدا ہورہا ہے اور اسلام وشیدائیان اسلام کے متعلق استشراق ومسیحی تبلیغ کی افترا پردازیاں اور ہرزہ سرائیاں تہہ بہ تہہ بادلوں کی مانند چھٹنا اور منتشر ہونا شروع ہوگئی ہیں، مغرب نے جہاد، سرفروشی اور آزادی کی ان تحریکوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے جن میں عاشقان اسلام نے شجاعت وبے خوفی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اپنے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی اور اپنی جڑیں مضبوط کیں، مغربی قائدین کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہوا کہ ان کا معاشرہ، انتشار وخلفشار، گمراہی وپراگندہ خیالی اور انحطاط اور زوال سے دوچار ہے، مال وزر کی چاہت اور اتباع نفس نے موت سے نفرت؛ بلکہ کلفتوں اور مشقتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ختم کردی ہے، چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر مغرب کو خود اپنا اور اپنی تہذیب وثقافت کا وجود نیز اپنے ممالک کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی۔

مغرب نے لوگوں کو محض مبتلائے فریب ودغا رکھنے کی غرض سے دہشت پسندی اور بنیاد پرستی جیسے ناموں سے اسلام سے جنگ کا منصوبہ تیار کیا، وہ اس کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اسلام سے برسر پیکار نہیں ہے بلکہ دراصل وہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کے خلاف محاذ آرا ہے، لیکن یہ فریب اس وقت کھل جاتا ہے جب وہ اس کی تشریح کرتا ہے مغرب کے اشاعتی اداروں سے شائع شدہ کتابوں کی ''اسلامی بنیاد پرستی'' کی تشریح سے روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی اصل لڑائی خیر اور صلاح کی دعوت سے ہے۔ ایک امریکی شارح نے ''بنیاد پرستی'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل غیر مادی بنیاد پر خیر وشر کے درمیان تمیز وتفریق کا نام ''بنیاد پرستی'' ہے۔ ایک دوسرے صاحب یوں رقمطراز ہیں کہ آخرت پر ایمان رکھنا اور آخرت کے لئے عمل کرنا ہی درحقیقت ''بنیاد پرستی'' ہے، بعض شارحین واصحاب قلم کے نزدیک نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دینی شعائر کی پیروی بھی بنیاد پرستی میں داخل ہے، مختصر یہ کہ بنیاد پرستی کے اسرار ورموز کی فہرست کافی طویل ہے جس میں خواہشات وجذبات یا مادی اغراض ومقاصد کے اتباع کے علاوہ ہر وہ عمل شامل ہے جس سے عامل کا مقصود خوشنودیٔ ربانی کا حصول ہو جو امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر کا مصداق ہو اور صاحبانِ فضل وشرف کی نگاہوں میں محبوب وہر دلعزیز ہو۔

ان تشریحات وتوضیحات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کی جنگ درحقیقت انسانیت کے خیر وصلاح اور سعادت وکامرانی کے عمل نیز اس میدان کارزار میں سرگرم نفوس کے خلاف محاذ آرائی وخنجر آزمائی اور صف بندی سے عبارت ہے۔

دہشت گردی کا معلم کون ہے؟ (☆)

بین الاقوامی میگزین ''اکنامسٹ'' ایک کثیر الاشاعت رسالہ ہے جو پوری دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی صورت حال سے متعلق مضامین اور رپورٹوں پر مشتمل ہوتا ہے، انہی مسائل میں وہ مسئلہ بھی شامل ہے جسے مغربی میڈیا ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا نام دیتا ہے، چند ماہ پہلے اس مجلّہ نے اسلامی بیداری کے متعلق نظریات وخیالات اور اس پر یورپ کے ردعمل کے موضوع پر مقالات کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا، ان تجزیاتی مضامین میں جہاں اسلامی بیداری میں اضافہ اور اس کے ایک جدید قوت ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے، وہیں اس کے سد باب کرنے اور یورپ کے لیے اس سے پیدا شدہ خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مذکورہ مجلّہ نے ۱۸-۲۴/مارچ ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں اپنے سرورق پر افغانی لباس میں ملبوس ایک مسلم نوجوان کی تصویر شائع کی ہے، جو نماز پڑھ رہا ہے، اس کے داہنی جانب طاق پر قرآن کریم کے چند نسخے رکھے ہوئے ہیں اور اس کی جانماز سے کچھ فاصلے پر رائفل نظر آرہی ہے۔

اس تصویر سے یہ تصور دینا مقصود ہے کہ بندوق، قرآن اور نماز کے درمیان ایک قسم کا ارتباط ہے، گویا یہ تینوں اسلامی ذہن کے عناصر ہیں۔

اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآن کریم مذہب اسلام کا اولین مصدر ومنبع ہے، اور نماز ایمان وعقیدہ کے بعد اسلام کا دوسرا رکن ہے، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلامی

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/جون ۱۹۹۵ء۔

زندگی ایک فراخ اور کشادہ زندگی ہے جو قرآنی تعلیمات اور احادیث نبویہ کا پرتو ہے اور قرآن کریم وہ دستور حیات ہے جو ربانی تعلیمات وہدایات اور الٰہی احکامات پر مشتمل ہے جن کا بنیادی موضوع صحیح وسچا عقیدہ، صالح اعمال، اصلاح معاشرہ اور عام ہدایت ہیں۔ دراصل یہ قرآن رشد وہدایت کی وہ عالمگیر اور مہتم بالشان کتاب ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاق فاضلہ کی تعلیم دیتی ہے اور اس کائنات ارضی میں انسان کے خلیفۂ ربانی ہونے کی حیثیت سے اس کے فرض منصبی کی تعیین کرتی ہے، جہاں تک جہاد کا سوال ہے تو اس کے کچھ آداب، اصول وضوابط ہیں، درحقیقت قرآن کی اثر آفرینی کے خوف اور اسلام کے تئیں بغض وعداوت اور نفرت وحقارت کے جذبات ہی کینہ پرور ودشمنان اسلام کو ان مصادر پر طعنہ زنی کرنے اور انھیں سرچشمۂ درندگی وحیوانیت قرار دینے پر آمادہ کیا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کتاب حق وصداقت اور پیغام علم وحکمت ہے، جو تلقین حق، رہنمائی، صبر اور عمل صالح کی دعوت دیتا ہے، علم ودانش، مکارم اخلاق اور کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں پر غور وتدبر پر ابھارتا ہے اور بغاوت وسرکشی اور ناشکری وناسپاسی سے روکتا ہے اور اس راستہ کو اختیار کرنے والوں کے انجام سے ڈراتا ہے اور یہی اس کا بنیادی مضمون ہے، وہ صالح انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔ اللہ کے مقبول بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وعباد الرحمن الذين يمشون على الأرض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما۔

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں (الفرقان: ۲۵-۶۳)

قرآن کریم نے اس مثالی اور قابل صد رشک انسان کی خصوصیات وعلامات بیان کرتے ہوئے مزید کہا کہ یہ مرد مومن امر حق کے علاوہ دیگر امور میں کسی بھی ایسے

ذی روح کی جان نہیں لیتا جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے، نہ ہی بہتان تراشی وجعل سازی کرتا ہے اور نہ ہی اسراف وفضول خرچی یا بخل کا مظاہرہ کرتا ہے، بلکہ وہ تو صبر جمیل اور اعمال صالحہ کا پیکر ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم نے مثالی زندگی کے آداب وقواعد کو انتہائی شرح وبسط اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جو انسانیت کی خوش بختی ونصیب آوری کا سبب ہیں اور جن سے خیر وصلاح، محبت وشفقت اور سکون قلب کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، حتی کہ قرآن کریم دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:۔

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقویٰ۔

اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔ (المائدہ:۵:۸)

اسی طرح قرآن کریم میں غیر اللہ کے آستانوں پر جبیں سائی کرنے والوں کو ایذا رسانی وتکلیف دہی سے بھی روکا گیا ہے، فرمان باری ہے:۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا اللّٰه عدوا بغیر علم۔

اور جن لوگوں کو یہ مشرک خدا کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہنا کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھے برا (نہ) کہہ بیٹھیں (الانعام:۶:۱۰۹)

لیکن کینہ پرور وحاسدین اسلام قرآن کے متعلق صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو جنگ وجدل اور قتل وخونریزی کا حکم دیتی ہے، حالانکہ اگر وہ جہاد وقتال کی آیتیں شمار کریں اور ان آیتوں کی بھی تعداد معلوم کریں جو پاکیزہ اخلاق وآداب، عفو کرم، رحمت ومغفرت، امر بالمعروف، عمل صالح، احسان وخداترسی اور ناحق قتل کو نگاہ حقارت ومذمت سے دیکھنے کی دعوت دیتی ہیں تو وہ یقیناً مؤخر الذکر

آیتوں کو قتال کا حکم دینے والی آیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیں گے۔ اسی طرح ظلم وجور اور دست درازی ودراندازی کی تردید کرتے ہوئے بھی قرآن کریم احتیاط وپیش بندی اور اعتدال ومیانہ روی کی دعوت دیتا ہے اور صبر وثبات اور عفو وکرم گستری کو ترجیح دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصالحين۔

اور اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی اور اگر صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ (النحل:۱۶:۱۲۶)

درحقیقت مسلمانوں کو جہاد وقتال کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان سے جنگیں لڑی گئیں اور ان کے عہد وپیمان کو پامال کیا گیا لیکن اس اجازت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ انھیں جنگ کے حدود وآداب کی رعایت اور پاس ولحاظ کا حکم دیا گیا۔ تاریخ نے بہت سی ایسی جنگوں کو صاف تذکرہ موجود ہے جو ان حقوق وآداب کے پاس ولحاظ کا منھ بولتا ثبوت ہیں اور جن جنگوں میں ان آداب وضوابط کی خلاف ورزی کی گئی ہے ان کا تعلق درحقیقت شخصی امور سے ہے، جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ زمانہ مطلوبہ اغراض ومقاصد کے حصول کی خاطر جملہ حقوق وآداب انسانیت اور اخلاقی قدروں سے روگردانی کررہا ہے اور ان تمام وسائل وذرائع کو حلال اور مباح تصور کرتا ہے جو اپنی مطلوبہ منفعت کے حصول میں معاون ہوں، خواہ یہ منفعت بے شمار انسانوں کی ہلاکت وخونریزی، کھیتوں اور جائدادوں کی تباہی، تمام قابل احترام چیزوں کی پامالی وبیخ کنی سے

حاصل ہو اور اپنے حقیر ترین نفع کے لیے جنگ کے شعلے بھڑکانے پڑیں، لیکن اس پر کوئی احتجاج نہیں، احتجاج ہے تو اسلام، قرآن کریم اور دیگر دینی کتابوں پر درندگی وتشدد کا درس دینے کی الزام تراشیاں کی جاتی ہیں تو قرآن کریم پر، اس لیے کہ لوگ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے چشم پوشی کرتے ہیں، قرآن کی تاثیر ودلکشی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جو بھی قرآن پڑھتا ہے اور تعصب کی عینک اتار کر تلاش حق کی نیت سے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس کتاب برحق پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ پاتا، نیز اسے یہ دولتِ عرفان وآگہی بھی نصیب ہوتی ہے کہ قرآن درحقیقت بنی نوع انسان کے لیے مژدۂ ہدایت اور پیغام علم وحکمت ہے، اس کتاب نے جہاں ماضی میں کفار ومشرکین کو اپنا فدائی واسیر بنالیا تھا، وہیں آج بھی یہ کتاب یورپ کی فضاؤں میں پروان چڑھنے والے اہل علم ودانش کی ایک معتد بہ تعداد کو مسحور کررہی ہے، جو حضرات فلاسفہ اور یورپی مفکرین کے دخول اسلام کی رپورٹیں پڑھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انہیں شاہراہ حق پر لانے میں قرآن کریم نے کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔

کینہ رکھنے والے وحاسدین اسلام کی اسلام کے تئیں دہشت وسراسیمگی اس کے انتہائی سرعت کے ساتھ پھیلنے نیز اصحاب عقل وحکمت کا دل موہ لینے اور تشکیل ذہنی کے سلسلے میں قرآن کریم کے حد درجہ موثر ہونے کی بنا پر بدترین اور بھیانک نفرت وعداوت کی صورت اختیار کرگئی ہے جو ان کے اسلام کے بالکلیہ انکار کا بنیادی سبب بنی، یہی وہ ذہنیت تھی جس نے سرزمین ہندوستان میں بعض معاندین اسلام کو قرآن کریم کے خلاف اس الزام کے تحت عدالت میں مقدمہ دائر کرنے پر آمادہ کیا کہ یہ تشدد وبربریت اور قتل وخون آشامی کا درس دیتا ہے، ان لوگوں نے ان آیات کا جو حکم قتال پر مشتمل ہیں اور مختلف مقامات پر آئی ہیں، انتخاب کیا اور ان کو ان کے سیاق وسباق اور مخصوص پس منظر اور احوال وکوائف سے الگ کرکے ان کی تشریح کی، لیکن

عدالت کے منصف حضرات ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دوراندیش وباریک میں تھے، لہٰذا انھوں نے اس مقدمہ کو خارج کردیا۔

اسی خوف نے دنیا کے بعض حلقوں کو دینی کتابوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر مجبور کیا، انھوں نے مدارس اسلامیہ کے متعلق بھی شکوک وشبہات پیدا کیے اوران پر تشدد اور کٹر پن کی تعلیم دینے کا الزام لگایا، اس سے ان کی ناواقفیت اور مغرب کی اندھی تقلید کا ثبوت ملتا ہے، کیوں کہ یہ کتابیں عقیدہ کی اصلاح اور اخلاق حسنہ وعمدہ انسانی آداب کی تعلیم دیتی ہیں، وہ مروت وانسانیت، خیر وصلاح اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے اصول بیان کرتی ہیں جو مغرب کے مادی تمدن سے میل نہیں کھاتیں۔

عصر حاضر میں سامراج از سرنو اپنی زندگی کا آغاز کررہا ہے اور بعض اسلامی ممالک پر دوبارہ اقتدار وتسلط کے حصول کے لیے پرتول رہا ہے۔ بعض مغربی اہل قلم اور مغرب سے مرعوب ذہن قرآن کریم، حدیث نبوی اور دیگر دینی کتابوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً زہرافشانی کرتے رہتے ہیں اور انھیں موجودہ زمانہ میں تشدد کے پھیلنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، لیکن یہی اہل قلم جب اسلام مخالف عناصر کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف تشدد برتا جاتا ہے، تو خاموشی اختیار کرلیتے ہیں اور ان اشتعال انگیزیوں اور جارحانہ کارروائیوں سے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کا مسلمان مختلف ملکوں میں سامنا کررہے ہیں۔

مسلمانوں پر تشدد کی تہمت لگائی جاتی ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار کیا جاتا ہے کہ مسلمان خود تشدد کا شکار ہیں اوران کو ان کی غلط تصویر پیش کرکے اوران کے مذہب کی تعلیمات کو بگاڑ کر غلط تصور دے کر ستایا جارہا ہے۔ بعض جگہوں میں ان کو اپنے دفاع پر مجبور کیا جاتا ہے اور بعض جگہ غلط عناصر کو تربیت دے کران کی صفوں میں داخل کیا جاتا ہے تاکہ ان پر الزام لگایا جاسکے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ثابت ہوگا کہ اکثر

مسلح جدوجہد کرنے یا تشدد اختیار کرنے والے یورپ ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور ان کو اسلحے وہیں سے ملے ہیں، یورپ دنیا میں ایک دوسرے سے برسرپیکار گروہوں کو اسلحہ سپلائی کرتا ہے۔ یہ یورپ ہی ہے جو ایسے مسائل پیدا کرتا ہے جن سے جنگ کے شعلے بھڑکیں، دو عالمی جنگیں یورپ ہی میں ہوئیں، طویل سرد جنگ یورپ ہی کے ملکوں میں جاری رہی، اسلام کو زبردستی دشمن قرار دے کر اس کے خلاف جنگ خود یورپ نے چھیڑی، ناٹو اور C.I.A. نے اپنی طاقت اسلام کے خلاف صرف کرنے کا اعلان کیا، افریقہ اور ایشیا میں رونما ہونے والے نسلی تصادم کے واقعات کے پیچھے یورپ ہی کا ہاتھ نظر آئے گا۔ اسی لیے وہ ان اندوہناک واقعات کے سامنے تماشائی کا موقف اختیار کرتا ہے، یورپ و امریکہ کے تعلق سے ہم نے جو کچھ کہا اس کی تصدیق ۲۶ رمئی ۱۹۹۵ء کو قومی آواز میں شائع ہونے والے ایک جائزہ سے ہوتی ہے جس کا انکشاف نیویارک کے ایک ادارہ کے جائزہ سے ہوا ہے۔

آج دینی کتب، مدارس اسلامیہ اور قرآن کریم کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلامی دہشت پسندی انہی عناصر کا پرتو ہے۔ لیکن خود مجلّہ ''اکنامست'' نے اپنے اداریہ میں اسلامی تحریکوں کے متعلق یورپ کی پالیسیوں اور طریقہائے کار میں تضاد و تعارض کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> یورپ اگر ایک طرف اسلامی تحریکات سے [illegible] ہے تو وہیں دوسری طرف اس کی اعانت و دست گیری بھی کر رہا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقالے میں ''اسلام کے ساتھ زندگی'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

> آپ کسی بھی ایسے اسلامی انتہا پسند کو لے لیجیے جو وسیع پیمانے پر دہشت گردی کے منصوبے بناتا ہو، آپ پائیں گے کہ اس نے امریکی سراغ رسانوں

کے ہاتھوں ٹریننگ حاصل کی ہے، وہ یا تو روس کے خلاف افغانستان کی جنگ میں لڑنے کے لیے تربیت دیا گیا ہوگا یا آپ اسے حماس کا رکن پائیں گے جسے اسرائیل نے تحریک آزادیٔ فلسطین کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹریننگ دی، یا آپ اسے اخوان المسلمین کا ممبر پائیں گے جنھیں انور سادات نے مصر کے بائیں محاذ کی مخالفت ومزاحمت اور مقابلہ آرائی وخنجر آزمائی کے لیے تربیت دی تھی''۔

مجلّہ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شدید ترین بنیاد پرستوں اور بنیاد پرستانہ قواعد وطریقۂ کار کو امریکہ کا قرب حاصل ہے، امریکہ ایران کے خلاف محاذ آرائی میں بھی مصروف ہے اور وہ ایرانی تجارت کا سب سے بڑا پارٹنر بھی ہے، اسی طرح ایک دوسرے مضمون میں کہا گیا ہے: عراق کا کویت پر قبضہ کرنا درحقیقت امریکی سازش کا ایک جزء ہے۔

اسلامی دہشت پسندی کے بارے میں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، دنیا کے گوشہ گوشہ سے آنے والی خبریں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ دھماکوں اور قتل وخونریزی کے بہت سے حوادث وواقعات جن کی ذمہ داری وجوابدہی اسلامی تحریک پر عائد کی جاتی ہے، دراصل امریکی یا صہیونی سراغ رسانی کا شاخسانہ ہیں جن کا مقصد محض اسلامی پیش رفت وپیش قدمی کی مخالفت ومحاذ آرائی، اسلامی مردان کار اور صاحبان عزم وبصیرت کے خلاف سخت کارروائیوں کا جواز فراہم کرنا اور اسلامی شعور وبیداری کے تین بنیادی مرجع وماخذ اسلام، قرآن کریم اور دینی کتاب کے خلاف نفرتوں کی یورش ہے۔

یورپ اور خاص طور سے امریکہ کے اسلام کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ اور سازشوں کا پردہ فاش کرنے کا یہ مناسب وقت ہے، اہل قلم کو اس نئی سامراجی سازش کو بے نقاب کرنا چاہئے، ورنہ عالم اسلام کے ساتھ ساری دنیا دوبارہ مغرب کے سامراج میں مبتلا ہو جائے گی۔

نئی منطق نئی اصطلاحیں (☆)

دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مختلف نوع کے مسائل کا سامنا کررہے ہیں، گذشتہ طویل تاریخ میں مسلمانوں کو سخت ترین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن موجودہ دور کے مسائل کی نوعیت مختلف ہے، عہد ماضی میں اس نوعیت کے مسائل سے ان کو سابقہ نہیں پڑا، اس دور میں ان پر جو حملہ ہورہا ہے وہ نئی نوعیت و نئے انداز کا ہے۔ اس میں قوت سے زیادہ ذہانت اور مکر وفریب بلکہ چالبازی شامل ہے اس لئے اس کے مقابلہ کے لئے جوش اور قوت سے کام لینے کے بجائے سوجھ بوجھ اور حکمت اور ذہانیت سے کام لینے کی ضرورت ہے، موجودہ حملہ فکری اور ذہنی حملہ ہے اس میں مکر وفریب، چالبازی، بہانہ بازی جیسے عناصر غالب ہیں، اس میں دکھائی تو دیتی ہے دوستی، لیکن چھپی ہوتی ہے دشمن، اس کے لئے الفاظ وتعبیرات کا سہارا لیا جاتا ہے، جو ظاہری طور سے اصلاح کے معنی رکھتے ہیں مگر درحقیقت ان کی تہہ میں شر وفساد چھپا ہوتا ہے۔ چنانچہ دشمنان اسلام اس وقت ایسے الفاظ لاتے ہیں جن کے ظاہر سے لگتا ہے کہ اس کا مقصد اصلاح اور حالات کو سدھارنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، یا اس سے یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ یہ ایسا قول وعمل ہے جس کے اندر ذرہ برابر نہ شک کی گنجائش ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی کوئی کجی ہے، تھوڑے غور وتامل کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ صرف حسین جملوں اور خوبصورت تعبیرات سے کام لیا گیا ہے لیکن درپردہ ان الفاظ کے اندر جو فکر وذہن کام کررہا ہوتا ہے اسکا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کو سپر بنا کر اسلام

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اگست ۱۹۹۵ء۔

اوراس کی پاکیزہ تعلیمات پر حملہ کیا جائے یا اس کے اثر وطاقت کو زک پہونچانے کی تدبیریں اختیار کی جائیں یا اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کو عام کر کے لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ اوراسلام سے بدگمان کیا جائے۔ مثال کے طور پر شخصی آزادی، آزادی رائے، عورت کی آزادی کے حسین الفاظ ہیں۔ اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے ان اصطلاحات کا بہت استعمال ہوتا ہے اوراسلام کوان کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے اوران تینوں آزادیوں کومغرب کی دین اورتمدن کا عطیہ سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب اسلام نے سب سے پہلے شخصی آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ اس نے انسان کواشرف المخلوقات قرار دیا اور خلیفۃ اللہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اس نے فرد ومعاشرے کی آزادی کے اندر ایک ایسا حسین وخوشگوار امتزاج وتوازن قائم کیا جس کی دوسرے ادیان ومذاہب میں کوئی نظیر نہیں، ملتی اسلام نے نہ تو فرد کومقید کیا نہ معاشرے کو بلکہ اپنی روشن وواضح تعلیمات اور محکم ومنضبط قوانین کے آئینہ میں ایسے دلنواز اصول وضوابط مرتب کردیئے جن کے ذریعہ معاشرے وجماعت کی آزادی کی صورت میں فرد کی آزادی کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے، اسلام نے جماعت کے ایک فرد کے مقام کوفرد ہونے کے ناطے گھٹایا اور گرایا نہیں، بلکہ اس کے مقام ومرتبہ کو بہت بلند کیا۔ جب کہ یہی فرد دوسرے ادیان ومذاہب ونظام ہائے حیات میں طوقِ غلامی سے گرانبار ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کو یہ حق عطا کیا کہ وہ جابر اور ظالم کے سامنے اپنی بات کہے "کلمة حق عند سلطان جائر" جس کی تاریخ اسلام میں متعدد مثالیں ملتی ہیں اوران جاہ وجلال کے مالک حاکموں کواس کا احترام کرنا پڑا ہے۔ حضرت عمرؓ کا وہ جملہ بہت مشہور ہے جس میں انھوں نے مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص سے ایک عیسائی کی شکایت پر کہا تھا۔ تم نے ان کو غلام کب سے بنالیا جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ لوگو! خوب سمجھ لو تم میں جو سب

سے زیادہ طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے ذمہ جو حق باقی ہے وہ وصول کرلوں اور تمہاری نظر میں جو کمزور ہے۔ وہ میری نگاہ میں طاقتور ہے یہاں تک کہ میں اس کا جو حق ہے وہ اس کو دلا دوں۔

اسلام نے نوع بشری کے تمام افراد کو حقوق میں برابر کا درجہ دیا ہے اور ایسا جیسے کہ ایک کنگھے کے سارے دانت بالکل برابر ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی اسلام کی فرماں روائی وحکمرانی رہی اور کلی طور پر اس کے احکامات وقوانین جاری وساری ہوئے، اور وہ ایسا ملک بھی تھا جہاں مسلم وغیر مسلم دونوں آباد تھے، اسلام نے قانونی حیثیت سے انسانی حقوق کے سلسلہ میں ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی تفریق نہیں کی، اور نہ کسی امتیاز وخصوصیت کو روا رکھا۔

اس طرح کی مثالوں سے تاریخ اسلام کے اوراق بھرے پڑے ہیں اور یہ خصوصیت کوئی عہد اول ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ عہد اخیر میں بھی اس کی صدہا مثالیں ملتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اسلام کو پورے طور پر بالادستی حاصل ہوئی۔ اس طرح کی مثالیں پائی گئیں۔

موجودہ دور میں فرد کی آزادی کا نعرہ ایک ایسا سوچا سمجھا نعرہ اور طاقتور ہتھیار ہے جس کا نشانہ صرف اسلام اور اس کا پاکیزہ معاشرہ ہے۔ اس جدید ہتھیار کا استعمال کچھ وہی لوگ کرتے ہیں جو معنوی وحقیقی طور پر فرد وجماعت کی آزادی کے قاتل اور اس کے دشمن ہیں اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں اس زہر آلود ہتھیار کی بڑی کھپت اور بڑا رواج ہے، بڑے بڑے روشن خیال اہل قلم آج یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ اس آزادی کے نام پر ان کو اسلام پر تنقید ورائے زنی کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر کبھی کوئی گستاخ اسی آزادی کو بہانہ بنا کر اسلام کی شان میں کوئی نازیبا بات کہتا ہے یا اس پر تنقید کرتا ہے، جس پر اس کی گرفت کی جاتی ہے تو ان روشن خیالوں کے منہ پھول جاتے ہیں، جب کہ

ان کو اس بات کا پورا پورا علم ہوتا ہے کہ اسی ملک کے اندر ہزاروں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ناتواں پیروں میں زنداں کی مضبوط بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کو محض شبہ و بے بنیاد الزامات کے سبب تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے، اور اگر بالفرض انہیں آزادی رائے کا راگ الاپنے والے ممالک میں سے کسی ملک میں کوئی ایسی بات پیش آجاتی ہے جس کا تعلق نظام حکومت سے یا ملک کی اقتصادیات سے یا تعلیم و تربیت کے نظام سے ہوتا ہے تو اس صورت میں سارے عوام کی زبانوں پر تالا پڑ جاتا ہے، اور وہ آزادیٔ رائے کے سارے حقوق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی متنفس کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ زبان کھولے یا اپنے قلم کو حرکت دے۔ ایسے ماحول میں وہی کہا جاتا ہے، جو حکومت کی مرضی کے مطابق اور حکمرانوں کی چاہت کے مرادف ہو، اس مسئلہ میں ان کو آزادیٔ رائے کا ذرا خیال نہیں آتا، اور نہ وہ اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔

جہاں تک عورت کی آزادی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس کے پیچھے بھی سازش کا ایک جال ہے، اور جب اس کی آزادی کے مسئلہ کے بیک گراؤنڈ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کی آزادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور اس کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جائے، اور خاندانی اقدار و روایات کو پامال کر کے شتر بے مہار کی طرح من مانی زندگی بسر کرے، لیکن اگر کوئی پاک طینت و عفت مآب خاتون اپنے اس حق کا مطالبہ کرتی ہے کہ اسکو ایک مخصوص طریقۂ حیات کے تحت زندگی گذارنے دیا جائے، وہ جس طرح چاہے اپنے پردہ کا نظم کرے اور جیسا چاہے اپنے لیے مخصوص لباس اختیار کرے، اس سلسلہ میں اس پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ اس کو کسی خاص نظریہ کو اپنانے پر مجبور نہ کیا جائے، تو اس پر آزادی کی تعبیر کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اور یہی عورت کی آزادی کا دم بھرنے والے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو ایسا کرنے کی اجازت دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ ایسی عورت کو وہ اپنی مرضی کے

مطابق اور اپنے تصور کے مطابق چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی فرد یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرز حیات وعقیدہ ولباس اپنانا چاہتا ہے تو اس کو اس کی ان تمناؤں کی تکمیل سے محروم رکھا جاتا ہے اور اس کی شخصی آزادی پر قدغن لگایا جاتا ہے بلکہ اس کو آزادی وحریت کا دشمن گردانا جاتا ہے۔ لیکن یہی فرد اگر عقیدہ کے خلاف اقدام کرے اس کو اپنی تنقیدوں اور تہمتوں کا نشانہ بنائے تو پھر یہ آزادی کا سب سے بڑا علمبردار اور اس کا جاں نثار ہے، اس کے برعکس اگر یہی فرد رزق طیب وحلال کی جستجو وتلاش کے لئے کوشاں ہو اور مال حرام سے بچنا چاہتا ہو تو گویا یہ حریت وآزادی کا کھلا دشمن ہے لیکن اگر یہی مال حرام سے اپنا پیٹ ناجائز آمدنیوں کے ذریعہ زندگی کے اسباب آرائش وزینت فراہم کرے۔ اور کسی اخلاق تعلیم کا التزام نہ کرے تو یہ شخصی حریت نواز ہے اور متمدن ہے مذکورہ بالا مثال سے موجودہ وقت میں حریت کے پرچم برداروں کے دورخے پن کی تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے اور ان کا نفاق ظاہر ہو جاتا ہے، اور زندگی کے بہت سے میدانوں میں ان کے اس طرز فکر وعمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

اگر خیر وصلاح کی نشر واشاعت، کردار سازی، مردم گری، انسانی اخلاق کی تعمیر کی غرض سے قوت کا استعمال کیا جائے تو ان علمبرداران حریت کی ڈکشنری میں اس کا نام دہشت گردی، بنیاد پرستی، کٹرپن ہے اور اس سے فرد کی حریت مجروح ہوتی ہے، لیکن اس کے برعکس اگر اسی قوت کا استعمال اچھی باتوں اور تعمیری کام کرنے والے اور برائیوں کا سدباب کرنے والے طریقوں کو روکنے یا ان کو مٹانے کے لئے کیا جائے تو یہ اقدام عین حریت اور ترقی پسندانہ ہے، اسی طرح اگر کسی شخص پر یہ پابندی لگانے کے لئے کہ وہ کسی مخصوص عقیدہ یا تہذیب ومعاشرت کے مطابق زندگی نہیں گذار سکتا قانون بنایا جائے تو یہ عمل عین آزادی ہے لیکن اگر کسی عقیدہ کے احترام کی بات کی جائے تو بنیاد پرستی، تنگ نظری اور حریت دشمنی کا عمل ہے۔

بعض ممالک میں اگر کسی غیر مسلم پر تنقید کی جائے تو اس کو قابل سزا عمل قرار دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس سے اس ملک کے خارجی تعلقات اور اس کی سالمیت متاثر ہوتی ہے اور دوسرے فرقے کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں ممالک میں غیر مسلموں کو یا ان کے غلاموں کو مسلمانوں پر، اسلام پر اور اس کی پاکیزہ تاریخ اور اس کے مقدسات پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت ہے۔ حکومت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتی بلکہ اس اقدام کو یہ کہہ کر نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ یہ آزادیٔ گفتار کا تقاضا ہے، بسا اوقات ایسا کرنے والوں کو شہہ دی جاتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ترکی کی ایک مثال ہے کہ جن لوگوں نے مصطفیٰ کمال پر تنقید کی ان کو حوالۂ زنداں کردیا گیا مگر جن لوگوں نے سلمان رشدی کے افکار ونظریات اور اس کی کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ان کی پشت پناہی کی گئی۔ ان کی کوششوں کو سراہا گیا۔ بعض ملکوں میں دعوت اسلامی پر مختلف فرقوں میں منافرت کے خوف سے پابندی ہے لیکن ان ہی ملکوں میں عیسائیت کی اشاعت کے وسائل فراہم کئے جاتے ہیں۔

فرانس کے وزیر تعلیم کا کہنا ہے کہ فرانس کے ہر ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ ملک کے اندر رائج نظام تعلیم کو اختیار کرے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ ملک کے اندر جو تہذیب وثقافت رائج ہے اس کو اپنائے، کسی قیمت پر بھی اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ ایک ہی ملک کے اندر مختلف ومتعدد تہذیبیں اختیار کی جائیں۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کو قومی دھارے میں ہم آہنگ ہونے کی دعوت دی جارہی ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اس ملک میں باقی رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ملک کے رسم ورواج اور اس کی عادات واطوار کو اختیار کرنا پڑے گا۔ یہاں کی عظیم ہستیوں کا اعتراف بھی کرنا ہوگا۔

اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے سروں پر ایک بھیانک خطرہ کی گھنٹی اور

بج رہی ہے، جس نے ان کو بے چین کر دیا ہے، وہ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ہے۔ حکومت ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس ظالمانہ قانون کی زنجیر میں جکڑ کر شریعت اسلامیہ سے بے دخل کر دیا جائے۔

ان سب کے بعد بھی اس کو حریت، آزادی اور رواداری کا سنہرا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان اپنے ملک میں حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ ملک کے تمام مسلمانوں کو شریعت اسلامیہ کے مطابق زندگی گزارنا چاہئے اور اسلامی ثقافت کو اختیار کرنا چاہئے تو ان کے اس مطالبہ کو معاندین اسلام بنیادی پرستی اور کٹر پن قرار دیتے ہیں۔

کیا مذکورہ ساری مثالیں دور جدید کے دورخے پن پر دلالت نہیں کرتی ہیں کہ اگر مسلمان اپنے دینی شعائر کا مطالبہ کریں تو یہ بنیاد پرستی ہے لیکن اگر مخالفین اور دین کے دشمن ان کے دین کے اندر مداخلت کرنے کی کوشش کریں اور اپنا دین اور اپنی ثقافت نافذ کرنا چاہیں تو یہ آزادی اور رواداری ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا نے اس طرز حیات کو اختیار کر رکھا ہے خواہ وہ اسلامی ممالک ہوں یا غیر اسلامی ان کے دورخے پن، نفاق، مکر وفریب کے نمونے ہر جگہ دیکھنے میں آرہے ہیں اور یہی دورُخا پن ان کی موجودہ سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور مسلمان اس کے شکار ہے۔

آزاد ممالک کے غلام عوام (☆)

اگر یہ کہا جائے کہ چند با اقتدار ممالک کے سوا پورا عالم سامراجیت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے جس میں عالم اسلام بھی ہے، تو لوگ تمسخر و مزاح سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے یا تو پھر اس کا صریح انکار کریں گے اور یہ سیاسی ناواقفیت بلکہ جہالت ولاعلمی کی بات سمجھی جائے گی۔ اور دنیا کے سیاسی نقشہ کی بنیاد پر اس دعوے کے خلاف مثالیں بھی پیش کی جائیں گی اور ان ممالک کے نام گنائے جائیں گے جو کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران آزاد ہوئے اور ان ملکوں میں قومی حکومتیں قائم ہیں، اقوام متحدہ کے ممبر ممالک خود مختار اور آزاد ممالک سمجھے جاتے ہیں جن کے اپنے پرچم، اپنی پارلیمنٹ، اور اپنے سفارت خانے ہیں، ان ملکوں کی فہرست پیش کی جائے گی جو ظاہر کرتی ہے کہ یہ آزاد ہیں، اور وہ آزاد ممالک میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کی اپنی فوج اور پولیس ہے، اور ترقیاتی منصوبوں اور حکمرانوں کے انتخاب کا نظام ہے اور وہاں کے حکام اپنے کو عوام کا نمائندہ بھی کہتے ہیں، مسلمان بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی تعداد پورے عالم میں ایک ارب سے متجاوز ہے، اور وہ تقریباً پچاس ملکوں میں اکثریت میں ہیں اور ان کے بہت سے ممالک اسلامی جمہوریہ کہلاتے ہیں۔

آزاد ممالک کی یہ طویل فہرست اور ان کا عددی تناسب اس کا متقاضی تھا کہ وہ دنیا میں اپنا وزن رکھتے، داخلی آزادی کے ساتھ ساتھ خارجی معلومات میں بھی ان کی اپنی حیثیت اور مقام ہوتا لیکن اس عظیم تناسب کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر نومبر ۱۹۹۵ء۔

ترقی پذیر ممالک کے باشندے مختلف النوع مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں اور ان کی مجبوریاں اور پریشانیاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ انھیں اپنے حقوق استعمال کرنے اور آزادی کے ساتھ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ملک کی تعلیم، اقتصادیات ذرائع ابلاغ میں ان کی مصلحتوں کی کچھ بھی رعایت نہیں، عالمی برادری میں ان کی کوئی قوت نہیں چھوٹے ممالک ایک بڑے ملک کی رائے نہیں بدلوا سکتے ، وہ اقتصادیات، سیاسیات اور تعلیم وثقافت میں دوسروں کے پابند ہیں۔

خاص طور پر عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کا جو شخص بنظر غائر مطالعہ کرے گا تو اس کے سامنے ایک عجیب وغریب منظر ہوگا، جس کی نظیر گذشتہ تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ مسلم اکثریت اپنے ملک کی سیاست سے الگ زندگی گذار رہی ہے جسے زندگی کے کسی گوشہ میں نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں اور ملک کی سیاست میں اثر انداز ہونے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کا کوئی اختیار نہیں، اس کے برخلاف ان کے ملک کی سیاست پر اقلیت کا فکری ذہن غالب ہے اور وہی حکمرانی کر رہا ہے، جو قومی لحاظ سے تو اس اکثریت کا فرد ہے لیکن فکری اور ثقافتی لحاظ سے اس کا اس اکثریت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

مسلم عوام کا مزاج اور سیاسی قیادتوں کے مزاج کے درمیان واضح فرق پایا جاتا ہے جو نظروں کے سامنے ہیں کیونکہ مسلم عوام اسلام اور اسلامی ثقافت کو اختیار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور فکر وتدبر، تعلیم وتعلم اور عبادات واقتصادیات سے لے کر زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تشخص کو نمایاں حیثیت دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کا اپنا معاشرہ اسلامی زندگی کا ایک اچھا نمونہ اور مرد مسلم کے اغراض ومقاصد کا ایک صحیح پرتو ہو جو طویل سامراجی عہد کے پردۂ ظلمت میں چھپا رہا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود مغربی مبصرین اور سیاستدانوں کو ہے جو عالم اسلام کے اس عوامی

رجحان کا بڑی گہرائی کے ساتھ جائزہ لے رہے ہیں اور اس رجحان کو اپنے مفادات کے لئے خطرناک قرار دے رہے ہیں اور اس کو روکنے کے لئے تدبیریں اور سازشیں کر رہے ہیں، نیز مغربی میڈیا یہ تاثر دے رہا ہے کہ اس رجحان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس میں قوت آرہی ہے، مسلم ملکوں کی حکومتوں کو اس رجحان وخیال کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اکسا رہے ہیں اور اس کے لئے تدبیریں تجویز کر رہے ہیں۔

مسلم ملکوں کے قائدین جو سیاسی وسائل یا فوجی قوت کے بل بوتے پر حکومت کر رہے ہیں اور جو بڑے اور طاقتور ممالک کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں اور جن کی نشو ونما مغربی تربیتی مراکز اور علمی اداروں میں ہوئی ہے، ایسا موقف اختیار کر رہے ہیں جو ان کے عوام کے مفاد و مقاصد کے یکسر خلاف ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں عوام اور نظام حکومت کے درمیان ایک قسم کا تصادم پیدا ہو رہا ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے سلسلہ میں عدم اعتماد کے شکار ہوئے ہیں، اور ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جو مقابلہ آرائی اور محاذ آرائی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ دینی غیرت رکھنے والے مسلمان اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی اجنبیت محسوس کر رہے ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ جو طبقہ ان کی قیادت میں نمائندگی کر رہا ہے وہ ان کے دین کا حامل نہیں، نیز ان دینی واخلاقی قدروں کا وہ قائل نہیں جن کے یہ حامل ہیں اور انھیں اپنے ملک میں ایسے مناظر کا مشاہدہ کرنا پڑ رہا ہے جن کو ان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا اور جو چیزیں انھیں پڑھنے اور سننے کو مل رہی ہیں اور ان کا ملک جس راہ پر گامزن ہے اس سے انھیں ایک طرح کی گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔

اور اسی بنا پر حریت پسند شہریوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہا اور بخوشی ورضا اپنے دین وتشخص کے ساتھ جلا وطنی کی زندگی گذارنے کو انھوں نے ترجیح دی، ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، اور ان میں ایسے ذی صلاحیت لوگ شامل ہیں جن کی

ضرورت خود ان کے ممالک کو بھی ہے، انھوں نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ ان کے کان ایسے نامانوس کلمات نہ سنیں، اور ان کی آنکھیں ایسی چیزیں مشاہدے میں نہ لائیں جن سے ان کو فطری نفرت و بغض ہے کیونکہ انھیں وہ طاقت حاصل نہیں جس کے ذریعہ وہ حالات کا رُخ موڑ سکیں اور نہ ہی وہ آزادیٔ رائے اور حریت فکر ہے جس کے اظہار و بیان سے دل و دماغ کو راحت بہم پہونچائیں۔

ان دونوں متضاد و مخالف رجحانات کے نتیجہ میں دونوں فریقوں کے درمیان عدم اعتماد اور شک وشبہ کی ایک خاص ذہنیت پروان چڑھ رہی ہے۔ آپسی اختلافات رونما ہو رہے ہیں چنانچہ حکام و رہنما اپنے عوام سے پریشان ہیں اور عوام اپنی حکومتوں سے بیزار، ایک کی فکر دوسرے کی فکر سے متصادم ہے، اس خوف سے سیاسی، شہری، سرکاری، فوجی، تنظیمی اور تعلیمی قیادت میں مسلسل تبدیلیاں لائی جارہی ہیں کہ کہیں یہ لوگ اقتدار پر قابض نہ ہو جائیں، اس کے لیے سازشیں کی جارہی ہیں جن کے نتیجہ میں ہزاروں عوام خیانت کی تہمت سے قید خانوں اور جیل خانوں کی نذر ہو رہے ہیں انھیں آزادی کے ساتھ گفتگو کرنے میں بھی ایک خوف و ہراس کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اور یہاں تک کہ انھیں اپنے رشتہ داروں اور بھائیوں پر بھی کامل اعتماد نہیں، یہی آج ایشیا و افریقہ کے بیشتر عربی و عجمی مسلم ممالک کی صورت حال ہے۔

مسلمانوں پر خود ان کے ملکوں میں اس نام نہاد دور آزادی میں ظلم وستم کے ایسے پہاڑ توڑے جارہے ہیں اور انھیں ذلت و رسوائی، قتل و غارت گری، آبروریزی و عصمت دری، عقائد کی پامالی اور ذہنی کشمکش کا ایسا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جیسا کہ حقیقی سامراجیت کے دور میں بھی نہ کرنا پڑا تھا، اور حریت پسند، صاحب ضمیر لوگوں کو ان آزمائشوں سے گزرنا پڑ رہا ہے جن سے غلام کے عہد میں بھی گذرنا نہیں پڑا تھا، حق پرست، حق گو، اور اصلاح کے داعیوں کو اپنی راست گوئی کی وجہ سے سزائیں دی

جارہی ہیں اور ملک بدر کیا جارہا ہے، ان حق پرستوں نے یہ سمجھا تھا کہ ان کا اپنا ملک ہے اور وہاں مسلم باشندوں کی اکثریت ہے، لہٰذا وہاں اسلامی طور وطریقے ہونا چاہئے، اسلام کی آواز بلند ہونی چاہئے۔ اور ملک کی سیاست میں اسلام اور مسلمانوں کا قول، قول فیصل سمجھا جانا چاہئے اور ملک میں اسلامی تشخص کو بالادستی حاصل ہونی چاہئے۔

ان حق پرستوں کو حق بات کہنے سے روکا جاتا ہے اور ان پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں اور اسلام اور مسلم دشمنوں کو موقع فراہم کیا جارہا ہے، اور یہ آزادی بہم پہونچائی جارہی ہے کہ وہ جس مسئلہ کو چاہیں موضوع بحث بنائیں، اور اسلام کی معزز شخصیات پر الزام تراشی کریں، تاریخ اسلام پر کیچڑ اچھالیں اور حقائق کی پامالی کریں، ان زیادتیوں پر اگر مسلمانوں کو ناگواری ہو تو ان کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں، اور ان جملوں کا جواب دیں، اور اسلامی غیرت وحمیت کا اظہار کریں اور اگر خطرہ مول لیتے ہیں اور اظہار کرتے ہیں تو ان پر بنیاد پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے اس طرح اکثریت اقلیت کی تابع بنی ہوئی ہے، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ وہ آزاد ہیں اور ان کے ملک آزاد ممالک ہیں، ان کی اپنی قیادت وسیادت ہے کیسے صحیح اور درست ہوسکتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب موجودہ سیاسی قیادتوں کو دینا چاہئے۔ اور خاص طور سے ان قیادتوں کو دینا چاہئے جو اپنے کو عوامی جمہوریت کے نام سے موسوم کرتی ہیں اور آزادی رائے کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔

اکثر مسلم ملکوں کی یہی پوزیشن ہے اور اس غیر عوامی نظام کو یورپ کی طرف سے سرپرستی حاصل ہے اور وہ اس پوزیشن کو اسی خطرہ کے پیش نظر بدلنا نہیں چاہتا کہ عوام کو اختیارات دینے سے اسلامی رجحان کو غلبہ حاصل ہوگا، لیکن بندشوں میں جکڑا ہوا یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہ سکتا، کیونکہ جس ملک کے عوام عملی زندگی سے جدا ہوکر زندگی گذار رہے ہوں وہ ملک ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتا اور ترقی یافتہ ممالک کی

صفوں میں کبھی شامل نہیں ہوسکتا اور اس کے مقاصد واغراض کسی طرح بار آور نہیں ہوسکتے، یہ تو مسلمانوں کا اپنا قانونی حق ہے۔

آج جو اکثر مسلم ممالک میں کشت وخون، قید وگرفت اور آواز حریت کی سرکوبی کے واقعات سرزد ہورہے ہیں اور یہ ممالک جس بدامنی اور انارکی کے شکار ہیں، یہ سب مغربی ممالک اور ان کے حکام کے سامنے سرنگوں ہونے اور ان کے رہنماؤں سے دوستانہ ویارانہ تعلق رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، اور یہ کشمکش ایک بہت ہی زبردست خسارہ ونقصان کا پیش خیمہ ہے جس کا خمیازہ مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑے گا خواہ وہ لیڈر کی حیثیت سے بھگتیں یا عام پبلک کی حیثیت سے، مسلم ملکوں میں پسماندگی اور مسائل کی پیچیدگی کا سب سے بڑا سبب عوام اور حکام کے درمیان حائل خلیج ہے جس میں مسلسل وسعت پیدا ہورہی ہے اور یہ سب انسان دوستی کا ڈنکا پیٹنے والے مغرب کی سازش اور اس کی سیادت کے نتیجہ میں ہورہا ہے جس کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔ اس لئے مسلم ملکوں کے سارے مسائل کی ذمہ داری مغرب کے وفادار حکمراں طبقہ پر ہے اور خود مغرب پر جو اسلام کو بدنام کرنے کے لئے کمر کسے ہوئے ہے۔

سیاسی نظام حکومت اور عوامی رجحان (☆)

جمہوری نظام حکومت میں الیکشن تشکیل حکومت کا واحد ذریعہ ہوتا ہے اگرچہ اس کے طریق کار اور دائرہ کار میں مختلف ممالک میں واضح فرق پایا جاتا ہے، تاہم وہ جمہوری نظام کے لئے خواہ اس کا طریق کار اور اس کی شکل کسی نوعیت کی ہو لازمی شرط ہے اور کسی بھی پارلیمانی سیاسی نظام میں اس سے مفر نہیں، لیکن عوام کی رائے صرف اسی الیکشن سے جانی جاسکتی ہے جو آزادانہ ماحول میں ہو اور حکومت کی مداخلت یا سرکاری دباؤ سے وہ متاثر نہ ہو اور کوئی آزاد ادارہ اس کا نظم کرے، حکومت اس کے نظام میں غیر جانبدار ہو اور اس کے نتائج کا احترام کیا جائے ایسی شکل میں یہی نتائج عوام کے موقف اور قائم ہونے والی حکومت کے نظام عمل اور ان کی سیاست کے بارے میں روشن پالیسی کو واضح کرتے ہیں۔

گذشتہ چند مہینوں میں دنیا کے چار ملکوں میں الیکشن الگ الگ نوعیت کے تھے۔ ان میں خاص طور سے مصر، ترکی، بنگلہ دیش اور روس کے الیکشن اور ان کے نتائج قابل ذکر ہیں۔

مصر اور بنگلہ دیش کے الیکشن کی نوعیت عام الیکشنوں سے مختلف ہے، مصر میں ہونے والے الیکشن میں ایک طرف حزب اختلاف کے لیڈر (اپوزیشن) اور فعال کارکن جیلوں میں تھے اور انھیں الیکشنی مہم میں حصہ لینے سے باز رکھا گیا تھا، اس لیے کہ اس میں اسلام پسند عنصر شامل تھا، اور الجزائر کے تجربہ کے بعد مصری حکومت اور اس

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اپریل ۱۹۹۶ء۔

کی حمایت کرنے والے مغربی ممالک خطرہ نہیں مول لینا چاہتے تھے، یہ ایک کھلی دھاندلی تھی اور آزادی رائے کی خلاف ورزی کہ اس پر خود مغربی ملکوں نے اور امریکہ نے بھی مصری حکومت کے اس رویہ کی مذمت کی، مصر، عراق وشام میں جو اشتراکیت کے زیر اثر رہ چکے ہیں عام طور پر اسی نوعیت کے الیکشن ہوتے ہیں، اور ان کا نتیجہ حکومت کے نمائندوں کے حق میں ۹۹ فیصدی سے بھی زائد ہوتا ہے، ان ملکوں میں کسی سیاسی پارٹی کے قیام کی اجازت نہیں ہوتی اور اس میں کسی مخالف گروپ کو کوئی رول ادا کرنے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں دی جاتی۔ حکمراں پارٹی کے اراکین بلا مقابلہ منتخب ہوتے ہیں یا محدود پیمانہ پر کچھ حزب اختلاف کے لوگ منتخب ہوجاتے ہیں ایسے نظام حکومت کو ڈیموکریٹک نظام یا متعدد پارٹی نظام سے تعبیر کرنا ہوگا کیونکہ اظہار رائے اور تنقید کی آزادی نہ دینے والا ہر نظام آمرانہ اور ظالمانہ ہوتا ہے یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ یہ عمل بعض ایسے ملکوں میں ہو رہا ہے جو اپنے ملک کو مغربی نظام کا پابند اور آزدائ رائے کا داعی اور ترقی پسند کہلاتے ہیں، اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ قدامت پسندی کے خلاف ہیں حالانکہ وہاں اظہار رائے اور تنقید کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔

ان میں سے کئی ملک مسلم اکثریت کے ملک ہیں، وہاں کے عوام ان جمہوری حقوق سے محروم ہیں اور مغربی ممالک ان حقوق کے سلب ہونے پر اس لئے خاموشی اختیار کرتے ہیں کہ وہ اسلام پسند عناصر سے خوفزدہ ہیں اور ان کو ان کے اقتدار میں آنے سے اپنے مفادات کے سلب ہونے یا محدود ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے، اور عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس آزادیٔ رائے کے سلب ہونے کی جانب توجہ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس کو ظالمانہ سیاست قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ مغربی ذرائع ابلاغ ہر صورت میں اسلامی رجحان کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے خوفزدہ کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور اسے وہ موجودہ زمانہ کا سب سے عظیم خطرہ خیال کرتے ہیں۔

انھیں مغربی ممالک اوران کے ذرائع ابلاغ نے الجزائر میں ''انقاذ پارٹی'' کی کامیابی پر بڑا ادھم مچایا تھا اوراس کے نتیجہ میں وہاں کا الیکشن کالعدم قرار دیا گیا جسکے بعد وہاں مسلسل خون خرابہ ہوا۔ ترکی کے الیکشن میں ''رفاہ پارٹی'' کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو اس پر مغربی ممالک اوران کے ذرائع ابلاغ نے بڑا واویلا مچایا اور پوری کوشش کی گئی کہ اس کی قیادت میں حکومت نہ بن سکے لیکن ترکوں نے سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور انھوں نے ترکی کے اندر الجزائر جیسی صورت حال پیدا کرنے کا موقع نہیں فراہم کیا، اس لئے انھوں نے اپنے ملک کو ایک عظیم سیاسی بحران اور قتل وغارت کے مہیب سایہ سے بچالیا۔ رفاہ پارٹی نے بھی کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ ایجابی طور پر حزب اختلاف کا رول اختیار کرلیا، اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں الیکشن کے بعد اسلامی تحریکوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا جو اس کے الیکشن میں شمولیت سے نہ ہوتا اور نہ ہی ذرائع ابلاغ اور تشہیر کے ذریعہ، ان کے اکثر قائدین اب تک جیلوں میں ہیں، عوام میں حکومت کے اس سلوک کے خلاف ناگواری پائی جاتی ہے، ڈیموکریٹک نظام حکومت کے زیر سایہ بسنے والے بخوبی واقف ہیں اور ظلم وجور اور حق چھیننے کی سیاست لوگوں کے جذباتی میلان کو حکمراں طبقے کے خلاف مظلومین کی جانب کھینچ لیتی ہے اوران کے دل خود بخود ستم رسیدہ لوگوں کی جانب مائل ہوجاتے ہیں اس کا تجربہ متعدد ملکوں میں ہو چکا ہے مثلاً سری لنکا میں ''بھنڈرانائکے'' کے قتل کے بعد ان کی بیوی کو الیکشن میں چنا گیا، پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو اسی ذہنیت سے فائدہ پہونچا، اور فلپائن میں ''اکینوں'' کو اسی نفسیات نے بلند منصب پر پہونچایا، یا ان کے شوہر کو ظالمانہ طور پر ''مارکوس'' کے زمانہ میں قتل کردیا گیا تھا، بنگلہ دیش میں بیگم خالدہ ضیاء کو قیادت اسی نفسیات سے حاصل ہوئی، اسی طرح بیگم حسینہ واجد کی عوامی لیگ اسی جذبہ کو اپنی مقبولیت کا ذریعہ بنایا، برما، چین میں بھی جو قائدین قید وبند کی زندگی گذار رہے ہیں

اگر وہاں آزادانہ الیکشن ہوں تو ان کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ان مظلوم پارٹیوں کو بھی عوامی تائید حاصل ہوتی ہے جن پارٹیوں کے حقوق چھین لئے گئے ہوں اور برابر ظلم کے نتیجہ میں عوام کا جذبۂ ہمدردی اور رحم وکرم ان کے ساتھ ہوتا ہے اس کا تجربہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں ہو چکا ہے، ایمرجنسی کا نفاذ حکومت وقت کے زوال کا سبب بنا، قیدیوں کی ایک بڑی تعداد عوام نے انتخاب کیا جب کہ حکومت نے انھیں الیکشنی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک رکھا تھا، اور ان پر پابندی عائد کر رکھی تھی، لیکن ان کے ورکروں نے ان پر ہو رہے حکام کے ظلم وستم اور سختی کو جب عوام کے دربار میں پیش کیا تو ان کے دل ان مظلوموں کے لئے نرم پڑ گئے، اور ان میں رحم کا جذبہ بیدار ہو گیا، صرف یہی نہیں بلکہ بعض مرتبہ یہی قیدی وزارت کے حصول یا الیکشن کے نتیجہ میں اہم عہدوں پر بھی فائز ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنی پارٹیوں کے لئے حکومت سازی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مصر کی اسلامی تحریکوں کو یہ ایک بہترین موقع ملا ہے جس میں وہ عوامی حلقوں یہاں تک کہ جیلوں کے اندر اپنی کارکردگی کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں البتہ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ خیر وصلاح کی جانب دعوت پر گامزن رہیں اور سنت یوسفی پر عمل کریں جیل بھی کام کرنے کے اچھے میدان ہیں۔ جس کا عملی ثبوت امریکا میں بعض اسلامی سوسائٹیوں نے جیل کے اندر پیش کیا خود مشہور باکسر ٹائیسن کی زندگی میں تبدیلی جیل میں عمل میں آئی، امریکی معاشرہ میں جرائم پیشہ عناصر کی حیثیت سے متعارف افراد کی زندگیاں یکسر بدل گئیں اور ان میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی جب کہ امریکی معاشرہ انھیں قبول کرنے اور ان کے ساتھ زندگی گذارنے سے خوف کھاتا تھا ان میں سے اکثر کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا اور پوری سوسائٹی اس طرح صلاح وفلاح کی جانب گامزن ہوئی کہ اب وہاں کے لوگ ان کے ساتھ رہنا باعث افتخار سمجھتے ہیں اور ان کے

معاشرہ کے اندر سکون واطمینان اور سعادت محسوس کرتے ہیں یہ بعض مسلمان تھے جن کی زندگی دوسروں کے لئے نیک فال اور ایک آئیڈیل ثابت ہوئی۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ معاشرہ کی اصلاح اور لوگوں میں نیکی کی اشاعت اور اسلام کی تعلیمات کے لئے ان کے میلان اور ان کے دلوں میں اسلام کے مذہب عدل ہونے کو جاگزیں کرنے نیز یہ اعتماد بحال کرنے کے لئے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو تمام موجودہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر سے غلط فہمی کو محض امن وامان اور حکومتی سطح کی کوشش نیز وسائل وذرائع ابلاغ دور کرسکتے ہیں؛ بلکہ اس کے لیے ان کے معاشرہ سے ربط وتعلق اور انسانی معاشرہ، حکومتی اداروں اور دیگر تمام لوگوں سے گفت وشنید اور ملاقات کرنا اور ان سے راہ راست بلکہ ان کے ذہنوں سے شکوک وشبہات دور کرنا ازبس ضروری ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ نے اسلامی تحریکوں کے سلسلہ میں شکوک وشبہات کا ایک جال پھیلا رکھا ہے اور دہشت گردی اور مغرب دشمنی سے اس کو جوڑ کر مزید شہ دیتے رہتے ہیں اور وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی تحریک سے وابستہ افراد کی پارلیمنٹ تک رسائی ملک کو پستی کی طرح لے جائے گی، یہ اپنے مفاد سے وابستہ ایک خاص قسم کا پروپیگنڈہ ہے جس کی بنا پر سامراجی ممالک ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پوری دنیا اور اسلامی ممالک پر اپنے تسلط اور ظالمانہ گرفت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اقتصادی اور دفاعی اور تجارتی معاہدوں کے ذریعہ یورپی خاندان کے نام سے تمام ترقی پذیر ممالک پر ان کا یہ شکنجہ پایا جاتا ہے مصر کے اسلام پسند قائدین کو جو سیاسی سرگرمیوں سے روک دیئے گئے ہیں اس ذمہ داری کو نبھانا چاہئے، اسی طرح ترکی کی پارٹی کے ذمہ داروں کو جو حکومتی ذمہ داریوں سے آزاد ہیں ذہنوں کے ان شکوک وشبہات کی تہوں کو دور کرنا چاہئے اور یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ان کا مقصد حکومت حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اصلاح

ہے، اور وہ عوام کے خیر خواہ ہیں، وہ سیاسی پارٹیوں کی طرح اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ہر جائز و ناجائز امر کو اپنانا پسند نہیں کرتے اس لئے کہ دعوت اسلام کے طریق کار، اس کے عمل کے کچھ حدود و قیود ہیں جن کا شاید ہی کوئی سیاسی پارٹی پاس ولحاظ رکھتی ہو۔

بنگلہ دیش کا گذشتہ الیکشن فرضی تھا اس میں حزب اختلاف شریک نہیں ہوا اب نئے سرے سے الیکشن کا اعلان ہوا ہے یہ الیکشن اگر آزاد نہ ہوئے تو عوام کی رائے کا اندازہ کیا جاسکے گا لیکن اسلام پسندوں کی ذمہ داری اور کام کی نوعیت دوسری سیاسی پارٹیوں سے مختلف ہے، انھیں اپنے پیغام کو پیش کرنے اور طرز عمل کو اختیار کرنے میں اپنے مذہب کی تعلیمات کا خیال رکھنا چاہئے، اور عوام میں اپنا حلقۂ اثر بڑھانا چاہئے جو انتخاب میں آنے سے زیادہ قیمتی اور نفع بخش ہے۔

روس کے الیکشن کے نتائج بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عوامی بیداری اور ذاتی شعور کے بدلنے میں اپنا اثر دکھا رہا ہے، ظلم اور غلامی کی سیاست جو تقریباً ستر سال سے جاری تھی اس کے تمام آثار اب مٹ چکے ہیں، ہر مخالف آواز کے خلاف سخت کارروائی کے باوجود لوگوں نے اس جابرانہ نظام کو رد کردیا آزادانہ الیکشن سے قبل ہی وہاں حکمراں جماعت اکثریت سے کامیاب ہوتی تھی، موقع ملتے ہی لوگ بھڑک اٹھے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو ظاہر کریں چنانچہ یہ نظام اپنے تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود پسپائی کا شکار ہوگیا اور کچھ ہی وقفہ کے بعد روسی عوام پر یہ بات آشکارا ہوگئی کہ جدید نظام ان کے امنگوں اور آرزوؤں پر پورا نہیں اترتا چنانچہ عوام نے نظام کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنی رائے کھل کر ظاہر کردی اور پارلیمانی الیکشن کے نتائج سے یہ بات واضح ہوگئی کہ لوگ اس سیاسی نظام سے خوش نہیں تھے۔

ان تمام نتائج سے یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ عوامی شعور غالب آکر رہتا ہے اور ظلم وزیادتی کے وسائل آزادی رائے کے راستہ میں زیادہ مدت تک حائل نہیں ہوسکتے۔

جمہوریت، سیکولرزم اور ترقی پسندی کے دوہرے پیمانے (☆)

مغربی میڈیا کی جانب سے بار بار عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ترکی فوج اور وزیر اعظم نجم الدین اربکان کی مخلوط حکومت کے مابین مخالفت چل رہی ہے اور دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔

حال ہی میں جریدہ ''اکنومسٹ'' نے یہ خبر شائع کی ہے کہ فوج نے وزیر اعظم نجم الدین اربکان اور ان کی وفاقی حکومت کو آگاہی دی ہے کہ اگر حکومت نے اسلامی احکامات نافذ کرنے کی کوشش کی خصوصاً عورتوں کو پردہ کا حکم دیا تو وہ ان سے علیٰحدگی اختیار کرلیں گی، کیوں کہ فوج کو جو کمال اتاترک کی ذہنیت کی حامل اور ان کی فکر کی ہم نوا ہے اسلامی احکام کا تسلط وغلبہ منظور نہیں، میگزین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام پسند اور سیکولر پسند افراد کے مابین بعض مقامات میں کشیدگی بھی پائی جاتی ہے اور جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔

حکومت اربکان اور اسلامی ممالک کے مابین دوستی کے تعلقات کو اور سرکاری آفسوں میں نماز کے لئے چھٹی کو خطرناک رجحان قرار دیا ہے، ساتھ ہی ماہِ رمضان میں حکومت کی طرف سے افطار پارٹی پر سخت نکتہ چینی کی اور لکھا ہے کہ اس قضیہ کو پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا، اور بعض قائدین نے احتجاج کیا اور اس کو سیکولر مخالف عمل قرار دیا۔

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اپریل ۱۹۹۷ء۔

سیکولر پسند اور اسلامی ذہن رکھنے والوں کے مابین یہ فرضی وتصوراتی کشمکش اس وقت مغربی میڈیا کا خاص موضوع بنی ہوئی ہے جو حکومت کی مخالفت و مذمت میں کسی لیڈر کے معمولی بیان کو بھی بڑھیا چڑھا کر پیش کرتا ہے جب کہ حکومت طریقۂ کار اور لائحہ عمل کے نفاذ میں بہت ہی احتیاط، زیرکی اور دانشمندی کا ثبوت دے رہی ہے اور وہ کبھی بھی عوام کی مخالفت اور اپنے خلاف کسی قسم کے ردعمل کے اظہار کے مواقع فراہم نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ دو مختلف پارٹیوں کے مابین ابھی تعلقات استوار ہیں۔

ترکی کے حالیہ وزیراعظم نجم الدین اربکان جن کی سیاسی زندگی بہت زیادہ معقول ومتوازن رہی ہے، انھوں نے وزارت، فوج اور حکومت کے دو گروپوں کے مابین تعلقات قائم کئے، اور ملک کی سلامتی واستحکام کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کیا چنانچہ ان کے عہد حکومت میں ملک کی اقتصادی حالت میں بہت کچھ سدھار پیدا ہوا اور ترک اور کردوں کے مابین اختلافات بھی کم ہوئے۔

وزیراعظم نجم الدین اربکان اپنے اس نقطۂ نظر اور طریقۂ اعتدال میں بہت زیادہ تعریف کے مستحق ہیں اگر ان کے اس طریقۂ کار کی حمایت کی جاتی اور اس کو عملی جامہ پہنایا جاتا تو اسلام پسند اور سیکولر مزاج کے مابین کشمکش کے نتیجے میں جن مسائل سے پورا عالم اسلام دوچار ہے، ان کا خاتمہ ہوسکتا تھا اور اس سے سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے یورپ کو بھی فائدہ پہنچتا، کیوں کہ یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ اسلامی رجحان وفکر کی مخالفت کی بنا پر یورپ کو زبردست نقصان پہونچ رہا ہے اور اس سے مسلم قوم کی دشمنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یورپ شخصی واجتماعی آزادی کا داعی ہے اور خود کو اس آزادی کا علمبردار تصور کرتا ہے جب اسلامی دنیا میں کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے اس نقطۂ نظر کے برخلاف مخالفانہ رویہ اختیار کرلیتا ہے، وہ خود اسکا داعی ہے کہ داخلی

معاملات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ ہونی چاہئے، لیکن دوسروں کے داخلی مسئلوں میں دخل اندازی کو وہ اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے اور اس کے لئے وہ وجہ جواز بھی پیش کرتا ہے، جب بھی اسلامی ممالک میں سے کسی ملک میں کوئی مسئلہ اٹھتا ہے، یورپ مداخلت ضروری سمجھتا ہے، خواہ یہ قضیہ قوم کے فوجی رہنماؤں کی جانب سے ہو، جن کی ساخت پرداخت یورپی ممالک میں ہوئی ہے یا ان بعض سیاسی لیڈروں کے ذریعہ جو غیر قانونی اختیارات کو استعمال کرکے ان مسائل میں مداخلت کرتے ہیں اور یورپی مصالح ومفاد کی خاطر قانون شکنی اور اس کی پامالی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

ترکی اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لئے یورپی ممالک سیکولر قانون کا سہارا لیتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں عالمی جنگ کے بعد ترکی کے مسائل اور سخت ترین حالات پر قابو پانے کے لئے کمال اتاترک نے جو اصول وقوانین نافذ کئے تھے، ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ قانون یورپی برادری کی نگاہ میں اتنے مقدس ہوگئے ہیں کہ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود ان میں وہ کسی قسم کی تبدیلی کے روادار نہیں جب کہ عالمی سطح پر قوانین میں نمایاں تبدیلیاں ہوچکی ہیں، اور مختلف ملکوں میں رد وبدل ہوتا رہتا ہے، یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں حالات بالکل بدل چکے ہیں لیکن ان کے نزدیک کمال کے نافذ کردہ قوانین اور جمہوریت آسمانی مذاہب سے بھی زیادہ تقدس رکھتے ہیں، ان کے نزدیک آسمانی مذاہب تو قابل اصلاح ہیں اور اسکی اصلاح کی آواز اٹھائی جاتی رہی ہے، لیکن اس دستور کے تقدس کا حال یہ ہے کہ دستوری طور پر ترکی کی نومنتخب حکومت بھی اس کے کسی دفعہ کی کوئی نئی تشریح کرنے کی جرأت نہیں کرتی چہ جائے کہ اس میں کوئی تبدیلی کرے۔

ترکی کی نئی صورت حال کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کا موقف دوسرے ممالک کے سلسلہ میں اس کے موقف سے مختلف ومتضاد ہے، یہ تعارض وتضاد

اس صلیبی ذہنیت کی دین ہے جس کا عالمی جنگ کے بعد سے ترکی کے مسائل سے نپٹنے میں بہت ہی مؤثر کردار رہا ہے، بظاہر یورپی برادری میں آج بھی یہ فکر کام کر رہی ہے اور آئندہ بھی اس کے باقی رہنے کا پورا امکان ہے۔

حال ہی میں برطانیہ وامریکا کے چند مفکرین کے جائزے وتبصرے شائع ہوئے ہیں جن میں اسلامی تحریکوں سے مقابلہ آرائی کی پالیسی پر نظر ثانی کی دعوت دی گئی ہے، کیونکہ اس پالیسی سے اسلامی تحریکوں کو تقویت پہونچتی ہے، اور اس کے دائرہ کار میں ترقی ہو رہی ہے اور یورپی ممالک سے مسلم قوم کی ناپسندیدگی بڑھ گئی، اس کے برخلاف اسلامی تحریکوں سے مقابلہ آرائی اور اس کے خلاف زہر اگلنے والے ممالک تنگی میں پڑے ہوئے ہیں، چنانچہ ان مفکرین نے مقابلہ آرائی کی اس پالیسی کو ختم کر کے مصالحت کی دعوت دی ہے اور اسلامی ممالک میں اسلام کی جانب مائل اکثریت کی رائے کے احترام کی اپیل کی ہے ان مفکرین نے تہذیب کے مابین کشمکش کے تصور کو اس خیال سے ترک کر دیا ہے کہ یہ سامراجی نظریہ ہے جو قدیم ومتروک ہو چکا ہے، ان کے نزدیک اسلامی اقوام کی مخالفت کا موقف مستقبل میں اقتصادی اور تجارتی مقاصد میں نظر انداز ہوگا۔

ترکی وہ واحد ملک نہیں یورپ کی دوہری سیاست وپالیسی کام کر رہی ہو بلکہ ماضی میں الجزائر بھی اس طرح کی سیاست کا شکار رہا ہے، اور آج بھی اسلامی رجحان کے خاتمہ کے لئے جو کہ عوامی رجحان بن چکا ہے عالم اسلام کے دوسرے ممالک پر اس کا دباؤ پڑ رہا ہے بلکہ اب تو اسلام کے عناد کے باعث براہ راست عبادت گاہوں پر حملہ ہو رہا ہے یہ عناصر اس بات کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ مسلمان ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے دین کے معاملہ میں اسے معمولی نقصان بھی برداشت نہیں، دین ومذہب پر اس کی غیرت وحمیت اس درجہ عیاں ہے کہ اس میدان میں اس کا کوئی ثانی

نہیں، اس کے احساس وشعور کے ادراک میں بہت سی قوموں نے غلطی کی جس کی وجہ سے انہیں غیر معمولی نقصان اٹھانا پڑا۔

اسلامی دنیا میں یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ سیکولر کا نعرہ صرف اسلام کے مقابلہ میں لگایا جارہا ہے، دوسری قومیں جو سیکولرزم کو اختیار کرتی ہیں مذہبی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں اور ان پر دینی وفکری چھاپ نمایاں ہے جس کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے، اسی طرح ترقی وتجدد کا آوازہ اسلام کے خلاف ہی بلند کیا جاتا ہے اور اسے اسلامی تعلیم وثقافت سے متصادم سمجھا جاتا ہے جب کہ ان کے نزدیک غیر اسلامی قوموں کی ترقی ان کی موروثی ثقافت سے کبھی بھی متصادم نہیں رہی اور نہ ہی ان کی قدیم تاریخ معارض پائی جاتی ہے، بلکہ ان میں اپنے ثقافتی سرمایہ کی حفاظت اپنی قدیم تاریخ کو زندہ کرنے اور تقدس کی چیزوں کو باقی رکھنے کی مسلسل کوشش ہوتی ہے اور اسے عین ترقی کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اسلامی ممالک کی ترقی کو رجعت پسندی قرار دیا جاتا ہے، ان کے لیے جمود وپسماندگی کو قبول کیا جاتا ہے، ان کے اندر محض ثقافتی مظاہرہ اور اخلاقی انارکی کو ہی ترقی وترویج کا ذریعہ بتایا جاتا ہے اور علمی، ٹیکنالوجی اور اقتصادی ترقیوں میں ان پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، اور ان میدانوں میں ان کی پیش رفت خطرہ سمجھی جاتی یہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے علمی وٹیکنالوجی ادارے اب بھی سامراجی دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

واضح رہے کہ خود یورپ اب سیکولر مزاج نہیں رہا، اس لیے کہ نصرانیت اور یہودیت سے اس کی یکطرفہ جانبداری اور وابستگی کھل کر سامنے آچکی ہے اور عالمی مسائل کے حل میں بہت سے مواقع پر اس کی طرف سے اس کا اظہار بھی ہوا ہے، اس طرح عیسائی مشینریوں میں یورپی ممالک کی علمی طور پر شرکت اور مستشرقین کے پلان ومنصوبوں میں ان کی پشت پناہی بھی اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی، اس سے پتہ چلتا

ہے کہ اسلام سے یورپ کی مخالفت و جنگ سیکولر بنیادوں پر نہیں بلکہ اسلام دشمنی پر مبنی ہے جو اسے اپنی سابقہ نسلوں سے وراثت میں ملی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ اسلامی ممالک کی اقتصادی و صنعتی ترقی کی راہ میں حائل ہو رہا ہے اور بلاضرورت وہ ان پر پابندیاں عائد کر رہا ہے اور انھیں اپنے یورپی ممالک کا ہمیشہ دست نگر بنے رہنے پر مجبور کر رہا ہے، یہ یورپ کی ایسی پالیسی ہے جس کی وجہ سے کوئی اسلامی ملک کبھی بھی صنعتی ترقی نہیں کر سکتا بلکہ یورپ کے ہمنوا ممالک بھی اقتصادی بدحالی اور صنعت و حرفت کی درماندگی کا شکار ہو سکتے ہیں، اس سے نہ تو ترکی مستثنیٰ ہے اور نہ ہی عرب ممالک، جنھوں نے دو صدیوں سے یورپ کی پیروی کو اپنا وطیرہ بنایا ہے اور اس کی سربراہی و تسلط کو تسلیم کر رکھا ہے۔

سیکولرزم کا متضاد مفہوم (☆)

سیکولرزم کے لغوی معنیٰ لادینی یا بے دینی کے ہیں، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں لکھا ہے ''سیکولرزم ایک معاشرتی اور سماجی تحریک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عالم آخرت سے لوگوں کا رشتہ کاٹ کر اس دنیا سے جوڑ دیا جائے، یورپ کا عہدِ تاریک کلیسا کے تسلط کا دور تھا، مسیحیت عزلت نشینی، دنیا بیزاری اور فکر آخرت سے عبارت تھی، آزاد مطالعہ اس میں شجر ممنونہ کی حیثیت رکھتا تھا، حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد یورپ کی ساری علمی اور فکری کاوشیں ختم ہوگئیں، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ دین سے بغاوت کا رجحان پیدا ہونے لگا اور ترقی کے دور میں جب علم عام ہوگیا، تعلیم یافتہ طبقہ آزاد مطالعہ کی طرف مائل ہوا اور خدمت انسانیت، تمدنی ترقی اور بحث و تحقیق کا جذبہ عام ہو، اتو دین کو یا تو ترک کر دیا گیا یا اس کو محدود کر دیا گیا، زندگی اور ضروریات زندگی پر خصوصی توجہ مبذول کی گئی، دین کے حاملین نے بیسویں صدی کے نصف اخیر میں اس خطرہ کو محسوس کیا تو انھوں نے دونوں کو جوڑنے کی کوشش کی تاکہ عبادت و ریاضت اور فکر آخرت کے ساتھ دنیوی معاملات سے بھی دلچسپی لی جاسکے، بایں طور کہ گرجا کی قدروں کا احترام بھی دل میں رہے اور اپنی اور اپنے سماج کی بھی مادی طور پر خدمت کی جاسکے، ۱۹۴۷ء میں ویٹی کن سٹی نے اس بات پر موافقت ظاہر کی کہ مسیحی اپنی دینی اور دنیاوی زندگی کی گاڑی کو ایک ساتھ چلا سکتے ہیں، ۱۹۶۵ء میں اس کی ایک کمیٹی نے سیکولرزم اداروں سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ تغیر پذیر دنیا کے دوش بدوش چلنے کے ساتھ ساتھ اس کے دینی اصول کے تحفظ کا خیال رکھا جائے۔

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر نومبر ۱۹۹۷ء۔

آکسفورڈ ڈکشنری نے سیکولرزم کی تعریف اس طرح کی ہے: ''اخلاق اور تعلیم کی بنیاد دین و مذہب پر نہیں ہونا چاہئے، یعنی دین و مذہب کو عام زندگی سے کوئی ربط اور تعلق نہیں؛ بلکہ اس کی حیثیت صرف ایک شخصی اور ذاتی مسئلہ کی ہے۔

اس تمہید سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیکولرزم کلیسا کے تسلط اور اس کے علم دشمن رویے کا ایک لازمی ردعمل ہے اور یورپ میں دین اور دنیا کی کشمکش کا ایک حل ہے، قرون مظلمہ میں کلیسا نے آزادی کے تمام دروازے بند کردیے تھے اور دین کے دعویدار اقتدار پر قابض تھے، وہ جس کے حق میں چاہتے محرومی و ناکامی کا فیصلہ سنادیتے اور جسے چاہتے مغفرت و بخشش کا پروانہ تھما دیتے، یورپ کو ایک عرصۂ دراز تک کلیسا کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد محکمۂ تفتیش کے ظلم و ستم کی چکی میں گھن کی طرح پس گئے اور ان کی قساوت قلبی اور سنگدلی کا شکار ہوگئے، قطع نظر ان سے جو قید خانوں کے اندر ہمیشہ کے لیے گم ہوگئے، اس لیے ترقی کے دور میں مفکرین و مدبرین کو حکومت سے علاحدہ کردینے کا فیصلہ کیا اور کلیسا کے اقتدار کو اس کی چہار دیواری تک محدود و مقید کردیا۔

امریکی مصنف ''ولیم فائیکار'' کا خیال ہے کہ دین کو حکومت سے بے دخل کرنے میں دراصل یہودیوں کا ہاتھ ہے، جس سے ان کی غرض یہ ہے کہ دین کا وجود ہی ختم کردیا جائے جس کو انھوں نے معاشرے اور سماج سے الگ کرکے بری طرح خرد برد کا شکار کردیا اور کلیسا کی چہار دیواری میں بند کردیا، قرون مظلمہ میں زمام اقتدار سنبھالنے سے قبل یورپ میں مسیحیت کی حیثیت صرف ایسے رہبانی نظام کی تھی جس کے پاس زندگی کے لیے کوئی قانون اور نظام نہیں تھا، چہ جائیکہ اس کی حیثیت کسی حکومت اور کامل شریعت کی ہوتی، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ روحانی کامیابی حاصل کی جائے، دین، دین والوں کے لیے اور دنیا کو دنیا والوں کے لیے

چھوڑ دیا جائے، اس کا پیغام صرف عالم بالا سے متعلق رہ گیا جس کا نیچے کی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تاریک صدیوں میں کلیسا نے روحانی پیغام اور آسمانی نظام سے تجاوز کر کے ملکی اور زمینی حکومت واقتدار پر قبضہ جمایا اور دنیا پر اس رہبانی دین کی عظمت واحترام کا سکہ بٹھانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدنی انحطاط وزوال شروع ہو گیا، روشن دور کے اول مرحلہ میں اس جمود وتعطل اور کلیسا کے ظلم وستم کے مقابلہ کے لیے اس کے اقتدار کے خلاف دین بیزاری کا رجحان پیدا ہوا جس کی بنیاد علم وعقل اور خالص تجرباتی امور پر قائم تھی، اس علمی ذہن نے دین ومذہب کی جگہ اختیار کر لی، کلیسا اپنے سابق دائرے میں سمٹ کر محدود ہو گیا۔

سیکولرزم نظریہ کے پس منظر کو جاننے کے لیے حسب ذیل محرکات کو نظر میں رکھنا چاہئے:۔

(۱) علم اور ارباب علم کے تعلق سے کلیسا کا جور وستم اور حکومت پر اس کا تسلط۔

(۲) عقل ونیچر کے اصول کا ظہور، آزادی، عقل ورائے کی دعوت اور نیچر کو معبود برحق قرار دینا۔

(۳) ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب، سب سے پہلی غیر مذہبی حکومت کا قیام جس میں عوام الناس کو حکومت میں حصہ لینے کا حق دیا گیا اور اس کی بنیاد وطن کی شہریت کو قرار دیا گیا۔

(۴) اس انقلاب کے بعد آزادیٔ رائے عام ہوئی اور آزاد خیال اہل قلم پیدا ہوئے۔

(۵) روسو اور وولٹیر جو آزاد خیالی کے بڑے حامی ہیں ''سیاسی عدالت'' کا مصنف ''ویم جودین'' جو سیکولرزم کے داعیوں اور حامیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۶) ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، یہ ایسا نظریہ ہے جو دینی عقائد اور اخلاق واقدار کے زوال وانحطاط کا سبب بنا۔

(۷) سپر مین (Superman) کا نظریہ پیش کرنے والا ''نیتشہ'' جس نے دعویٰ کیا تھا کہ معبود مر چکا ہے، اب کوئی معبود نہیں۔

(۸) دور کائم یہودی جس نے انسان کو حیوانیت و مادیت کا مجموعہ بنا دیا۔

(۹) فرائڈ یہودی جس کی نظر میں انسان ایک جنس پرست حیوان ہے۔

(۱۰) جون پال سارٹر (وجودیت) الحاد ولا دینیت کا داعی۔

دین انسان کے لیے تربیت اور باطنی مشق ہے یا حکومت ومملکت اور مادے اور مادے کے شرور وفتن سے دلوں کے لیے صفائی اور پاکیزگی ہے، اور لوگوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کا مناسب ذریعہ ہے، اسی محدود تصور کی وجہ سے بعض لوگوں نے اسلام کو دین کے دائرے سے باہر کر دیا، اس لیے کہ اسلام معاملات وتعلقات کے متعلق بھی رہنمائی کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام کے تعبدی نظام کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے اسلام کو دنیوی امور سے خارج کر دیا، یہ دین اور دنیا کے مخصوص تصور کا نتیجہ ہے۔

جامع ازہر کے فاضل علی عبدالرزاق پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغرب کے اس محدود تصور کو قبول کر کے اپنی کتاب ''اسلام اور اصول حکومت'' میں لکھا کہ اسلام محض دین ہے اس کا کوئی نظام حکومت نہیں۔

اس کتاب میں صرف یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام صرف ایک دین ہے، مسلمانوں کے درمیان اس کا جو پیغام وحدت ہے، وہ ایک دینی پیغام سے زیادہ نہیں، حکومت ومملکت، عام معاملات وتعلقات اور سیاسی امور کے سلسلہ میں اس کے پاس کوئی پیغام نہیں، اس مغرب زدہ مصنف نے روحانی ولایت اور مادی ولایت کے درمیان فرق دکھانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ رسول کو اس کی امت پر جو ولایت حاصل ہوتی ہے وہ روحانی ہوتی ہے جس کا منشا یہ ہوتا

ہے کہ دل جوہر ایمان سے معمور اور اعضاء و جوارح جذبہ انقیاد و تسلیم سے مخمور ہو جائیں۔

حاکم و بادشاہ کو جو ولایت حاصل ہوتی ہے وہ مادی ہوتی ہے جس میں اعضاء و جوارح جھکتے ہیں؛ لیکن ان کا دل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس میں ذات خداوندی کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے اور اس میں انسانی آبادی اور مسائل زندگی سے بحث کی جاتی ہے، اول الذکر کا مطمح نظر دین ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا مقصد دنیا، وہ اللہ کے لیے بلاتا ہے اور یہ دنیا کے لیے، وہ دینی قیادت ہے اور یہ سیاسی لیڈر شپ، جہاں دین و حکومت کی سرحدیں نہیں مل سکتیں بلکہ دونوں کا اپنا الگ راستہ ہے۔

سیاسی تحریکات ونظریات اور دینی واصلاحی تحریکات میں مقصد اور وسائل کا فرق (☆)

موجودہ عہد کی سیاسی تحریکات اور نظریات کا اصل مقصد عوامی تائید کا حصول اور اقتدار یا غلبہ حاصل کرنا ہے، اس لیے وہ ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ استعمال کرتی ہیں جن سے یہ مقصد حاصل ہو، اس میں پروپگنڈہ کو کلیدی اہمیت حاصل ہے، اس پروپگنڈہ میں سچائی اور حقیقت کا التزام ضروری نہیں ہوتا۔ کسی دعوت یا تحریک کی تائید یا اس کی مخالفت کے لئے یہ سب سے زیادہ مؤثر اور سودمند ذریعہ ہے، اس ذریعہ کے حصول کے لئے مالی وسائل کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے اس زمانہ میں پروپگنڈہ ایک سودمند تجارت ہے، اس کے لیے ایجنسیاں اور کمپنیاں قائم ہیں، جو مناسب اجرت پر پروپگنڈہ میٹریل تیار کرتی ہیں جو اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی، پوسٹروں اور فلموں میں اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، یہ پروپگنڈہ کا ذریعہ اشخاص کے لئے اور مصنوعات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ ایجابی سے زیادہ سلبی ہوتا ہے، بعض وقت اپنی ذات یا اپنی پسندیدہ ذات یا اپنے مالی یا اپنے پسندیدہ مال کی تعریف میں مبالغہ کے ساتھ ساتھ دوسری ذات یا دوسرے مال کی تنقیص پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں زبان وقلم کا فکر وذہن سے اتفاق ضروری نہیں، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس نظام سے انتساب رکھتا ہو جس کی طرف وہ دعوت دیتا ہے، یا اس سے اختلاف رکھتا ہے

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رمئی ۱۹۹۸ء۔

جس کے خلاف وہ طاقت صرف کر رہا ہے اس لئے کہ مقصود صرف مادی فائدہ ہے۔ جو کسی بھی نظریہ یا نظام کی تائید یا دوسرے نظام و مسلک کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا مالی منفعت حاصل کرنے والے بسا اوقات مختلف نظریات اختیار کرتے رہتے ہیں اور اپنی حقیقت میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں، وہ صرف پارٹیاں ہی نہیں بدلتے، بلکہ نظریات بھی بدلتے ہیں گویا نظریات کوئی لباس ہے جو وقتاً فوقتاً بدلا جانا ضروری ہے یا فیشن ہے جس میں تبدیلی آتی رہتی ہے، اور پروپگنڈہ کے وسائل سے اس کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں جس سے ان کا عیب ہنر بن جائے، اور دوسروں کے ہنر عیب۔

مالی فوائد کے حصول کی وجہ سے اس کی تاثیر میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے اور عوام وخواص میں اس سے دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے، ان وسائل کی رسائی اس مقام تک ہوتی ہے جہاں تلوار کی رسائی ناممکن ہے، چنانچہ آج پروپگنڈہ سودمند پیشہ بن گیا ہے اور تمام نظریات وافکار اور تنظیمیں، افکار کی درستگی وصفائی، اپنے مقصد کی براری، اپنے گروہ کی سلامتی اور اپنے فرزندوں کی تربیت سے کہیں زیادہ پروپگنڈہ پر انحصار کرتی ہیں، اور انہیں ایسے افراد کی ضرورت پیش آتی ہے جو دوسروں کے پروپگنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پروپگنڈہ کا کام بحسن وخوبی سرانجام دے سکیں۔

موجودہ دور کے پروپگنڈہ کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ اپنے فضائل کے بجائے دوسرے کے نقائص بیان کیے جائیں تاکہ ان کو اپنے دفاع پر مجبور کیا جائے۔ اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام نہ دے سکیں، یا ان کو عوام کی نگاہ میں مطعون کر دیا جائے، یا ان کو خوف زدہ کر کے اپنا ہم نوا بنا لیا جائے۔

پہلی شکل فکری اغوا ہے جو انسان کو اپنی رائے وافکار اور تصورات سے دوسرے افکار ورائے کی طرف منتقل کرنے کا نام ہے، اور یہ موجودہ بیان کے مطابق کبھی مال کی لالچ دلا کر، کبھی جسمانی ایذاء کی دھمکی سے اور کبھی کسی تہمت کے خوف

سے انجام پاتا ہے اور یہ کام اس وقت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے ایک مفکر یا رہنما مخالف افکار اختیار کر لیتا ہے، یا پارٹی بدل لیتا ہے، اور نئے افکار کا اسی طرح داعی بن جاتا ہے جیسے وہ کل دوسرے فکر کا داعی نہ تھا، اور اگر وہ شخص کسی لالچ یا خوف سے خاموش کر دیا جائے تو ایک قسم کا فکری قتل ہے جس کی مثالیں اکثر سامنے آتی ہیں، یہ عملی قتل سے کم اہم نہیں ہے، عملی قتل میں ردعمل ہوتا ہے فکری قتل میں ردعمل نہیں پیدا ہوتا۔

فکری قتل سیاسی اور طبعی دونوں طرح کا ہوتا ہے، فطری اور طبعی قتل جسمانی طور پر خاتمہ کا نام ہے اور سیاسی قتل میں انسانی تشخص کو داغدار کیا جاتا ہے، پھر اس کو اس طرح تبدیل کر دیا جاتا ہے، کہ اس سے اصلی شخصیت کے خدوخال ماند پڑ جاتے ہیں، اور یہ بھی کسی بڑے منصب کی لالچ دلانے سے، یا کوئی ذمہ داری اس کے سپرد کرنے سے، یا وزارت میں اس کو شریک کرنے سے، یا پارلیمنٹ کا رکن بنانے سے، یا کسی اہم عہدہ کو اس کے سپرد کرنے سے ہوتا ہے۔

اغوا چاہے فکری ہو یا عملی، اور قتل سیاسی ہو یا فطری، اس کا سامنا انھیں کو ہوتا ہے جو مخصوص افکار و عقائد رکھتے ہیں، جہاں تک افکار کو تجارتی پیشہ کے طور پر اختیار کرنے کا سوال ہے تو اس کا شکار وہ بھی ہوتا ہے جو ٹھوس افکار نہ رکھتا ہو بلکہ موقع پرستی کے پیش نظر افکار کو بدلتا رہتا ہو اور دشمن سے دوست کی طرف مائل ہوتا ہو اور کبھی حمایتی بننے کے بجائے مخالف بن جاتا ہو اور اس کا اصل و بنیادی مقصد مادی وسائل اور مواقع سے فائدہ اٹھانا ہے، اور ان کی آمدنی روز افزوں ترقی کرتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت ایجنٹوں اور دلالوں کی ہے یا تجارتی مال کہ آج کل علم و ثقافت اور زبان و قلم پر قدرت بہترین کمائی کا ذریعہ ہے۔

اور اس نظریہ کا مادہ پرستوں، خدا بیزاروں اور اباحیت کے علمبرداروں کے اندر پایا جانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ طبعی چیز ہے اور ان پیشہ وروں سے کسی دوسری چیز کی

توقع نہیں کی جاسکتی، اور اس طرح کے لوگ ہر ملک اور زمانہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔

اور زمانہ میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس طریقہ کو با اصول یا اصول کے داعی اور اخلاق کو پسند کرنے والے اختیار کریں یعنی شخصیت سازی سے زیادہ کردار کشی اور اس میں صدق وکذب کی عدم رعایت شخصیات کو مجروح کرنے کی کوشش میں اچھے برے کی عدم تمیز اور صدق وکذب کی رعایت کے بغیر معاونین کی خدمات کا حصول، صلاح وغیر صلاح کی رعایت کے بغیر وفاداریوں کی تبدیلی اور نظریات میں تزلزل، مفاد کے اعتبار سے حق وناحق کی رعایت کئے بغیر یہ رجحانات جو مفاد پرست تحریکات اور ان کے حاملین میں عام ہیں اگر اصلاحی اور دینی تحریکوں اور ان کے حاملین میں سرایت کر جائیں تو کسی خیر کی امید نہیں کی جاسکتی۔ ان رجحانات سے دینی واصلاحی عمارت قائم نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے کہ جو نتائج اصلاحی تحریکات کے قائدین کے پیش نظر ہیں وہ بغیر اصلاح نفس کے حاصل نہیں ہوسکتے، اخلاق اور دین میں مقاصد اور وسائل میں مناسبت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت اصلاحی تحریکوں میں ٹکراؤ اور ان کے قائدین میں ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے اس لئے کہ یہ طریقہ بغض وحسد کی آگ کو بھڑکاتا ہے، مسائل اور کشمکش پیدا کرتا ہے، عمومی طور پر قیادتوں سے اعتماد کو زائل کرتا ہے، اور مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کو پھیلاتا ہے پھر اس سے اسلامی تحریکوں کا اثر ونفوذ پامال ہوجاتا ہے۔

یہ خطرناک رجحان جو سیاسی جماعتوں میں پایا جاتا تھا اب اصلاحی اور دینی تحریکات میں پایا جانے لگا ہے، ان میں وہی طریقے اپنائے جارہے ہیں جو مادی دعوتوں وطریقوں میں اختیار کئے جاتے ہیں، اصلاحی جماعتوں اور تحریکوں میں دینی منہج کی پابندی کم ہورہی ہے، جو جماعتیں حالات کو تبدیل کرنے، اور لوگوں کو مادیت سے نکال کر روحانیت کی طرف بلانے کی دعوت دے رہی ہیں وہ خود مادی وسائل کو

اختیار کرنے اور مادی طریقوں کو اپنانے میں لگی ہیں، پروپگنڈہ پر زیادہ اعتماد، مقاصد کے حصول میں صحیح وسائل کے استعمال سے غفلت، رائے قائم کرنے یا اظہار کرنے میں حسن ظن، اور صدق بیانی سے بے اعتنائی، ذاتیت یا حزبیت کا غلبہ، اور انفرادی مصلحت کو جماعت کی خوبیوں سے انکار، بلکہ اس کے خلاف افترا کی حد تک بدگمانی، اور اظہار خیال یہ طرز عمل سیاسی جماعتوں کے لئے ہوتو ہو، اصلاحی اور دینی کاموں میں کسی حال میں مفید نہیں ہوسکتا۔

یہ مزاج دینی کام کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا، بلکہ اصلاحی کام کی طبیعت کے لے نہ یہ کہ موافق نہیں ہے بلکہ تخریبی ہے اس لئے کہ اسلامی کام خدا سے تعلق، آخرت کے اجر کی طلب، خدا کی رضامندی اور سلف صالحین کے طریقہ کی اتباع لازم کرتا ہے، اس میں حسن نیت، حسن ظن اور حسن عمل ضروری ہیاور مادی تحریکوں کا مزاج اس کے خلاف ہے، وقل اعملوا وسیری الله عملکم ورسوله۔

کمزور ممالک پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک نیا ہتھیار (☆)

ایک صدی سے زیادہ مدت تک دنیا پر قابض رہنے والی سامراجی طاقتوں کے زوال کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے آپ کو مغربی سامراج اور مسیحیت کا محافظ سمجھتا ہے اور وہ خود اس سامراج کا وارث ہے، جس نے مغربی تہذیب اور اس کی قومی برتری، اور مسیحیت یا لادینیت کی سرپرستی کی، اور دوسری قوموں کی تہذیب وتمدن اور ادیان ومذاہب کو مٹا کر یا بگاڑ کر ماتحت اقوام وملل کے تشخص کو یکسر بدل دینے کے لئے سارے وسائل استعمال کئے تاکہ ان کا رشتہ اپنے ماضی سے کٹ جائے، اور وہ مغرب کی غلامی میں پوری طرح داخل ہو جائیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ممالک اپنے عقائد، رسم ورواج، اور زبان وادب اور اپنے قومی تشخصات کو بحال کرنے کی فکر کر رہے تھے، اپنے قابل فخر علوم وفنون اور دیگر قومی سرمایہ کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے کوشش کر رہے تھے، وہ دونوں کیمپوں، مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونسٹ بلاک سے الگ رہتے ہوئے اپنی اس قومی جدوجہد میں مصروف تھے، کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مابین مفادات کی رسہ کشی ان ممالک کے لئے غیر جانبدارانہ (ناوابستہ) پالیسی اختیار کرنے میں ممد اور معاون ثابت ہو رہی تھی، اور یہ رسہ کشی دراصل دنیا کے کمزور ممالک کے داخلی امور میں ان دونوں طاقتوں میں کسی ایک کی عدم مداخلت کی ضمانت وگارنٹی تھی، لیکن روسی بلاک کا شیرازہ بکھر گیا اور امریکہ کے لیے پورا میدان خالی ہو گیا کہ وہ کمزور ممالک پر اپنے رعب

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/اگست ۱۹۹۸ء۔

ودبدبہ کا سکہ بٹھائے اوران ممالک کو اپنے کنٹرول میں لے لے جو اپنے وسائل، اپنی قومی غیرت وحمیت کی حفاظت اور فروغ میں صرف کررہے ہیں، اور جو اس کے سامراجانہ مقاصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

امریکہ نے دوسرے ممالک کے داخلی امور میں مداخلت کے کئی قانونی جواز تلاش کئے، یہ جواز کہیں اصولیت (Fundametalism) کی شکل میں، کہیں اقتصادی بدحالی کی شکل میں، کہیں سیاسی کشمکش اور کہیں انسانی حقوق اور حریت رائے کی شکل میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ امریکہ اکثر نام نہاد اقتصادی بحران کو بنیاد بنا کر مداخلت کا بہانہ تلاش کرتا ہے، پھر امریکہ کی خدمت کرنے والا یہودی میڈیا اس ملک کے بارے میں ایسی رپورٹوں کی اشاعت کرتا ہے جس سے رائے عامہ تیار ہو، جس کا آخری شکار انڈونیشیا ہے، ملیشیا کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کی کوشش کی گئی اور مدت تک عالمی میڈیا میں وہ اقتصادی تجزیہ کا موضوع بنا رہا لیکن ملیشیا نے اپنے کو اس خطرہ سے نکالنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا، فوری طور پر وہ بحران ٹل گیا جس کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انڈونیشیا میں پہلے اقتصادی بحران، پھر سیاسی بحران پیدا کیا گیا، اور اب تیمور کا قضیہ اٹھایا جارہا ہے، دہشت گردی وتشدد دوسرا بہانہ ہے، جس کا عام طور سے اطلاق اسلام پسندوں پر کیا جاتا ہے، جس کا امریکہ کی نظر میں پورا عالم شکار ہے۔ اب ایک نیا بہانہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ونگہداشت ہے۔ جہاں تک سیاسی واجتماعی حالات کا، اخلاقی انارکی، آئینی حقوق سے اکثریت کی محرومی، سیاسی ظلم واستبداد، پسماندگی ودرماندگی، ملک کے امن وسلامتی اور عام زندگی کا خطرات سے دوچار ہونا، حکومت پر عوام کی نگاہ میں غیر مقبول عناصر کا قبضہ، ملکی مفادات کی غیر ملکی عناصر کے ہاتھوں فروخت اور ملک کے مادی وفکری سرمایہ کو تباہ وبرباد کرنے وغیرہ کی بات ہے تو یہ سب چیزیں دنیا پر اپنے نظام کو تھوپ دینے والے

امریکہ کے نزدیک ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتیں، وہ صرف اپنا مفاد سامنے رکھتا ہے، اوران اعذار کو اپنے مفاد کے اعتبار سے اختیار کرتا رہے۔

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ مداخلت کی ان تمام وجوہ جواز کا انطباق اسلامی ممالک ہی پر ہوتا ہے۔ امریکہ کی نظر میں اگر دہشت گردی کہیں ہے تو وہ صرف ایران ولیبیا میں، یا پھر سوڈان ودیگر اسلامی ممالک میں، اور اقلیتوں خصوصاً عیسائیوں کی بدحالی کا بہانہ پاکستان، مصر، سوڈان، ملیشیا، انڈونیشیا پر ہی فٹ آتا ہے، جہاں تک اقتصادی بحران کا مسئلہ ہے تو سارے کے سارے اسلامی ممالک اپنے معدنی ذخائر اور سرمایہ کے باوجود اس کے نزدیک معاشیات میں پچھڑے ہوئے ہیں، وہ اس وجہ سے کہ ان ممالک میں جو معاشی نظام رائج ہے وہ امریکی معاشی نظام سے میل نہیں کھاتا، صورت حال تو یہ ہے کہ جب غیر سودی بینک کاری ان اسلامی ممالک میں عام ہوئی اور ان کے نتائج وثمرات نے اقتصادیات کے ماہرین کو مبہوت کر دیا تو ان بینکوں کو یورپی اقتصادی اداروں کی جانب سے زبردست پروپیگنڈہ کا سامنا کرنا پڑا، اور دنیا کے سامنے اپنے آپ کو دیوالیہ وقلاش ہونے کا غلط وجھوٹا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

تعلیم وتربیت کا جو نظام مغربی سامراجی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے، وہ بھی ان حملوں سے نہ بچ سکا، کیونکہ سامراجیت انسانی دماغوں میں مغربی افکار ورجحانات کو فروغ دینے اور مغرب کی قیادت وسیادت تسلیم کرالینے کا آلۂ کار تعلیم وتربیت ہی کو سمجھتی ہے۔ اس لئے کہ اس ذریعہ سے عوام وخواص قومی تہذیب وتمدن اور قومی تاریخ پس پشت ڈال کر عظمتِ مغرب کا گن گانے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے مدارس اور دینی وتربیتی مراکز کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ان پر فتنہ وفساد دہشت گردی، اور تشدد کا اڈہ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے، ان مدارس ومراکز کو مالی بحران سے دوچار کرنے کے لیے ان مخیّر حضرات پر وجود امے درمے، سخنے امداد وتعاون کرتے

ہیں، پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ جب کہ ان اداروں میں طلبہ کو امانت و دیانت، اخلاق حسنہ، مروت و غیرت، انسانیت کی تعظیم و تکریم، خدا کے حضور احساس ذمہ داری اور جلوت و خلوت میں تقویٰ اور طہارت کا پاس و لحاظ رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

یہ بات اس حد تک پہونچ گئی کہ وہ مساجد جن میں لوگ قلبی محاسبہ اور عبادت کی غرض سے چند منٹ گذارتے ہیں، ان کو بھی اب فساد و دہشت گردی کا مرکز کہا جانے لگا ہے۔ جب کہ یہ مساجد اپنے طرز تعمیر کے لحاظ سے دیگر عبادت گاہوں سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہیں، ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ان میں وسیع صحن ہوتا ہے۔ اور وہ ہر وقت خاص و عام کے لئے کھلی رہتی ہیں، وہاں چھپنے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں، ان میں جائے نماز، چٹائی، لاؤڈ اسپیکر اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، لیکن فکر اسلامی سے نبرد آزما یورپ اور اس کے ہمنوا ممالک میں سرگرم عمل میڈیا ان مساجد کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں ان میں اسلحہ کا ذخیرہ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے کہیں ان میں دہشت گردی کی تربیت دینے کا الزام لگتا ہے، ہماری ہندوستانی صحافت بھی مغرب کی تقلید میں کبھی کبھی اس طرح کے الزامات لگاتی ہے۔ ہندوستانی مساجد سے متعلق شکوک و شبہات کو پھیلانے کا کام کیا جاتا ہے اسی طرح مدارس کا بھی دہشت گردی سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جب کہ ان مدارس کا براہ راست معائنہ کرنے والے وہاں کے پرسکون ماحول اور وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے اخلاق اور سادگی، اور تعلیم سے دلچسپی اور اس میں یکسوئی کے ساتھ مشغولیت کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ان سبھی اعذار و بہانوں کے علاوہ حال میں ایک نیا بہانہ تلاش کیا گیا ہے اور وہ امریکہ کی اقلیت کے معاملات سے خصوصی دلچسپی، لیکن جس اقلیت کے معاملات سے خصوصی دلچسپی ہے، وہ عیسائی اقلیت ہے، عالمی قیادت کا مالک امریکہ مصر میں قبطی

عیسائی اوراسی طرح سوڈان ، پاکستان ودیگر ممالک میں عیسائیوں کے بارے میں بہت فکر مند ہے۔ جبکہ ترکی، مصر اور الجزائر میں مسلم اکثریت کے ساتھ جبر وقہر پر اس کو کوئی تشویش نہیں، بلکہ جبر وقہر کی یہ پالیسی اسی کے اشارے پر اختیار کی جارہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اپنی تہذیب کی حفاظت، اپنی عبادت گاہوں کے نظم ونسق اور اپنے رسم ورواج کے باب میں ساری سہولیات حاصل ہیں، حکومتیں ان کے داخلی امور میں ذرا بھی مداخلت نہیں کرتیں، بلکہ ان ممالک میں مغربی قانون نافذ ہے۔ ان کا اقتصادی نظام بھی مغربی نظام معیشت سے ماخوذ ہے۔ ان کی تہذیب وثقافت یورپی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ غیر مسلم اقلیت کو ان ممالک میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں! اگر اجنبیت کا احساس ہوسکتا ہے تو ان مسلمانوں کو جو صحیح معنی میں دیندار، باغیرت اور اپنے تشخصات کے محافظ ہیں، وہاں کا نظام تعلیم اور میڈیا تک اسلامی منہج سے میل نہیں کھاتا۔ وہاں کا نظام تعلیم مغربی نظام تعلیم کے مطابق ہے، جو یورپی تعلیم گاہوں کے فارغین ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ تب ظاہر ہے کہ وہاں کے یہودی وعیسائی اور دیگر ادیان ومذاہب کے متبعین کیوں کر اجنبیت محسوس کریں؟ یا انھیں کسی قسم کی محرومی کا احساس کیوں کر ہو؟

عیسائی اقلیت پر اس قسم کا لطف وکرم اور ان کی بدحالی کا پرزور پروپگنڈہ جو مغربی میڈیا ہے اس وقت کیا جارہا ہے ان ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا ایک بہانا ہے، خلافت عثمانیہ میں مداخلت کے لئے فرانس اور برطانیہ نے اسی قسم کے بہانوں سے فائدہ اٹھایا تھا، آج کل مداخلت کا یہ بہانہ کوئی خیالی یا نئی چیز نہیں رہ گئی ہے، بلکہ اس نے قانونی شکل اختیار کرلی ہے خاص طور سے مصر میں جو براہ راست امریکی مداخلت کا خطرہ محسوس کرہا ہے۔ امریکی پارلیمنٹ میں اس بل کو ۴۱

ووٹ کے بالمقابل ۳۷۵ ووٹ کی واضح اکثریت سے قانونی شکل دیدی گئی ہے۔ اب امریکہ جس حکومت کو اقلیتوں پر مظالم ڈھانے کا مجرم گردانے گا اس کو اس قانون کے سہارے مناسب سزائیں دے گا۔ ایسی حکومتوں میں سرفہرست چین، پاکستان، سوڈان اور مصر کے نام لئے جارہے ہیں، اس قانون کا فوری نفع مصر میں قبطی اقلیت کو پہونچانا مقصود ہے۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مصر میں ان کی تعداد صرف ۵۰ لاکھ ہے جب کہ مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے، لیکن امریکہ اس قانون کو نافذ کر کے مصر کو دی جانے والی دوملین ڈالر کی امداد روک سکتا ہے۔

"The Economist" میگزین شمارہ ۲۲۔۲۹ رمئی ۱۹۹۸ء کے مطابق اس قانون نے اہل مصر کے ذہنوں میں خطرات واندیشے پیدا کردیئے ہیں۔ وہ لوگ اس قانون کو نادار ممالک کی سرزنش کا ایک مؤثر اقدام قرار دے رہے ہیں، اور دوسری طرف امریکہ نے اسرائیل کو کھلی آزادی دے رکھی ہے جو روز بروز ایٹمی طاقت میں اضافہ کر کے پورے علاقے کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ مسلمانوں کو ظلم وبربریت کا نشانہ بنارہا ہے۔

مذکورہ شمارہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے صراحتاً یہ بات کہی ہے کہ مصر میں امریکہ یہودی لابی کے دباؤں میں کارروائی کرنا چاہتا ہے، اسرائیل ہماری معاشیات کو بحران سے دوچار کرانا چاہتا ہے، مصری قبطی اس بات میں دیگر اہل مصر کے شریک ہیں، مغربی میڈیا خصوصاً انٹرنیٹ Internet ہی نے شرق اوسط میں مسیحیوں کی مظلومیت کو اپنا خاص موضوع بنالیا ہے'' شمارہ نے مزید یہ لکھا ہے کہ ''مصری پارلیمنٹ میں عیسائی ممبران کی تعداد دس ہے جب کہ مسلم ممبران ۴۴۴ رہیں پھر بھی مصر کی صنعت وتجارت پر عیسائیوں ہی کا قبضہ ہے''۔

پاکستان اور سوڈان میں عیسائیوں سے متعلق امریکہ کا موقف بھی کچھ ایسا ہی

ہے۔ امریکہ ان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یورپی ممالک میں مسلمان امتیازی سلوک کا شکار ہیں۔ یہاں ایک اصولی بات یہ ہے کہ دین ومذہب کی بنیاد پر تفریق وتمیز برتنا اگر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے تو از روئے عدل جب بھی کوئی ملک اس قسم کی تفریق کے جرم میں ملوث پایا جائے اس پر یہ قانون نافذ ہونا چاہئے، خواہ وہ ملک فرانس ہو یا جرمنی، اٹلی ہو یا پرتگال، اسپین ہو یا افریقہ وایشیا کا کوئی دوسرا ملک، مگر طاقت عظمیٰ امریکہ اسی تفریق وتمییز کو بنیاد بنا کر اسلام اور اسلام پسندی کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہا ہے حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو جو اس تعزیراتی قانون کے بنانے والے ہیں وہی خود اس جرم کے سمندر میں پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔

بلاشبہ اس قانون نے امریکہ کو دنیا کے کسی بھی ملک میں مداخلت کا موقع فراہم کر دیا ہے کیونکہ دنیا کے اکثر ممالک میں اقلیتوں کی کچھ نہ کچھ شکایات اور مطالبات ہیں، اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں، پورے عالم میں اکثر تارکین وطن بھی مسلمان ہی ہیں جن کو اقوام متحدہ کی مراعات کا استحقاق ہے۔ اب بھلا اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ اس نئے قانون کے بموجب وہ مسلمان امریکی حکومت کی عنایت ونوازش اور اس کی مراعات سے لطف اندوز ہوسکیں گے؟ یا اس بات کی توقع ہے کہ اب امریکہ ان کے مسائل حل کرنے کے لئے کوئی فوری اقدام کرے گا؟ اگر اس قانون کے تحت تمام اقلیتیں بلا کسی تفریق کے آجائیں تو دنیا کی سبھی اقلیتوں کے حق میں یہ عیش ومسرت اور خیر وصلاح کا قانون ثابت ہوگا، لیکن امریکی قانونی زبان نے اس بات کا اندیشہ پیدا کر دیا ہے کہ اس قانون سے مقصود صرف مسیحی اقلیت ہے۔ اور اسلامی ممالک پر امریکہ کی یلغار کے لئے یہ قانون ایک جدید ترین ہتھیار بن سکتا ہے۔

نیا نظام نئے تصورات (☆)

ہر زمانہ کا الگ فلسفہ اور الگ نظریہ ہوتا ہے، اور ہر فلسفہ اور نظریہ کے اپنے مفکرین اور حاملین ہوتے ہیں، جو اس کے مقاصد کی تشریح، اصول وضوابط کی تشکیل، اور اس کے حدود کی تعیین کرتے ہیں، پھر ان فلسفوں اور افکار ونظریات کی تشریح وتوضیح بعینہٖ ایسی ہی کی جاتی ہے جس طرح ان کے بانیوں اور ان کے حاملین نے کی ہے، عام الفاظ کی ڈکشنری کی طرح نظریات اور اصطلاحات کی بھی ڈکشنریاں ہوتی ہیں، جب کسی اصطلاح کے مفہوم کے تعیین میں اختلاف ہو تو ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس طرح کی ڈکشنریوں کی حیثیت مرجع اور ماخذ کی ہوتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں اس طرح کے مکاتب فکر اور نظریات پیدا ہوتے رہے ہیں، ان کی تشریحات وتوضیحات کا کام بھی ہوتا رہا ہے، اور ہر چند کہ ان فلسفات اور نظریات پر صدیاں گذر گئیں، لیکن پھر بھی اگر کوئی ان کے قیام کے اسباب اور محرکات کا پتہ لگانا چاہے، ان کے مفکرین اور فلاسفہ کے افکار وخیالات کا مطالعہ کرنا اور ان کے اغراض ومقاصد سے واقفیت حاصل کرنا چاہے تو اسے اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی، اور ان کی تعریف وتشریح میں اسے کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا، خواہ مکاتب فکر جیسے بھی ہوں، یونانی فلسفہ اور مشرقی اقوام کے فلسفیانہ افکار ونظریات اور تحریکات اور مذاہب کے بارے میں اس زمانہ میں بھی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، یورپ کے ادبی نظریات مثلاً کلاسیکیت، رومانیت، رمزیت، وجودیت وغیرہ جو

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اگست ۱۹۹۸ء۔

فکری اور فنی مکاتب فکر ہیں یہ بندھے ٹکے اصولوں کے پابند ہیں، ان کی اپنی ایک تاریخ اور تعریف ہے جس سے ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ ان مکاتب فکر کے مزاج اور تاریخ شناس ہیں انھیں ان کے مفہوم کی تحدید و تعیین میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی، اور انھیں ان پر تحقیق و تنقید کی راہ میں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی، اس لئے کہ ان کے اصول و مبادی بالکل صاف اور متعین ہیں۔ اسی طرح جمہوریت، اشتراکیت، ملوکیت، آزادی، غلامی، سامراجیت، خود مختاری، مصالح، تشدد، نظام و قانون، انارکی اخلاق، بداخلاقی یہ سارے الفاظ متعین مفہوم رکھتے ہیں، اور ڈکشنریوں میں ان کی واضح تعریف موجود ہے۔

گذشتہ زمانے میں ادبی جرح و نقد ذوق اور سلیقہ کی بنیاد پر ہوا کرتا تھا، ناقد اپنی رائے اور ذوق کے مطابق کسی ادبی عبارت پر حسن و قبح کا فیصلہ کرتا تھا، لیکن بعد کے علمی دور میں ادبی نقد کے باقاعدہ اصول اور ضوابط وضع کیے گئے، ان اصولوں کی پابندی ہر ناقد کے لئے ضروری ہے۔ ناقد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بری شئے کو اچھی اور اچھی چیز کو بری کہہ دے، اسی طرح علم و تحقیق میں ترقی ہوئی، لیکن اچھائیاں اچھائیاں رہیں اور برائیاں برائیاں ہی رہیں، چنانچہ دروغ گوئی، جعل سازی، لوٹ کھسوٹ، مکر و فریب، کشت و خون، جور و ظلم، چوری ڈکیتی، فحاشی اور بے حیائی، اسراف اور فضول خرچی، ظلم و بربریت اور قہر و استبداد ہر زمانے، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں مذموم اور قابلِ ملامت رہے، اس قسم کے گھناؤنے اور گندے اعمال کرنے والے ہر زمانے میں موجود رہے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کذب بیانی اور مکر و فریب، ظلم و زیادتی اور فحاشی و بے حیائی کو اچھا سمجھا جانے لگا ہو، ہر دور میں ایسا کرنے والے لوگوں کی نظروں میں گر جاتے تھے، تاریخ و ادب کے گوشے میں ان کے لئے عزت کا کوئی مقام نہیں تھا، اور صرف اعمال و افعال ہی برے نہیں ہوتے تھے، بلکہ اقوال بھی برے

اور نامناسب سمجھے جاتے تھے، چنانچہ اگر کوئی بری بات اپنی زبان سے کہتا، یا اس کے بارے میں کذب بیانی اور دروغ گوئی کی بات ثابت ہوجاتی تو اس کی مذمت کی جاتی، اس کو برا بھلا کہا جاتا، اور اگر کسی عظیم منصب پر فائز ہوتا تو اسے اپنے منصب سے دست بردار ہونے کی بات کہی جاتی، اس کو سزا دی جاتی، اور اس کی ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں، وہ بھی صرف مشرق ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی جب کہ وہ اقدار ومبادی پر مبنی تمدن کا مالک تھا، یہ اور بات ہے کہ آج یورپ دین ومذہب اور اقدار وروایات کے خلاف برسرپیکار ہے، لیکن اس علمی اور عقلی انقلاب کے باوجود سیاست ومعاملات، معاشرت واخلاق اور تجارت وصنعت میں یورپ اصولوں اور قدروں کا پابند رہا، بعض شعبوں میں ان قدروں کا پاس ولحاظ رکھنے میں دوسروں کے مقابلہ میں یورپ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، ان ہی قدروں اور روایتوں کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کے سبب حکومتوں اور شخصیتوں کا زوال ہوا، یورپ کی مصنوعات پر اعتماد کیا جاتا تھا، تجارتی کمپنیاں معیار اور سطح کا خوب خوب پاس ولحاظ رکھتی تھیں اور نمونہ کی پابندی کرتی تھیں، اور اپنے قول کی پابند تھیں، اور یورپ کو اپنی اسی معیار پرستی پر عالمی شہرت حاصل تھی، تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کمپنی نے کیروسین، تیل کو دودھ کے نام پر اور کیڑے مار دواؤں کو عطر اور خوشبو کے نام پر فروخت کیا ہو، یا سامان سازی میں کوئی گڑبڑی پیدا کی ہو، اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو تاجر اور کاریگر کو عدالت کا منھ دیکھنا پڑا، اس کی تجارت ماند پڑ گئی اور بری طرح اس کی بدنامی اور رسوائی بھی ہوئی۔

لیکن یہ قصہ تو جب کا ہے جب اصول وضوابط کا عام چلن تھا، لیکن آج کا یہ دور بے اصولی اور لاقانونیت کا دور ہے جو بااصول طریقہ پر زندگی گذارے گا تو اسے بنیاد پرستی اور قدامت پرستی کے طعنے سننے پڑیں گے۔ کیونکہ یہ موجودہ تہذیب کے خلاف ایک بغاوت ہے جس کی نظر میں مکر وفریب، چوری، جھوٹ، لوٹ کھسوٹ،

اور ظلم وزیادتی ایک فن ہے، اور جس نے اس میں مہارت پیدا کرلی گویا وہ ایک باکمال اور باصلاحیت انسان ہے جیسے عالمی سطح پر انعام سے نوازا جانا چاہئے، خواہ وہ اس مہارت کا ثبوت حقائق کی پامالی اور جعل سازی سے کیوں نہ دے، آج ڈاکوؤں، قاتلوں اور جرائم پیشہ لوگوں کا پرزور استقبال کیا جاتا ہے، انعامات سے نوازنے کے لئے ان کے ناموں کا اعلان کیا جاتا ہے، ان کی زندگیوں پر فلمیں تیار کی جاتی ہیں، جب کہ لوگ گذشتہ زمانے میں اپنے اچھے کارناموں پر ہی فخر کیا کرتے تھے، چنانچہ کہتے تھے: ''ہمارے کارنامے صبح کی سفیدی کی مانند نمایاں اور روشن ہیں، اس لئے کہ وہ صرف سخاوت وشجاعت اخلاق ومروت، سچائی وغمخواری، ایثار وقربانی اور الفت ومحبت پر فخر کیا کرتے تھے، لیکن آج یہی چیزیں بزدلی اور قدامت پرستی بلکہ دہشت گردی، بے حسی اور بنیاد پرستی کے مرادف ہیں، لیکن مکر وفریب، توڑ پھوڑ، مار دھاڑ، نفاق ومداہنت، گھٹیا اور پست کام آج قابل فخر کارنامے ہیں۔

ان ہی انسانی قدروں سے تہی دست اور عاری ہونے کا نتیجہ ہے کہ آج ہر ادارے، ہر پارٹی اور ہر تنظیم کو اس کی پوری آزادی حاصل ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے کہے، شہد کو چاہے تو سرکہ کہہ دے، اور سرکہ کو چاہے تو شہد، لوہے کو چاہے تو ربر کہہ دے، اور ربر کو چاہے تو لوہا، سفید کو چاہے تو سیاہ کہہ دے اور سیاہ کو چاہے تو سفید، جنگ کو چاہے تو امن کا نام دیدے، اور امن وسلامتی کو جنگ وقتال کا، اخلاق ومروت کو دہشت گردی کا نام دیدے اور اگر چاہے دہشت گردی اور ظلم وزیادتی کو محبت والفت اور اخوت وشرافت کا جامہ پہنادے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اصول واقدار سے عاری آج کی موجودہ تہذیب اسی سماجی اور سیاسی صورت

حال سے گذر رہی ہے، لہٰذا اگر اس صورت میں کوئی دین اور اخلاق کی پابندی کرنے کا دعویٰ کرنے والی پارٹی سیکولرزم کا لباس پہن لے، کوئی ظالم و جابر فسطائی حکومت تحفظ وناموس کا مالا جپے اور انسانیت وحریت کا نعرہ بلند کرے تو اس میں تعجب کی بات نہیں، بلکہ یہ تو اس دور کی فنکاری اور جادوگری ہے۔

''میکاولے'' جس کے افکار وخیالات کی موجودہ سیاسی نظریہ پر چھاپ غالب ہے، اس نے دعویٰ کیا تھا کہ عوام الناس کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، اور اغراض ومقاصد کی تکمیل وسائل پر پردہ ڈال دیتی ہے، لہٰذا حکمراں اور مفکرین کا طبقہ آج ہر میدان میں اسی موقع پرست نظریہ پر عمل پیرا ہے، اور تقاریر وبیانات اور کارکردگیاں اور سرگرمیاں اس انسانی لباس کی مانند ہوگئی ہیں جو موسم، فضا، ماحول اور جگہ کے مطابق بدلتا رہتا ہے، یہی بات افکار وخیالات اور نظریات ومعاملات کے اندر ہے، اس میں کوئی استقلال اور ثبات نہیں، یہاں تک کہ عداوت اور دوستی اچھائی برائی اور پسند وناپسند کا کوئی معیار اور اصول نہیں رہا بلکہ علی الاعلان کہا جاتا ہے ہم نہ کسی کے دوست ہیں نہ دشمن ہم اپنے مفاد کے پابند ہیں، یہی آج کی نئی تہذیب اور نیا تمدن ہے جس کی باگ ڈور امریکا کے ہاتھ میں ہے، اور اس تہذیب نو کی تشکیل اور تعمیر کے تعلق سے امریکا کو دیگر یورپی ممالک کی حمایت اور تائید بھی حاصل ہے، اور تمام عالمی طاقتیں اس کے سامنے سرنگوں ہیں، ان میں وہ ممالک بھی ہیں جن کا اپنا مستقل وجود اور مستقل تہذیب تھی اور وہ خاص پابندیوں کے مکلّف تھے، جبکہ آج کا موجودہ نظام ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد شتر بے مہار بنا ہوا ہے، اور اس کے یہاں مسائل کو معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ہٹ کر دیکھنے کا کوئی تصور نہیں، ایک ہی چیز کسی کے لئے ناجائز اور حرام ہے اور کسی کے لئے جائز اور حلال، جمہوریت کہیں عین تقاضائے حکمت ہے تو کہیں استبدادی اور عسکری نظام جائز اور مباح، بنیاد پرستی کی کہیں بیخ کنی کی جاتی ہے تو کہیں اس کی پوری پوری

ہمت افزائی اور حمایت، کہیں کسی سے آزادی کا حق سلب کیا جاتا ہے تو کہیں کھلے عام مطلق العنانی کی دعوت دی جاتی ہے، گویا شاعر کی زبان میں آج ؎

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ نئی روشنی ہے

اس طرح کے معاملاتی، نظریاتی اور تجزیاتی تضاد کی بے شمار مثالیں ہیں، یہاں پر صرف چند مثالیں بطور شہادت کے پیش کی جاتی ہیں:

ایک عربی اخبار کے مطابق ''چند دنوں پہلے امریکی قانون میں اسرائیل کو شامل کیا گیا جس میں ایسے ترقی یافتہ کمپیوٹر کی ان ملکوں کے ہاتھ فروخت پر پابندی عائد کی گئی تھی جو معاہدہ میں شامل نہیں ہیں ان مشینوں سے ایک سیکنڈ میں کروڑوں کام لئے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ نئے کمپیوٹر کے ذریعہ ایٹمی اسلحہ کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی خبر کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اسرائیلی حکومت کے پاس ایسی دسیوں مشینیں ہیں جس پر پابندی عائد کی جاچکی ہے، اس اخبار نے مزید اس تضاد اور دوغلے پن پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: بین الاقوامی مساوات اور عربوں کے حقوق پامال کرنے والی یہودی حکومت کی اندھی جانبداری اور اندھے تعصب کے نتیجہ میں شرق اوسط کے علاقہ میں امریکہ کی خارجی سیاسی پیچیدگی تقریباً روزمرہ کی صورت میں عملی صورت اختیار کررہی ہے۔

صرف یہی ایک مثال نہیں ہے، کیمیاوی اسلحہ اور دیگر تباہی مچانے والے اسلحہ کے تعلق سے امریکی موقف کھلے تضاد کا مظاہرہ کررہا ہے، امریکا کی طرف سے جن اسلحے کی اجازت ہے وہ اس نام پر کہ وہ تحفظ، امن وسلامتی کے لئے ہیں لیکن وہی اسلحہ اس کے غیر حلیف ممالک کے حق میں اس کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ شرق اوسط میں امریکہ کی خارجہ پالیسی غاصب یہودی حکومت کی کھلی حمایت، اور جانب داری پر مبنی ہے، چاہے اس پر عمل کرنے میں عربوں کے حقوق اور امن وانصاف کی کیسی ہی پامالی ہو۔

امریکا نے مصر میں عیسائی اقلیت کی صورت حال پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا ہے جب کہ وہاں یہودی اور مسیحی اقلیت کے ساتھ اکثریت کے مقابلہ میں اچھا سلوک کیا جاتا ہے، سرکاری حلقوں میں ان ہی کی رسائی ہے، ان پر تنقید کی ممانعت ہے، وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، اقتصادیات پر ان کا قبضہ ہے، جامع ازہر سے اسلامی تاریخ کے موضوع کو نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ فرعونی تاریخ کو شامل کیا گیا ہے، اور اسلام پسند اور ان کا حلیف طبقہ قید و بند کی زندگی گذار رہا ہے اور ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔

برسر عام امریکا جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کی بغاوت کی آگ بھڑکانے والے عناصر کی پشت پناہی کر رہا ہے، اور ان علاحدگی پسند باغیوں کے ساتھ سوڈانی موقف کو بدلنے کے لیے اس پر دباؤ بھی ڈال رہا ہے، اور ان باغیوں کے لیے نئے طرز کے مہلک اسلحے اور ہتھیار فراہم کر رہا ہے، اور ساتھ ہی دوسری طرف ''کوسوو'' میں آزادی کا نعرہ لگانے والوں کی سرکوبی کی خاطر صربوں کی حمایت کر رہا ہے۔

اخوان المسلمین کی طرف سے لندن سے شائع ہونے والے اخبار ''الدعوۃ'' نے کوسوو کے متعلق لکھا ہے کہ: مبصرین کا کہنا ہے کہ گذشتہ دنوں میں صربی حملوں کو ریاستہائے متحدہ کی ہمدردی اور ہمت افزائی حاصل رہی اور خاص طور سے امریکی مبعوث جلبارد کی بلجراد کے افسروں سے ملاقات، سربیا سے اقتصادی پابندی ہٹانے اور اس کے ساتھ ''انتفاضہ'' کی بیخ کنی کی خاطر وسائل و مال کی اعانت کے بعد توڑ پھوڑ اور تشدد کے واقعات میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

دوسری طرف امریکا نے ''اتھوپیا'' میں اپنے پر پھیلانے شروع کر دیئے ہیں اور سوڈان کے خلاف کام کرنے والے ایتھوپی عناصر کو ٹریننگ بھی دے رہا ہے۔

''ادیس ابابا'' میں ایک ڈپلومیٹ نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے کہ ایتھوپیا

میں مقیم امریکی سفیر ''ویفید وستن'' نے ایتھوپی سرحد پر واقع شہر جامبیلا میں پچھلے دنوں جنوبی سوڈان میں بغاوت کی آگ بھڑکانے والے عناصر کے ساتھ ملاقات کی۔

یہ رپورٹیں حریت پسند تحریکوں کے ساتھ امریکا کے دوغلے موقف کی صاف غمازی کرتی ہیں، وہ کسی تحریک کو دہشت گرد اور علاحدگی پسند قرار دے کر اس کے ساتھ جنگ شروع کر دیتا ہے جب کہ وہیں دوسری طرف دوسری کسی تحریک کو حق بجانب کہہ کر اس کی بھرپور حمایت اور تائید کرتا ہے۔

امریکا نے بنیاد پرستی کے مجرم اسلام پسندوں کو حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے ترکی پر دباؤ ڈالنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، الجزائر میں نہتے عوام کے قتل عام پر چشم پوشی کی پالیسی اختیار کی، اور فوجی آمریت کی تائید کی، ساری دنیا میں بنیاد پرستی کی مخالفت کی لیکن بعض ملکوں میں بنیاد پرستی پر عامل تحریکوں کی تائید کی، کسی ملک میں ایک لیڈر یا قائد پر ہونے والی زیادتی وظلم پر امریکہ بے قرار ہو جاتا ہے اور اس کو حقوق انسانی کی مخالفت قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایشیا وافریقہ کے مختلف ملکوں میں انسانی حقوق کی پامالی کے متعلق ''امنسٹی انٹرنیشنل'' کی رپورٹ قابل ذکر ہے۔ اس کی رپورٹ کا ماحصل یہ ہے کہ مختلف ممالک میں قوانین پر عملی تطبیق میں بڑا فرق پایا جاتا ہے، اس کی رپورٹ کا ایک جزئیہ بھی ہے کہ مختلف ممالک بغیر مقدمے کے جیل میں رکھنے کے عادی ہیں جب کہ وہ عالمی دستاویز برائے حقوق انسانی سے اتفاق کرنے والے ممالک ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے ایشیا کے مختلف ممالک کے قوانین ان عالمی معیاروں کے مطابق ہیں مگر شاذ ونادر ہی عملی میدان میں ان کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے۔

اس سے پہلے مجلّہ ''اکنومسٹ'' نے جمہوریت کے نام سے مشہور اور اپنی ترقی پسندی کے جنون میں بنیاد پرستی سے برسرپیکار ممالک کے اندر صحافت کا گھلا گھونٹنے، آزادئ رائے پر بڑھتے ہوئے دباؤ۔

سیکولرزم کیا ہے؟ (☆)

قرون وسطیٰ میں مذہب پسندوں کے غلبہ کے ردعمل کے طور پر یورپ میں جو انقلابات رونما ہوئے اور اہل علم نے مذہب کے خلاف بغاوت کی، سیکولرزم کو اس کا درمیانی حل سمجھا گیا، مذہب کے نام پر یورپ کئی صدی تک خونریز صلیبی جنگوں میں مبتلا رہا۔ ان جنگوں سے سوائے شکست وریخت، مادی نقصانات، انسانی حقوق کی پامالی کے کچھ بھی ہاتھ نہ لگا، کلیسا طویل مدت تک آزاد تعلیم ومعرفت کے درمیان رکاوٹ بنا رہا، آخر کار یورپ نے علم ومعرفت تحقیق وتجربہ اور ایجادات واکتشافات کا راستہ اختیار کیا اور مذہب کو یا تو شخصی معاملہ قرار دیا گیا، یا اس سے بغاوت کی گئی۔ کلیسا کے ذمے داروں نے اس رجحان کو دیکھ کر اپنا رویہ نرم کیا اور دین کے ساتھ دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی اجازت دی، اس طرح سیکولرزم یورپ میں دین اور دنیا کے ٹکراؤ کی حالت میں ایک درمیانی حل تصور کیا گیا؛ لیکن بعض ملکوں میں اس اصطلاح کا غلط مفہوم لیا گیا ہے اور اس کو مذہب مخالف نظریہ تصور کیا گیا، جب کہ سیکولرزم کا مفہوم مذہب کا مخالف نہیں تھا۔ البتہ اشتراکیت میں یہ مفہوم نکلتا ہے، سیکولرزم درحقیقت مذہب کی دنیاوی یا سرکاری امور میں مداخلت سے بچنے کا راستہ ہے، جو اگرچہ اسلامی فکر سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، لیکن یورپ میں مذہبی استبداد کا ردعمل ہے، یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یورپ مذہب سے علیحدہ کبھی نہیں ہوا، اس نے مذہب کو ایک شخصی مسئلہ قرار دیا، لیکن کوئی یورپی ملک کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، اس نے اپنے ملک کے اکثریتی فرقہ کے مذہب کی حمایت سے صرف نظر نہیں کیا اور عیسائی مذہب

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۸ء۔

سے وابستگی ہمیشہ قائم رہی، یورپ نے جب دوسرے ملکوں میں اپنے قدم جمانے شروع کیے تو وہاں اس نے اپنے معتقدات کو بھی پھیلانا شروع کیا اور اس کے لشکر کے ساتھ عیسائی مبلغوں کی بڑی تعداد ان ملکوں میں پہنچی اور انھوں نے اپنے تبلیغی ادارے قائم کیے اور عیسائی بنانے کا کام کیا اور ان کی حکومتوں نے ان کی سرپرستی کی۔

موجودہ دور میں اس مذہبی وابستگی کو سمجھنے کے لیے یورپ کا دیگر ممالک کے ساتھ رویہ بڑی مثال ہے، کسی بھی یورپی ملک میں عیسائیت کی دعوت پر پابندی نہیں ہے اور نہ ہی گرجا گھروں کی تعمیر یا راہب وراہبات، ان کے لباس اور عقائد ومسلمات پر پابندی ہے، اس کے برعکس دوسرے ملکوں میں گرجا گھروں اور اس کے ذمے داروں، اشاعتی تنظیموں اور ان کے افراد کو یورپ کا بھرپور تعاون حاصل ہے، نیز مغربی حکومتیں ان رفاہی ومالی اداروں کا بھی تعاون کرتی ہیں جو اس مشنری کام کو دنیا کے دوسرے ملکوں میں انجام دیتے ہیں، ان کاموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والوں اور اشاعتی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ اس کو امداد نہ فراہم کریں، بلکہ اشاعتی وفود اور تنظیموں کی امداد کرنے والوں کی پشت پناہی کی جاتی ہے اور گرجا گھروں کی تعمیر اور عیسائی مذہب کی اشاعت اور دیگر مذاہب پر نقد کرنے کے لیے اصحاب قلم کی ہمت افزائی کی جاتی ہے، ان تنظیموں اور اداروں کا حکام، سربراہان اور ارباب حکومت سے تعلق کسی پر مخفی نہیں ہے۔

یورپ کے لیے عیسائیت ایک علامت بن گئی ہے، یونانی ورومی تہذیب اور یورپی قومیت کی پاسبانی ہمیشہ یورپ کے ذمہ رہی اور اگر عیسائیت کی یہ کھلم کھلا مدافعت نہ ہوتی تو پوری دنیا میں عیسائی مشن عام نہ ہو پاتا اور اگر اس کے لیے اتنی زبردست تعداد میں بجٹ نہ خاص کر دیا جاتا جو کہ بعض ملکوں کے مکمل بجٹ کے برابر ہے خاص کر چھوٹے ملکوں کے لیے، اس لیے کہ (N Gos غیر سرکاری تنظیم) جو ایک اصطلاح ہے، جس کا مقصد مشنری تنظیموں کی سرگرمی ہے، اس کا بجٹ بعض ان ملکوں سے زیادہ ہے جہاں وہ سرگرم عمل ہیں۔

یہ عیسائی تنظیمیں جو کالونیوں، اسپتالوں، اسکولوں اور محتاج گھروں وغیرہ کی تعمیر کے ذریعے انسانی خدمت کے نام پر سرگرم سفر ہیں۔ ان میں بعض اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ لوگ اور اعلیٰ عہدیداران رضا کارانہ کام کرتے ہیں اور بہت سے تو سرکاری عہدیداران ہیں، مشنری کام سے دلچسپی رکھنے میں بعض ملکوں کے حکمراں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، پرتگال کے ذمے داروں کی عیسائی مشن سے دلچسپی کسی پر مخفی نہیں۔ یہ اشاعتی ادارے پوری دنیا میں پھیلتے جارہے ہیں اور ہر طرح کے حرص، مادی وذہنی تاثر، تعلیم، رفاہ اور میڈیا کے ذریعہ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں اور بعض ادارے باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی چینلز کے مالک ہیں، انٹرنیٹ اب اس میں پیش پیش ہے جو مثبت اور منفی دونوں کام انجام دیتا ہے جو ایک ہی وقت میں ابلاغ اور گمراہی دونوں کا ذریعہ ہے، بعض یورپی ممالک اپنے اقتصادی تعاون کو عیسائیت کی اشاعت سے مشروط کردیتے ہیں اور اس میں سے کچھ حصہ مشنریز کے لیے خاص کردیتے ہیں، اسی طرح بعض یورپی ممالک اپنی اقتصادی امداد عیسائیت کی مخالفت کو ختم کرنے یا محدود کرنے کے لیے یا دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مستشرقین ان مشنری تحریکوں کو علمی وفکری غذا فراہم کرتے تھے۔ انھوں نے عیسائیت کی تبلیغ اور دیگر مذاہب کے خلاف مواد فراہم کرنے کے لیے علم کو ذریعہ بنایا، ایک مستشرق سے جب اس کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے کہا:

> وہ کیا کرے سرمایہ دار لوگ اس پر مسلط رہتے ہیں اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے خلاف کام کرنے پر بھاری امداد کا یقین دلاتے ہیں، ایک کتاب ابھی تیار بھی نہیں ہو پاتی کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ دوسری کتاب کے لیے اخراجات پیش کرنے لگتے ہیں۔

لیکن عجیب بات ہے کہ کسی بھی یورپی ملک نے کسی بھی زمانے میں اس امداد

کے خلاف پابندی نہیں لگائی اور نہ اپنے راہبوں کے لباس اور طرز معیشت پر پابندی لگائی گئی، نہ ان کی نقل وحرکت پر اور نہ ان کے جارحانہ بیانات پر، جب کہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سیکولرزم پر عامل ہیں اور ان کے نزدیک مذہب ایک انفرادی مسئلہ ہے، سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، حکومت کی اسی رعایت کی وجہ سے ایشیا اور افریقہ کے علاقوں میں عیسائیت مشنری کے ساتھ پھیلتی جارہی ہے اور اس کے داعی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایشیا وافریقہ کے بعض ملکوں کو اکثریتی مسیحی آبادی میں بدل دیں گے۔ ان سیکولر طاقتوں نے محض اشاعتی سرگرمیوں کے ساتھ تعاون ہی نہیں کیا؛ بلکہ انھوں نے غیر عیسائی ملکوں میں عیسائیوں اور اس مذہب میں نئے آنے والوں کی حمایت کے سلسلہ میں بھی اپنی مذہبی ذمے داریوں سے کبھی روگردانی نہیں کی، اس کی سب سے تازہ مثال امریکہ، جرمنی، فرانس کا غیر عیسائی ملکوں کی عیسائی اقلیت کے ساتھ ہمدردی کا رویہ ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام مثلاً پاکستان، بنگلہ دیش، سوڈان اور مصر میں بھی ایسا ہی ہے اور ان کی عیسائیوں کے مسائل سے خصوصی دلچسپی رہتی ہے۔

مشنری سرگرمیوں کا اندازہ ۱۹۹۷ء کی اس رپورٹ سے کیا جاسکتا ہے جو پوری دنیا میں عیسائیت کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے اور جس میں عیسائی تحقیقی اشاعتی ادارہ نے ۱۹۸۵ء میں پوری دنیا میں مشنری سرگرمیوں کے سلسلہ میں تفصیلات شائع کی گئی ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں عیسائیوں کی تعداد ۳ء۹ ارب کے قریب ہے اور ہر سال ان کی تعداد ۴ کروڑ سات لاکھ کے قریب بڑھتی ہے، اس طرح یومیہ ایک لاکھ ۲۹ ہزار کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

غیر عیسائی ملکوں میں گرجا گھروں اور عیسائی اداروں اور زبان کے بارے میں حال ہی میں بڑی معلومات سامنے آئی ہیں جس میں ان کی جغرافیائی تقسیم، زبان اور ان کے عادات واطوار وغیرہ کے سلسلہ میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اس رپورٹ میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۹۶ء میں پوری دنیا میں انجیل کے ۸ء۱/ارب نسخے تقسیم کیے گئے، اس میں ۹۷ فیصد عیسائی ملکوں میں اور باقی کو اس کے علاوہ میں تقسیم کیا گیا۔

مذکورہ رپورٹ میں عیسائی داعیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ پچاسی لاکھ مبلغ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں ہیں۔ ۴/ارب غیر عیسائی آبادی دنیا کے لیے باعث تشویش بنی ہوئی ہے۔ ان کا منصوبہ ہر غیر عیسائی سے رابطہ قائم کر کے اس کو عیسائی مذہب کی تلقین کرتا ہے۔

رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۷ء میں دوسو ہزار ملین ڈالر عیسائیت کی اشاعت پر صرف کیے گئے اور پادری مبلغین کی تعداد سینتالیس لاکھ پچاس ہزار تک پہنچی ہے جب کہ مشنری ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد تین ہزار چار سو ہے۔

عیسائی مشنری سرگرمیوں سے متعلق یہ اعداد وشمار ہیں جو سرمایہ داروں اور باثر لوگوں، حکومتوں اور برسر اقتدار افراد کے تعاون کے بغیر انجام نہیں پاسکتے، اس کے باوجود یہ ممالک سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور سیکولرزم کے داعی بھی ہیں اور سیکولرزم کے نام پر اسلامی دنیا کو اسلامی ذہن سے جنگ کرنے کی تلقین کرتے ہیں، یورپ کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب کے اثر سے آزاد ہے، اور وہ مذہب کو شخصی معاملہ سمجھتا ہے۔

مذہب وسیکولرزم کے درمیان یہ مفاہمت اور اکثریت کے مذہب اور اس کی ثقافت کی ہم نوائی کی دوسری مثال ہندوستان ہے۔ ہندوستان میں بھی سیکولر نظام رائج ہے، جس طرح ہندوستان خود کو دنیا میں سب سے بڑا جمہوری ملک گردانتا ہے، اسی طرح سماج کے لیے ہندوستان نے سیکولرزم کے ساتھ اشتراکیت کو منتخب کیا، چنانچہ ہندوستان میں اشتراکیت اور سیکولرزم دوش بدوش ہیں، لیکن ملک اور اصحاب اقتدار کی مذہبی اداروں اور تحریکات کی ہم نوائی ان میں عملی شرکت اور مذہبی پیشواؤں کے احترام وتقدس کی رعایت،

وزراء کا مذہبی جگہوں پر بار بار جانا اور مذہبی شخصیتوں سے عقیدت مندانہ تعلق رکھنا، مذہبی شعائر کو سرکاری تقریبات میں رائج کرنا اور مذہبی پروگراموں اور عبادت گاہوں کی تعمیر میں ان کی سرگرمی کی وجہ سے کبھی بھی ان کی حمایت و پشت پناہی ختم نہیں ہوئی، یہاں تک کہ جن صوبوں میں کمیونسٹ حکومتیں ہیں، وہاں بھی ہندوستانی سماج اپنی مذہبی تہذیب و معاشرت اور عقائد سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوا، ہندوستان نے یورپی تہذیب کا مقابلہ کیا اور اس کے مفکروں نے مغربی تہذیب پر تنقید کی اور انھوں نے اپنے ملکی شعائر کو اختیار کرنے پر زور دیا، ہندوستان کا دستور سیکولر ہونے کے ساتھ ساتھ کسی بھی مذہبی سرگرمی پر پابندی نہیں عائد کرتا، وہ اقلیتوں کو اپنے مذہب کے مطابق ادارے قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اکثریتی مذہبی تنظیمیں اپنے والنٹر وں کو اسلحہ کی تربیت بھی دیتی ہیں، ان کی خبریں اخباروں میں چھپتی ہیں، پارکوں میں ان کی پریڈ ہوتی ہے، مگر حکومت نے ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی اور حکومت نے اکثریت کے مذہبی رجحان اور ہندوستان کی قدیم ثقافت کو تقویت دینے کے لیے نظام تعلیم میں اصلاحات بھی کی ہیں۔ اقلیتوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس نے سنسکرت کی تعلیم کو لازم قرار دیا ہے، دوسری قومیں اپنی زبان و تہذیب کی بقا کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور دستور ہند کے حوالہ سے حکومت سے نظر ثانی کرنے کی اپیل کر رہی ہیں، سیکولر دستور کے مطابق اس کی اجازت ہے۔

بھاجپا نے اپنے دور حکومت (۱۹۹۸ء) میں اسکولوں میں مذہبی ترانہ کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ شروع کرنے کی ہدایت جاری کی، مسلمانوں نے اس ہدایت کی مخالفت کی اس لیے کہ یہ ترانہ مشرکانہ باتوں سے بھرا ہوا ہے، ہندوستان میں بہت سی ایسی تنظیمیں اور تحریکیں ہیں، جو ہندوستان اور اس کے باہر ہندو مذہب کی اشاعت کا کام انجام دیتی ہیں اور اسلامی تحریک بھی ہیں اور آزاد تعلیمی ادارے بھی، لیکن سیکولرزم کے نام پر ان کی سرگرمیوں پر پابندی نہیں عائد کی گئی، ۱۹۹۸ء میں وشو ہندو پریشد کے لیڈر نے اعلان کیا کہ

یہ تنظیم ایک جماعت کی تشکیل کرے گی جو دس ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی تاکہ یہ لوگ ہندوستان میں دوسرے مذاہب کی اشاعت کا مقابلہ کریں اور ہندومت کی دعوت دیں اور اسی طرح بجرنگ دل نے ہندو مذہب کی اشاعت کے لیے ہزاروں افراد کی اسلحہ کی تربیت کا اعلان کیا، یہ سرگرمیاں سیکولر حکومت کی نگاہ میں قابل اعتراض نہیں ہیں، لیکن کیا کسی سیکولر اسلامی ملک میں اسکا تصور ممکن ہے؟ یقیناً وہاں صورتحال اس کے برخلاف ہے۔

عالم اسلام میں یورپ کے ہیرو سیکولر افراد کا سیکولرزم کے بارے میں ایک خاص تصور ہے وہ سیکولرزم کو مذہب مخالف سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ تمام دینی سرگرمیوں کے سرچشموں کو خشک کردینا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ دینی مظاہر وشعائر اور اقتصادی ومعاشرتی اداروں کا اگر مذہب کی طرف رجحان پاتے ہیں تو ان پر بھی پابندی لگا دیتے ہیں اور مذہبی رجحان کو دہشت گردی کا نام دیتے ہیں، خاص طور سے ترکی میں اس طرح کے واقعات ہمارے سامنے ہیں، بعض عرب ممالک بھی انہیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور کچھ ملکوں کا تو دعویٰ ہے کہ مذہب کی تمام علامتوں کو مٹادیں گے اور مذہب سے متعلق جملہ امور کو خاک میں ملادیں گے۔ اس طرح وہ ہر عمارت اور ہر آبادی کو جس کا مذہبی عمل ہو خاکستر کردینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ سیکولر قائدین یورپ کی کھلی ہوئی تقلید کرتے تو ان کے دلوں میں اپنے مذہب کے لیے نرم گوشہ ہوتا جس طرح کہ یوروپ کا معاملہ ہے، جب کہ ان کا مذہب رہبانیت کا مذہب ہے اور ان کے مذہب نے علم وترقی کی راہ میں ایک ہزار سال تک رکاوٹ ڈالی، اہل علم وفکر پر ظلم کیا اور اسلام زندگی کے ساتھ چلنے والا مذہب ہے، وہ علم کا مذہب ہے، عقل کا مذہب ہے، وہ ایک پائیدار سماجی نظام رکھتا ہے، وہ انسان کو آزادی اور عزت کا مقام عطا کرتا ہے، وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے درمیان توافق پیدا کرتا ہے، وہ امیر کی اطاعت کی تلقین کرتا ہے، لیکن اندھی تقلید کو آزادی وفکر کی ضرورت ہے اور یہاں دونوں چیزیں ناپید ہیں۔

جمہوریت اور سیکولرزم: فکر و عمل کا تضاد (☆)

جمہوریت اور سیکولرزم (SECULARISM) موجودہ دنیا کی جدید اور رائج الوقت اصطلاحات ہیں۔ جمہوریت سے مراد عوام یا قوم کی حکومت ہوتی ہے، جمہوری نظام میں حکام کا انتخاب عوام کرتے ہیں، اس میں کسی قبیلہ و خاندان یا کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہوتی، اس میں حکومت کے قیام و بقاء کا تمام تر دار و مدار الیکشن پر ہوتا ہے، کچھ ملکوں میں ایسے قوانین ہیں جن کی رو سے ایک حاکم اقتدار میں صرف ایک ٹرم (Term) یا زیادہ سے زیادہ دو ٹرم ہی تک رہ سکتا ہے، اس کے بعد بہر حال اسے منصب سے دستکش ہونا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ حکام بدلتے ہی رہتے ہیں اور ایسے ہی قوانین میں بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے، اور یہ سب کچھ عوام و قوم اور ان کے نمائندوں کی حسب منشاء ہوتا ہے۔

مگر فی زمانہ بہت سی ایسی جمہوریتیں بھی ہیں جن کا عوام و قوم سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے، وہاں محدود ترین اور خاص انتخابی طریقہ سے حکام منتخب ہو جاتے ہیں بلکہ عوام پر تھوپ دیئے جاتے ہیں، صورت حال یہ ہوتی ہے کہ انتخابات کے نتائج کے ظہور پذیر ہونے سے قبل ہی نتائج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حکام اپنی منشاء کے مطابق عہدوں پر بحال رہتے ہیں، اور کوئی اس انتخابی مہم میں ان کے مقابلہ میں آنے اور چیلنج کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔

یہ وہ جمہوریتیں ہیں جہاں پوری طرح سیاسی آزادی مہیا نہیں ہے۔ نہ وہاں

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر فروری ۲۰۰۱ء۔

آزادانہ الیکشن ہوتے ہیں اور نہ ہی امیدواروں میں آزادانہ مسابقت اور مقابلہ آرائی ہوتی ہے، یہ مصنوعی جمہوریتیں ہیں جو نتیجۃً وعملاً انفرادی حکومتوں اور ڈکیٹیٹر شپ سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں ہیں اور انھیں کسی بھی طرح جمہوری اور ڈیموکریٹک نظاموں اور حکومتوں میں شامل اور داخل نہیں کیا جاسکتا۔

رہی وہ جمہوریتیں جہاں واقعۃً جمہوری نظام کے تحت تمام مشروط حدود کی رعایت کے ساتھ پوری سیاسی آزادی حاصل ہے۔ ان میں ریاستہائے متحدہ امریکہ، ہندوستان اور وہ تمام ممالک آتے ہیں جہاں پوری آزادی واختیار کے ساتھ پبلک الیکشن ہوتے ہی امیدواروں میں کانٹے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ہمہ نوع کوششیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان ملکوں میں انتخابات پوری آزادی رائے کے ساتھ عمل میں آتے ہیں۔ امیدواروں میں گرما گرم مقابلہ پوری آزادی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ممالک حقیقت میں جمہوریت کہلانے کے مستحق ہیں، جہاں مختلف سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل ہیں، نہ وہاں امیدواروں پر کوئی پابندی اور حد بندی ہے نہ ہی ووٹرس پر اور نہ ہی کسی بھی نام سے اور کسی بھی مقصد کے لئے پارٹی سازی اور جماعت کی تشکیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہے۔

دوسری طرف دنیا میں بعض ایسے جمہوری ممالک بھی ہیں جہاں قانون سازی اور نظام حکومت میں عوام کا اشتراک محدود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عوام کو وہ آزادی، اختیارات اور تصرفات حاصل نہیں ہیں جو ہندوستان اور امریکہ وغیرہ کے جمہوری نظام میں مہیا نہیں، لیکن اس محدودیت کے باجود وہاں کا نظام پھر بھی جمہوری ہے، تمام تر حدود وقیود اور خاص طریقہ انتخاب اور بندشوں کے باوجود وہاں جمہوریت کی خوبو باقی ہے۔ کیونکہ حکام عوام میں سے منتخب ہوتے ہیں اور ایک غیر متعین مدت کے لئے وہاں کسی پارٹی یا خاندان کی حکومت پر اجارہ داری نہیں ہوتی ہے۔

سیکولرزم کی بھی جمہوریت کی طرح متعدد قسمیں اور شکلیں ہیں، سیکولرزم کو دوسرے لفظوں میں نامذہبیت (یعنی حکومت کا تابع مذہب نہ ہونا) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ سیکولرزم فی الواقع حکومت پر کلیسا کے اس تسلط کا ردعمل ہے جو یورپ کے تاریک عہد کی دین تھا، سیکولرزم نے انفرادی آزادی کا پوری طرح خاتمہ کردیا، اور یہ کارروائی یورپ میں نئی بیداری کے زمانہ کا فیض ہے۔

جمہوریت کے ارتقا کے ساتھ ہی سیکولرزم کا تصور بھی ارتقائی مراحل طے کرتا گیا، اس کی مختلف قسمیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس کی ایک قسم لبرل سیکولرزم ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس نظام میں دین اور حکومت میں باہم کوئی تصادم نہیں ہوتا مگر حکومت دین کے تسلط سے آزاد رہتی ہے، نیز وہ دینی امور میں دخل اندازی نہیں کرتی، وہ اکثریتی طبقہ کے مذہبی عقائد کی اور موروثی جذبات واحساسات کا پورا احترام کرتی ہے اور مذہبی اقلیتوں کو ان کے تشخص اور وجود کی حفاظت کا اور ان کی حیثیت اور اہمیت کے بقا کے تمام حقوق دیتی ہے اور پوری ضمانت دیتی ہے۔ اکثر یورپی ممالک میں اس لبرل سیکولرزم کے مطابق عمل جاری ہے اور نتیجۃً حکومت اور کلیسا کے مابین وہاں کوئی تصادم اور ٹکراؤ کی صورت نہیں نظر آتی۔ دونوں کے باہمی تعلقات استوار اور ہمدردانہ ہیں، باہمی تعاون کی بھی فضا ہے، کلیسا اپنی شاخوں اور شعبوں کے ساتھ پورے زور وشور سے مبشرین (مشنری مبلغین) کی تعلیم وتربیت میں اور ان کو تبلیغ کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیجنے کے کام میں معاون ہے۔ نیز مختلف اقتصادی، تعلیمی اور انسانی تنظیموں اور اداروں کی نگرانی بھی کررہا ہے لیکن وہ حکومت کے نظام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ حکومت اس مذہب کو سیکولر نظام کے لئے کوئی خطرہ باور کرتی ہے اور نہ ہی وہ راہب مردوں وعورتوں کو ملک کے کلچر وتہذیب کے حق میں مضرت رساں تصور کرتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا کی یہ ساری کارگزاریاں پس پردہ حکومت کے اداروں کے تعاون سے جاری ہیں۔

فی الوقت پورے عالم کی عیسائی مشینری تنظیموں اور اداروں کی سرگرمیوں کی جو رپورٹیں منظر عام پر آرہی ہیں اور یورپ کی سیکولر حکومتیں پوپ کی جو عزت واہمیت دے رہی ہیں ان کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ بالواسطہ طور پر (مغربی) حکومتی ادارے ان مشینریوں کی مدد ضرور کررہے ہیں۔

پوپ بار بار اعلان کرتے رہے ہیں کہ دوسرے ہزارے کے آخر میں افریقہ کو مسیحی افریقہ میں تبدیل کردیا جائے گا، اس بیان پر کسی کا احتجاج سامنے نہیں آیا، نہ اس اعلان کو دہشت گردی، بنیادی پرستی، اور قدامت پسندی کہا گیا اور نہ ہی اسے تہذیب وکلچر کے خلاف سمجھا گیا، یہ تنظیمیں افریقہ اور ایشیا میں جا بجا موجود ہیں اور ان کا دائرہ وسیع ہورہا ہے، افریقہ کے بعد انڈونیشیا عیسائی مشینری کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، یورپی سیکولر حکومتیں ان مشینری منصوبوں اور مقاصد اور طریقہ کار کا پورا تعاون کررہی ہیں اور عالمی پیمانہ پر عیسائیوں کے مفاد کے لیے کوشاں ہیں، ان حکومتوں کا کوئی وزیر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں بسنے والے عیسائیوں کی حمایت میں بیان جاری کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتا۔

مسیحیوں کے مسائل سے اس قدر دلچسپی اور وابستگی اور مغرب کی سیکولر حکومتوں کی طرفداری کا اظہار مسلم ملکوں میں ہونے والے مسلم وعیسائی تصادم کے مسئلہ پر یورپ کے خصوصی التفات سے ہوتا ہے۔

یورپی حکومتیں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت وعداوت اور مسیحی مذہبی اثرات سے متاثر ہوکر اسلامی تحریکات کی مخالفت اور بیخ کنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ان دشمنانہ اور منتقمانہ کارروائیوں کے پس پردہ جو حقیقت کارفرما ہے وہ یہ کہ تحریک اسلامی وسائل کی نافراوانی اور ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ اور میڈیا، تعلیم اور خدمت انسانی کے اعلیٰ وسائل پہ مکمل قابو یاب نہ ہونے کے باوجود دلوں کو فتح کرتی

اور عقلوں کو مسخر کرتی جارہی ہے۔ یورپ میں اسلام تیز روی سے اپنے سفر پر گامزن ہے، اسلامی بیداری روز افزوں ہے اور قبول اسلام کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے۔ اسی کا رد عمل ہے جو یورپ اسلام کے خلاف اپنے حملے تیز کررہا ہے اور مخالفانہ مہم میں تمام یورپی حکومتیں برابر کی حصہ دار اور مددگار ہیں اور اس کے لئے سیاسی اختلافات بھی بالائے طاق رکھ دیئے گئے ہیں، روس اور امریکہ میں باہم زبردست طویل ترین سیاسی اختلافات بھی ہیں باہم زبردست سیاسی اختلافات کے باوجود اسلام مخالف منصوبوں اور کارروائیوں میں جو اشتراک وتعاون پایا جارہا ہے اس سے ان کی ذہنیت اور مسیحیت سے تعلق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

یہ مشینری تنظیمیں بے پناہ وسائل کی مالک ہیں، کروڑوں ڈالر کی رقم لاکھوں مبلغین اور مشینری ورکرس اور رضا کاروں کے مصارف کے لئے مختص ہے، کشتیاں، بحری جہاز فضائی طیارے، حمل ونقل اور مواصلات کے اعلیٰ وسائل، سیٹلائٹ سسٹم، ریڈیو اسٹیشن، ٹی وی اسٹیشن کیا کچھ ان کے پاس نہیں ہے؟

یورپ کی سیکولر حکومتوں کے میڈیائی پروگراموں میں مذہبی مواد کو نشر کرنے کے خاص اوقات مقرر ہیں اور اسے سیکولر نظام کے منافی تصور نہیں کیا جاتا۔

ایک حد تک یہی رجحان ہندوستان میں ہے، ہندوستانی سیکولر حکومت کا پورا جھکاؤ اکثریتی طبقہ کے مذہبی اقدار کی طرف ہے، جس طرح یورپ مسیحیت کی گود میں بیٹھا ہوا ہے اسی طرح ہندوستان ان انتہا پسند ہندو تنظیموں کے حق میں بڑا نرم اور لچکدار رویہ اور موقف رکھتا ہے جو ہندو دیومالا (Mythology) ہندو احیائیت (Revivalism) اور پورے ملک کو ہندو راشٹر بنانے کی مہم لے کر آئے دن تشدد وفرقہ واریت کی آگ بھڑکا رہی ہیں۔

بعض ہندو تنظیمیں جن کا حکومت ہند سے براہ راست گہرا ربط ہے ہندوستان کو

جلد ہی ہندوراشٹر میں تبدیل کردینے کا اعلان کررہی ہیں اوران کے ممبران کو مسلمانوں اور مسیحیوں کے خلاف زہریلے بیانات دینے اور غلط ریمارک پاس کرنے میں ذرا سا بھی باک نہیں ہوتا، بلکہ وہ برملا یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ اگر مسلمان اور عیسائی ہندو مذہب قبول کرنے یا ہندو کلچر میں پوری طرح ضم (Mix) ہونے پر راضی نہیں ہوتے تو انھیں ہندوستان چھوڑ کر چلا جانا چاہئے، دوسری طرف قرآن کریم، اس کی تلاوت، اور لاؤڈ اسپیکر سے اذان پر پابندی، تاریخی یادگار، قدیم مساجد پر قبضہ وحملہ، اسلامی مدارس کو بند کرنے اور اسلامی تحریکات پر پابندی عائد کرنے کے مطالبے زور پکڑ رہے ہیں، اور جگہ جگہ انھیں عملی شکل دینے کی کوششیں بھی جارہی ہیں اور حکومت ان کی مذمت نہیں کرتی اور نہ کوئی اقدام کرتی ہے۔

یہ صورت حال بڑی افسوسناک اور المناک ہے کہ ہندوستان میں ہندو مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے لئے دل میں عداوت ونفرت کے جذبات کو مختلف تنظیمات کی طرف سے ہوا دی جارہی ہے، ان تنظیموں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہورہا ہے، ہندو مذہب کی حفاظت کے نام سے وسیع پیمانہ پر سلبی کارروائیاں ہوری ہیں اور رضا کاروں کو ہتھیار کے استعمال کرنے کی مشق کرائی جارہی ہے، طرفہ تماشا یہ کہ یہ ساری کارگذاریاں برملا پبلک میدانوں، سرکاری پارکوں، اسٹیڈیم اور سرکاری عمارتوں کے لان میں کھلے عام انجام پارہی ہیں، حکومت کے وزراء ان پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں اور اخبارو ں میں اسکی اطلاعات شائع ہوتی ہیں ، دوسری طرف اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیز کے نصاب تعلیم میں ترمیم، حتی کہ نئی تاریخ کی تصنیف کا عمل بھی چل رہا ہے، اور اس میں صرف اکثریت کے مذہبی تصور کو رائج اور عام کرنے کی خواہش دخیل ہے اس کے ساتھ ساتھ یورپی حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور مدد سے اسلامی بنیادی پرستی کے خلاف مہم بھی جاری ہیں۔

یہ وہ سیکولرزم ہے جس میں حکومت اکثریت کے مذہب کی مکمل نمائندہ اور مؤید ہوتی ہے، مگر ساتھ ہی اقلیتوں کے حقوق واقدار کی ضمانت کا دعویٰ ہی کرتی ہے، چنانچہ اقلیتیں اپنے قانونی حقوق کے ساتھ اس نظام میں رہتی ہیں لیکن اکثریت واقلیت کا فرق فطری ہے جو بڑا نمایاں رہتا ہے۔

سیکولرزم کی ایک دوسری قسم اشتراکی سیکولرزم ہے، اشتراکیت پوری طرح دین دشمن اور مذہب مخالف ہوتی ہے۔ اور یہ تمام مذاہب سے اس کا مقابلہ رہتا ہے۔

سیکولرزم کی ایک اور قسم ہے جو بعض اسلامی ملکوں میں رائج ہے، اس میں سرفہرست ترکی کی ''کمال اتاترک'' کی سیکولر حکومت آتی ہے۔ جو صرف مذہب اسلام سے عناد رکھتی ہے، یہ سیکولرزم کی عجیب وغریب قسم ہے جو صرف عالم اسلام میں پائی جاتی ہے، اور جس نے اپنے کو یا اپنے اسلام مخالف لشکر سے پوری طرح جوڑ رکھا ہے، اس سیکولرزم میں دوسرے مذاہب کو تو پورے حقوق ملتے ہیں حفاظت کی گارنٹی ہوتی ہے پر مسلمان جو اکثریت میں ہوتے ہیں، ان حقوق سے بالکل بہرہ مند اور لطف اندوز نہیں ہوسکتے، بلکہ ہر اسلامی عمل خیانت اور غدر باور کیا جاتا ہے، ترکی میں کمالی بغاوت کے بعد اور وسطی ایشیا کی اسلامی جمہوریاؤں نیز دوسرے عرب ملکوں میں اشتراکی بغاوت کے بعد سیکولرزم کے نام پر اسلامی وجود وتشخص کے خلاف بڑی سخت کارروائیاں ہوئی ہیں، اسلامی شخصیات کا صفایا ہوا ہے، جلاوطن کیا گیا ہے، بھاگنے پر مجبور کیا گیا ہے، دینی مذہبی مواد ضبط کیا گیا، الحاد ولادینیت کا فروغ ہوا، اسلام کی تعلیمات ونظام پر لعن طعن، اسلامی مقدسات کی بے حرمتی اور پامالی اور سیکولرزم کے نام پر قائم حکومتوں کی مکمل تائید وتعاون جیسی سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔

اس منفی (Negative) سیکولرزم سے ربط وتعلق ہی کا نتیجہ ہے جو یہ حکومتیں دنیا میں اسلامی مسائل کے حل اور تعاون سے گریزاں ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک

ہی میں اسلامی تحریکات کے خلاف سخت کارروائیاں دشمنان اسلام کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہورہی ہیں، اور وہ بانگ دہل اپنے ملکوں میں اسلامی اقلیتوں کے قلع قمع کی پوری کوشش کررہے ہیں اور مسلمانوں کے تئیں ان کا موقف بالکل منتقمانہ اور وحشیانہ ہوتا جارہا ہے۔ اسلامی اکثریت کے تئیں اسلامی حکومتوں کا یہ موقف اور رویہ یورپ میں رائج جمہوریت اور سیکولرزم کی شرائط سے پوری طرح مزاحم ومخالف ہے۔

جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ قوم اور عوام کی حکومت ہو، جس میں نہ فرد مسلط ہو اور نہ کوئی جماعت، جس میں قوم پورے حقوق سے بہرہ مند ہو، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے معاہدہ کا دارومدار جمہوری بنیاد پر ہے۔

سیکولرزم سے مراد حکومت کی نامذہبیت ہے اس میں حکومت کسی مذہب کی تابع اور پابند نہیں ہوتی اور نہ مخالف، اس لحاظ سے وہ ممالک جہاں حکومتیں اپنی اکثریت سے دست وگریباں ہوں اور اس کے مذہبی، عقائدی اور تہذیبی حقوق کی راہ میں حائل ہوں، انہیں نہ تو جمہوریت کے خانہ میں فٹ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ سیکولرزم کے مصداق بن سکتے ہیں، پھر ان کے اقدامات ان تہذیبی اقدار کے بھی خلاف ہیں جن کی دعوت یورپ نے دی، اور متمدن ملکوں نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور یورپ کے شانہ بشانہ ان تہذیبی اقدار کی پاسداری کرتے رہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض مسلم ممالک میں یورپ کے دباؤ یا اشتراکی نظریہ کے اثر سے اکثریت مخالف فضا پنپ رہی ہے اور ہوس اقتدار وجاہ، اور خواہش مال ومنصب نے ان کو دینی قدروں سے غافل کردیا ہے، جن پر ہماری فلاح ونجات کا سارا دارومدار ہے اور جن سے سرمو انحراف بھی ہمارے لئے خسارہ کا سودا ہے، ومن یتبع غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه، وهو فی الآخرة من الخسرین، اور وہاں عوام اور حکومتوں کے درمیان تصادم کا یہی اصل سبب ہے۔

جب اقدار کی کوئی بنیاد ہی نہیں تو مفاہمت کیسے ممکن ہو؟ (☆)

انسانی معاشرہ اور سماج ہر دور میں چند حقیقتوں اور معروف قدروں کا پابند رہا ہے، جن میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوا۔ جیسے عفت و پاکدامنی، سخاوت وفیاضی صدق وراستی، وفاشعاری اور ایثار، ہر دور میں مہذب انسان ان کا لحاظ رکھتا رہا ہے، اور ان کو اپنا کر فخر بھی کرتا رہا ہے، چنانچہ وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی تو گوارا کرسکتا ہے لیکن وہ چیز جو غیرت، خودداری وفاداری، سچائی اور بلند ہمتی کے منافی ہو، اسے برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ اوصاف انسانی شعائر اور اس کی اہم خصوصیات وامتیازات میں سے ہیں۔

مختلف مذاہب نے ان ثابت شدہ حقائق کی تائید وآبیاری کی، کبر ونخوت، خودپسندی اور منفی عصبیت کی آلودگیوں سے اسے صاف کیا، تاکہ یہ ذاتی تصورات معاشرہ کی تعمیر کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں، تمام مذاہب ایثار، غیرت وخودداری کے ساتھ تواضع اور سخاوت وفیاضی کے داعی ہیں، حیا اور پاکدامنی، عفت وعصمت جملہ مذاہب کی مشترکہ قدروں اور اخلاقی قانون کا اہم عنصر ہیں، منقول اقوال میں ہے: ''جب حیاء نہ رہے تو جو جی چاہے وہ کرو'' جو صفت حیاء سے عاری ہوتا ہے وہ آوارہ، بداخلاق اور گستاخ سمجھا جاتا ہے، حتی کہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ تصور پایا جاتا تھا۔

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/جون ۲۰۰۱ء۔

جدید تہذیب کے علمبرداروں کی پوری کوشش ان قدروں کے پامال کرنے اوران کے منافی امور اپنانے پر لگی ہوئی ہے اس لئے کہ ان کا نظریۂ ارتقاء ثابت شدہ امور وحقائق کو ماننے کے خلاف ہے۔ ہر چیز ان کی نگاہ میں تبدیلی کی محتاج ہے، حسن وقبح ان کی نظر میں کوئی ثابت شدہ چیز نہیں بلکہ ان کے نزدیک ہر دور کا اور ہر معاشرہ کا انسان اپنے تصور وخیال کے مطابق حسن وقبح، مفید وغیر مفید، اور نافع وغیر نافع کا تعین کرنے کا حق رکھتا ہے، ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز کسی زمانہ اور معاشرہ میں سودمند اور نفع بخش ہو، مگر دوسرے زمانہ ومعاشرہ میں وہ مضر قرار پائے۔

جمہوریت (DEMOCRACY) کی دعوت دینے والوں کا خیال ہے کہ انسان کی رائے اور خواہشات ہی قانون کی اساس وبنیاد ہیں اسی کے مطابق قانون وضع کئے جانے چاہئیں، سوشلزم واشتراکیت (SOCIALISM) کے حاملین تمام ثابت شدہ اقدار کے منکر ہیں، اور تجدد پسند طبقہ ہر پرانی چیز چھوڑ دینے حتی کہ معاشرتی رسم ورواج، اخلاقی ذمے داریوں سے بھی دستکش ہوجانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو معاشرہ میں رائج ہو اور جسے قبول عام حاصل ہو چکا ہو اسے چھوڑ دینا ان کی فکر سے میل کھاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے: انسان ہی ہر قانون وضابطہ کا سرچشمہ اور اساس ہے اور اسے حق ہے کہ جو قانون چاہے وضع کرے، یہ لوگ ایک عام دائرہ کا تعین کرتے ہیں، پھر اس کے عمومی تصور کی روشنی میں قوانین وضوابط طے کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا قانون وقاعدہ بنانا ممکن نہیں جو شہر یا وطن یا ملک کے مفاد کی (جس کا تعین وہ کرتے ہیں) کی خلاف ورزی کی اجازت دے اور جس سے ملک کی سیاست کے خلاف عمل کرنے کی گنجائش نکلے یا جس میں ان قوانین کی مخالفت لازم آئے جن کی صراحت ان کے طے شدہ آئین ودستور میں ہے جو بھی ان قوانین واصول کی خلاف ورزی کرتا ہے اُسے عدلیہ کے روبرو پیش کرکے سزا دلوائی جاتی ہے، البتہ ممبران

پارلیمنٹ کو قانون میں اصلاح و ترمیم کا حق حاصل رہتا ہے، اور اس طرح کی تبدیلیاں اور اصلاحات جمہوری ملک کے قوانین میں ہوتی رہتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں قوانین میں ردوبدل کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے، یہاں تک کہ انسانی تصور کے ثابت شدہ حقائق پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا ہے، چنانچہ کئی یورپین ممالک کے قوانین میں شراب نوشی، قمار بازی، اور موروثی ازدواجی تعلقات کی بابت ترمیمات ہوئی ہیں جس کے نتیجہ میں گذشتہ ادوار میں جو ناجائز اور مبغوض تھا اسے سند جواز اور مقبولیت مل گئی، قانون سازوں کی فکر کا محور یہ ہے کہ جس عمل کو بھی قبول عام حاصل ہو جائے اس کی تکمیل میں اگر قانونی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں حائل ہوں تو کوئی نیا قانون وضع کر کے اسے دور کر دینا چاہئے تاکہ کسی کو اپنے نفس اور انسانی مصالح کی خلاف ورزی نہ کرنی پڑے۔

اس نقطۂ نظر کی روشنی میں خیر شر اور شر خیر بنتا جا رہا ہے، بدی نیکی اور نیکی بدی کا روپ دھار رہی ہے، چونکہ یورپ میں ادیان و مذاہب، تہذیب و تمدن کے ہم رکاب اور پیرو ہیں۔ اس لئے متدین طبقہ بھی اس نظریہ و خیال کا ہم نوا بنتا جا رہا ہے۔ کہ جو بھی چیز قبول عام حاصل کر لے اور جس کا چلن عام ہو جائے، اگرچہ وہ دینی فکر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اسے دینی اعتبار سے جائز قرار دیا جائے۔ جیسا کہ قانونی اعتبار سے اُسے جواز ملا ہوا ہے۔

تہذیب نو کی فکری اساس میں بہت سے تناقضات و تضادات ہیں جن کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب ان کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔ ایک طرف مغرب اپنے ملکوں میں فکر و رائے عمل و پیشہ اور آمدنی و کمائی کی آزادی کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف ایسی سیاست کھیلتا ہے جو دوسرے ملکوں میں آزادی کو اس کی تمام قسموں سمیت سلب کر لیتی ہے، مغرب کی آزادی کا تصور صرف اخلاق کے دائرہ میں محدود ہے،

سیاست اور مذہب پر اس کا انطباق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ثقافت کے بارے میں مغرب اپنی ثقافت رائج کرنے پر مصر ہے۔ مگر دوسروں کی ثقافت کا سخت مخالف ہے، دین و مذہب کے بارے میں بھی اس کا یہ رویہ اور طرز عمل ہے، دور منفی اور متناقض پالیسی سے مغرب پوری دنیا میں نصرانیت کی ترویج کی کوشش کرتا ہے، اور جب مغربی ممالک کے اقتصادی ادارے عیسائی بنانے کی مہم میں مالی تعاون فراہم کرے عیسائی مشن کا جال بچھانے اور مشنری اسکول، مسیحی امتیازات کی حامل ویلفیر سوسائٹیوں (WELFARE SOCIETIES) کے قیام میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے اہل قلم دوسرے مذاہب پر تنقیدی کتابوں کی اشاعت ان کے عقائد اور دوسری تہذیب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں تو مغرب اسے دقیانوسی اور رجعت پسندانہ عمل کا نام نہیں دیتا۔ بلکہ وہ اسے آزاد خیالی اور اظہار رائے قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کا جواب دیتا ہے تو یہ جواب آزادیٔ اظہار رائے کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اسلامی عمل اسلامی تنظیموں اور مسلمانوں کی اسلامی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کی اتباع کرنے کی دعوت کو رجعت پسندی اور دقیانوسیت کہا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر اسے دہشت گردی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آزاد خیالی (LIBERALIASM) جس کی دعوت اباحیت، ذاتی اور پرائیویٹ معاملات میں دخل اندازی نہ کرنا، کسی اصول کے ماننے پر کسی کو مجبور نہ کرنا، کسی عمل کو بہتر سمجھ کر کسی پر لازم نہ کرنا، اور نہ ہی کسی کو برا سمجھ کر اس سے روکنا ہے۔ بیرونی دنیا میں مانے جانے والے دیگر عقائد اور دعوتوں کے تئیں مغرب کے رویہ اور موقف کو قطعاً سند جواز فراہم نہیں کرتی۔

اس آزاد خیالی کا تقاضا یہ ہے کہ خیر کی طرف بلانا، نیک اعمال پر عمل کرنا اور اس کی طرف بلانا، برے اعمال سے بچنا اور اس سے باز رکھنا چھوڑ دیا جائے۔ اور کوئی

ایسا کام نہ کیا جائے جس سے دوسروں کے داخلی وذاتی امور میں دخل اندازی ہوتی ہو، کیوں کہ مغرب فرد کی مطلق آزادی کا داعی ہے، کسی کی سرگرمیوں اوراس کے طرز زندگی پر کسی بھی قسم کی پابندی نہ لگانے کا علمبردار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر فرد آزاد ہے جو کرنا چاہے کرے، جو طرز زندگی اپنے لئے بہتر سمجھے اپنائے، جسے اس کا ذہن قبول نہ کرے چھوڑ دے، کسی کو اس کا حق نہیں کہ جس چیز کو وہ اچھا اور بہتر سمجھے اُسے اُس پر تھوپنے کی کوشش کرے، جو اسے بہتر نہیں خیال کرتا، لیکن یہی آزادی کا داعی مغرب دوسرے ملکوں پر اپنے تصورات تھوپنے پر مصر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب ثابت شدہ امور میں سے اسلامی دشمنی اور اچھی قدروں کی پامالی کے سوا کسی چیز کو نہیں مانتا، اور شخصی زندگی، قومی زندگی میں کسی بھی قسم کی پابندی عائد کرنا نہیں چاہتا۔ وہ طرز عمل، اخلاقی مکاتب فکر میں مکمل آزادی کا خواہاں ہے، حالانکہ ظلم وزیادتی، بدزبانی وبدکلامی، رحمت وشفقت، نرمی ومہربانی، محبت ومودت، ادب واخلاق اور عظمت وبلندی کے معانی ومطالب طے شدہ اور مقرر ہیں، چنانچہ ظلم وزیادتی کرنے والے کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ بہت نرمی پسند اور احسان کرنے والا ہے، اور نہ ہی بداخلاق وبے ادب کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ بہت بااخلاق اور باادب ہے، اسی طرح زندگی اور اسے برتنے اور لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے کے انسانی موقف ونظریات کے سلسلہ میں کچھ ثابت شدہ تصورات وخیالات ہیں۔ مادیت کا پرستار مغرب، جو ان تمام حدود وقیود سے آزادی کا نعرہ لگاتا ہے ان ثابت شدہ امور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس تضاد کی بنا پر مغرب اور مشرق کے درمیان مصالحت کس بنیاد پر ہوسکتی ہے؟ کسی بھی ایسے انسان کے ساتھ گذارا کیسے ہوسکتا ہے جس کے نزدیک ثابت شدہ قدریں اور ناقابل تسلیم نمونے نہ ہوں۔ جب ایک فریق چند تصورات کا پابند ہو اور دوسرا ان کا مخالف ہے، تو ان میں اتفاق کی سبیل کیا ہوسکتی

ہے اور جب ایک فریق چند ثابت شدہ تصورات کا منکر ہو اور دوسرا ان کا قائل و متبع، تو پھر دونوں میں ہم آہنگی اور سمجھوتہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

یورپ کے مفکرین، حکام، سیاسی قائدین کے ساتھ معاملہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور دشواری یہی ہے، اور اس کو دور کیے بغیر سمجھوتہ اور اتفاق رائے ایک خواب وخیال ہی ہے۔ اتفاق کی شکل صرف غلامی ہے اور یہی غلامی یورپ کو مطلوب ہے اور نئے نظام کا مطلب ومقصد یہی ہے کہ ساری دنیا اقدار چھوڑ کر مغربی تصورات کی پابند ہو جائے۔

ایک آقا اور سب محکوم (☆)

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور محکمہ دفاع پنٹاگن پر ہونے والے حالیہ حملوں کی پوری دنیا نے مذمت کی ہے، ہر کسی نے انسانی جانوں کے نقصان پر امریکہ سے ہمدردی کا اظہار کیا، عالم اسلام نے حکومتی سطح پر بھی اس کی مذمت کی، اور مذہبی تنظیموں کی طرف سے بھی اس کی مذمت کی گئی، یہاں تک کہ ان حلقوں نے بھی انسانی جانوں کے نقصان پر رنج کا اظہار کیا جو امریکہ کی پالیسیوں کے اختلاف رکھتے ہیں، اخوان المسلمین کے ممتاز رہنماؤں نے بھی اس کی مذمت میں بیانات دیئے، اور اس کو غیر انسانی فعل قرار دیا، اس جارحیت کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ اب تک اس کا پتہ نہیں لگایا جاسکا، بہت سے مبصروں کا خیال ہے کہ یہ ''کارروائی'' یہودیوں نے کی ہے، اس رائے کی تائید میں بہت سے شواہد اور ثبوت بھی پیش کئے گئے ہیں، بعض تجزیہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ یہ ''کارروائی'' ان امریکن دہشت گرد افراد یا تنظیموں کی ہے جو امریکہ میں سرگرم عمل ہیں، اور ان کے سیاسی، مذہبی اور معاشی مقاصد ہیں، اس طرح کی جارحانہ کارروائیاں پہلے بھی ہو چکی ہیں، (مثلاً ۱۹۹۳ء میں نیویارک ورلڈ سنٹر میں دھماکہ ہوا، ۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء میں ''اوکلاہوما'' میں دھماکہ کیا گیا) اس وقت بھی اسلامی عناصر پر شبہ کیا گیا، مگر جلد ہی ثابت ہو گیا کہ خود امریکی دہشت گردوں کی کارروائی ہے، موجودہ کارروائی کے پہلے ہی دن سے اسلامی عنصر کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا، اور اسی پر سارا زور صرف کر دیا گیا، دیگر عناصر اور امکانات سے یکسر چشم پوشی کر کے ایک ''موہوم'' دشمن

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/نومبر ۲۰۰۱ء۔

کے خلاف کارروائی شروع کردی گئی، اور اس شدت سے عالمی میڈیا نے پروپگنڈہ شروع کیا کہ سارے دوسرے احتمالات دب کر رہ گئے، یہاں تک کہ صلیبی جنگ تک کی دھمکی دی گئی، اور اس سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی جنگ کی دھمکی دی گئی، یہ ساری چیزیں اس بات کا مظہر ہیں کہ مسئلہ صرف امریکی شہروں پر حملہ کا نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی خاص جماعت یا ایک ایسے خاص ملک پر حملہ کرنا مقصود ہے جہاں کا دستور اور نظام حکومت اس عالمی طاقت کو پسند نہیں ہے۔

اس سے پہلے دنیا کے بہت سے ملکوں میں سیاسی اور نظریاتی اسباب کی بنیاد پر سیاسی نظام کو عوام کی مرضی کے خلاف بدلا گیا، اور ایسا نظام نافذ کیا گیا جو یورپی ممالک کی مرضی ومنشاء کے موافق ہے، اور اس میں ان کے مفادات کی حفاظت ہے، جن ملکوں نے اس نظام کو قبول کرنے سے انکار کردیا انھیں دہشت گرد قرار دے کر ان پر اقتصادی اور معاشی پابندیاں عائد کردی گئیں، اور ان کی مالی امداد روکی گئی، اصلاحی تحریکات کے خلاف انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا الزام لگا کر ان کے خلاف کارروائیاں شروع ہوگئیں، افغانستان کا بھی شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جن ملکوں نے امریکہ کی اطاعت اور مغربی تہذیب پر عمل کرنے سے انکار کردیا، مغربی میڈیا افغانستان کے خلاف عرصہ سے مہم چلا رہا تھا، اور وہاں کے نظام کو خوفناک شکل میں پیش کررہا تھا، اس واقعہ سے اس مہم میں اور شدت پیدا ہوگئی، اور اس واقعہ کی ساری ذمہ داری اس پر ڈال کر بموں، راکٹوں اور میزائلوں کی بارش شروع کردی گئی، اور پوری دنیا اس خونچکاں ڈرامہ کا تماش بینوں کی طرح نظارہ کررہی ہے، اس لئے کہ اس کا عنوان دہشت گردی کے خلاف جنگ رکھا گیا، جس سے کسی ملک کو کیا اختلاف ہوسکتا ہے۔

اس عنوان کے تحت امریکہ کی مہم صرف ایک ملک کے خلاف نہیں ہے، بلکہ امریکہ نے ان تمام ملکوں کے خلاف کارروائی کرنے کی دھمکی دی ہے، جن کو وہ اپنے

نظریہ کے مطابق دہشت گردی کی پناہ گاہ سمجھتا ہے جس سے عملاً اس نے اسرائیل کو مستثنیٰ کردیا ہے، ایسے ملکوں کی لسٹ بڑی طویل ہے، اس واقعہ کی ذمہ داری اسلامی دہشت گردی پر ڈالنے کی وجہ سے اور اشتعال انگیز بیانات کی وجہ سے پوری دنیا میں مسلمان خوف وہراس کے عالم میں ہیں، عالمی میڈیا کے زبردست پروپیگنڈہ کی وجہ سے پوری دنیا میں اسلام اور مسلم مخالف لہر چل پڑی ہے، مغربی اور یورپی ملکوں کے مختلف شہروں میں مسلمانوں پر حملے ہوئے اور اسلامی سنٹروں اور مسجدوں کو جلایا اور تباہ کیا گیا، جگہ جگہ دہشت گردی کے الزام میں مسلمان شہریوں کو گرفتار کیا گیا اور ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں لگائی گئیں اور مالی امداد کے راستے بند کئے گئے، عالمی ذرائع نشر واشاعت اسلامی دہشت گردی کو وقت کا اہم موضوع بنا کر پیش کررہے ہیں، اس طرح یہ جنگ درحقیقت پوری مسلم دنیا کے خلاف ہے، اور یہ کارروائی کثیر الجہات اور کثیر المقاصد ہے، یہ اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس ''کارروائی'' کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، اس لیے کہ خود اس کارروائی کے ذمہ دار ایسے بیانات دے رہے ہیں کہ یہ صرف ابتداء ہے اور یہ کارروائی طویل المدت ہے، لہٰذا امن پسند قائدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کارروائی کو جو امن عالم کے لئے خطرہ بن سکتی ہے، محدود کرنے اور جلد ختم کرنے کی کوشش کریں ورنہ آگ جب بھڑکتی ہے تو پڑوس کے مکانات بھی اسکی زد میں آجاتے ہیں۔

آج پوری دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ ریڈیو پر خبریں سننے والے اور ٹی وی پر واقعات وحادثات کا مشاہدہ کرنے والے اگر وقفہ ہوجائے تو نہیں جانتے کہ اس دوران دنیا میں کیا واقعات رونما ہوئے؟ ذرائع نشر واشاعت واقعات وحادثات کا مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے جائزہ لے رہے ہیں، جس کی وجہ سے بے چینی، اضطراب اور تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا ہے

لیکن تمام مبصروں اور تجزیہ نگاروں کا یہ اتفاق ہے کہ مقابلہ دو ایسے فریقوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک ناقابل تسخیر عالمی طاقت کا مالک ہے اور اس کے اتحادی بھی عالمی طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ دوسرے فریق کا شمار انتہائی پسماندہ اور غریب ملکوں میں ہوتا ہے، اس کو جنگوں اور خانہ جنگیوں نے نڈھا کر دیا ہے، ایک عربی رسالہ نے لکھا ہے کہ ''مقابلہ ہاتھی اور چیونٹی کے درمیان ہے'' ایک کا خیال ہے کہ مقابلہ بھیڑیئے اور بکری کے درمیان ہے۔

ماضی میں جنگیں دو برابر کے فریقوں کے درمیان ہوا کرتی تھیں، عربی شاعری میں جو زیادہ تر رزمیہ شاعری ہے، شاعر اس پر فخر کرتا ہے کہ اس نے اپنے سے زیادہ طاقتور سے یا کم سے کم اپنے جیسے بہادر اور مسلح سے مقابلہ کیا، دونوں عالمی جنگیں بھی دو مساوی فریقوں کے درمیان ہوئیں، جس میں سے ہر فریق کے پاس زبردست طاقت وقوت، جنگی ساز وسامان اور وسائل موجود تھے، اور دونوں کی قوت وصلاحیت برابر تھی۔

اسی طرح سرد جنگ بھی دو برابر کے حریفوں کے درمیان عرصہ تک چلتی رہی، جو سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں کے درمیان اور مغربی ملکوں کے درمیان دائر تھی، دفاعی مبصرین اور تجزیہ نگار دونوں فریقوں کی طاقت وقوت کا اندازہ لگانے میں حیران وپریشان اور سرگرداں تھے، دونوں کے جنگی وسائل وامکانات اور دفاعی اسباب اور توانائیاں برابر تھیں، چنانچہ دونوں فریقوں کے درمیان سرد جنگ سرد جنگ ہی رہی، نقصانات اور بدترین نتائج وانجام سے بچنے کی خاطر براہ راست مقابلہ آرائی سے دونوں پرہیز کرتے رہے اور نئی عالمی جنگ کے خطرہ کی وجہ سے آمنے سامنے مقابلہ سے ڈرتے رہے، اس دوطرفہ خوف کی وجہ سے براہ راست ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

ان دونوں طاقتوں کے علاوہ ایک تیسری طاقت بھی تھی، جو ان دونوں عالمی طاقتوں کے درمیان حائل تھی، یہ وہ غیر جانب دار وناوابستہ ممالک کا بلاک تھا جو اپنی

تعداد، آبادی کے تناسب، طبعی ذخائر اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کی وجہ سے وزن رکھتا تھا اور دونوں بڑی طاقتوں کو اس کی ضرورت تھی، اقوام متحدہ میں اس کے ممبروں کی اچھی خاصی تعداد تھی اور بڑے ممالک کے مفادات بھی اس سے وابستہ تھے اور بین الاقوامی فورموں میں دوسرے ملکوں کو اس بلاک کی تائید وحمایت کی ضرورت بھی پڑتی تھی، ان ساری وجوہ کی بناء پر اس تیسرے بلاک کا کافی وزن اور اثر ورسوخ تھا۔

مذکورہ بالا اسباب وعناصر کی وجہ سے اس بلاک میں دوسروں کو جارحانہ کارروائیوں سے باز رکھنے کی قوت وصلاحیت تھی، اس تیسری طاقت میں جنگ نہ ہونے دینے یا ایک علاقہ سے دوسرے علاقوں میں جنگ کے اثرات منتقل نہ ہونے دینے کی بھی طاقت وقوت تھی، جیسا کہ اس تیسرے بلاک کی طاقت وقوت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب تین ملکوں نے مل کر مصر کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کی یا اس وقت جب ایک عالمی طاقت نے ایک چھوٹے سے ملک کو دھمکی دی، اسی طاقت کے توازن کی وجہ سے ''کیوبا'' جس کا ''امریکہ'' دشمن تھا، امریکی کارروائی سے محفوظ رہا، یہ بلاک مظلوموں اور متاثرین کی امداد کرنے میں پہل کرتا تھا، یا ثالثی کا رول ادا کر کے ''تناؤ'' کی تیزی وشدت کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

لیکن آج جو صورت حال ہے وہ یکسر مختلف ہے، آج مقابلہ دو ایسے فریقوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک فریق عظیم عالمی طاقت کا مالک ہے بلکہ بزعم خود پورے عالم کا آقا بنا ہوا ہے اور اس کے اظہار میں انانیت، غرور، تکبر، گھمنڈ، نخوت وپندار اور بالادستی کا پورا پورا مظاہرہ ہو رہا ہے اور جو لوگ اس کی انتقامی کارروائیوں اور اس کے دشمن کو دشمن سمجھنے اور اس کے مقصد کی تکمیل میں ساتھ نہیں دے سکتے ان کو وہ چیلنج کر رہا ہے، اس موقف کے شواہد وبیانات ہیں جو امریکی شہروں پر ہوئے حملوں

کے بعد منظر عام پر آئے ہیں، اس فریق کے پاس تخریب وتباہی اور بربادی مچانے والے تمام وسائل موجود ہیں، قوموں کی تسخیر اوران کو اپنا ہم خیال بنانے کے سارے وسائل مہیا ہیں، اسی طرح اس کے پاس ذرائع ابلاغ کا ایسا نظام ہے جو دن کو رات، رات کو دن، رائی کو پربت، پربت کو رائی بنا دیتا ہے اور دوسرا فریق مادی اور عسکری وسائل واسباب بلکہ ہر اعتبار سے انتہائی کمزور اور مفلوک الحال ہے، طویل جنگوں نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، جس کی وجہ سے اس کی اقتصادیات بالکل تباہ وبرباد ہوگئیں، دوسری طرف رہی سہی کسر خانہ جنگیوں نے پوری کردی، روس سے طویل جنگ کے دوران بموں، راکٹوں اور میزائلوں کی بارش کی وجہ سے یہاں کی زمین بھی قابل کاشت نہیں رہی، لاکھوں شہری پڑوس کے ملکوں میں پناہ گزیں ہیں، اور اقوام متحدہ کی جانب سے ان کے لئے غذا فراہم کی جارہی ہیں، بعض اعداد وشمار کے مطابق افغانستان میں معذور بچوں کی تعداد نصف ملین ہے اسی طرح پچھلی جنگوں کے دوران بینائی اور ہاتھ پیر سے محروم ہوجانے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ چکی ہے، اس ملک میں طبی امداد اور غذائی اجناس صرف ایک ہی راستہ سے پہنچتی ہیں اور یہ ملک انتہائی درجہ کی غربت کا شکار ہے، ابھی حال ہی میں مالدار ملکوں کی جانب سے ریلیف اور امداد کا کام کرنے والے مختلف ادارے اور تنظیمیں افغانستان پہنچی تھیں، تاکہ یہاں ریلیف اور انسانی خدمت کا کام انجام دیا جاسکے لیکن ان اداروں اور تنظیموں نے غربت اور افلاس کا استحصال کرتے ہوئے اس ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کردی اور فقر وفاقہ سے دوچار افغانی باشندوں کو عیسائی بنانے کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ انسانی خدمت کے نام پر عیسائیت کی تبلیغ کرنے پر جب کارروائی کی گئی تو ساری دنیا کے پریس اور مغربی ملکوں کی حکومتوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا، اور اقتصادی پابندیاں جو پہلے سے عائد تھیں ان میں اور شدت پیدا کی گئی۔

اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے افغانستان دنیا سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا تھا، کیونکہ یہاں کے مذہبی نظام کی وجہ سے دنیا نے اس کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور پھر یہ ملک واقع بھی پہاڑوں کے درمیان ہے صرف ایک تنگ گزرگاہ ہی پڑوسی ملکوں سے اس کے رابطہ کا ذریعہ ہے، اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے اس ملک کو ریلیف اور امداد کی سخت ضرورت تھی، ملک کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ جنگوں سے نڈھال اور تباہ حال باشندوں کی جان بچانے کے لیے اور یہ ان ترقی یافتہ ملکوں کی ذمہ داری بھی تھی جو فقر و فاقہ اور ناخواندگی اور جہالت کا مقابلہ و خاتمہ اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور حقوق انسانی کی حفاظت کو اپنا شعار گردانتے ہیں، لیکن آج یہ مفلس افغانستان ایک شبہ کی بنیاد پر عالمی امیر امریکہ کے ظلم و تشدد اور جارحانہ حملوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

موجودہ صورت حال کو سابقہ صورت حال سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ آزادیٔ رائے کا حق سلب کر لینا ہے، چنانچہ امریکہ کی اس انتقامی کارروائی کی جو تائید وحمایت نہیں کر رہا ہے، اسے مفروضہ دشمن کا اتحادی سمجھا جا رہا ہے، نتیجتاً وہ بھی ایسی ہی جارحانہ کارروائیوں کا شکار ہونے کے خطرہ میں ہے۔

موجودہ تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ صرف ایک ملک پوری دنیا میں اپنا تصور اور فیصلہ مسلط کر رہا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے نقشہ کو تبدیل کر دینے کی دھمکی دی جا رہی ہے، اور اختلاف رکھنے والوں کو عبرتناک اور بدترین انجام ونتائج سے ڈرایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ غیر جانب دار رہنے کی بھی اجازت نہیں، ایسی صورت میں کوئی ملک یہاں تک کہ سابق سپر پاور بھی اپنی رائے ظاہر کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

یہ مسئلہ ابھی تک معمہ بنا ہوا ہے کہ امریکہ پر ہوئے حالیہ حملوں کا ذمہ دار کون ہے؟ خود امریکہ اپنے دعوے کو اب تک ثابت نہیں کر سکا ہے، امریکہ کی مطلق العنانی

اور انتقامی کارروائی موجودہ انسانی دنیا کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی ملک امریکہ کی انتقامی کارروائی اور جنگی جنون کا شکار ہوسکتا ہے، یہ کارروائی سامراجی عہد کی یاد تازہ کرتی ہے، لیکن سامراجی عہد میں سامراجی ممالک بھی باہم دست وگریباں تھے، اور آپس میں برسرپیکار تھے، ان کے مفادات مختلف تھے، برطانیہ فرانس سے مقابلہ کررہا تھا اور امریکہ روس سے، اور جرمنی کا ان سب سے مقابلہ تھا، اور یہ باہمی رسہ کشی اور کشمکش مظلوم ومقہور ملکوں کے لیے بحرانوں اور مسائل سے نجات پانے کا ذریعہ تھی، اسی طرح دو طاقتور بلاکوں کا وجود بھی کمزور ملکوں کی خلاصی اور نجات کا ذریعہ تھا، لیکن آج پوری دنیا ایک ''سپر پاور'' کے رحم وکرم پر ہے، اور یہ طاقت اپنی منشاء ومرضی کے مطابق کارروائی کررہی ہے، کوئی ملک اس کو چیلنج کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا، گویا موجودہ صورت حال ''گلوبلائزیشن'' کا پہلا مظاہرہ ہے، جس کی تشریح میں تمام اہل رائے اور مفکرین حیران وپریشان اور سرگرداں تھے، لیکن اس واقعہ سے اس کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے اور یہ اس کی ابتداء ہے، اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک آقا اور سارا عالم محکوم۔

سامراجی منصوبے (☆)

قیام امن کے نام سے امریکہ اور یورپ کی جانب سے مشرق وسطیٰ سے متعلق منصوبے پیش کیے جارہے ہیں جن کا مقصد شرق اوسط میں تبدیلیاں لانا ہے تا کہ نام نہاد اسلامی دہشت گردی کے اسباب کا خاتمہ کیا جاسکے، ان منصوبوں کا بنیادی اور مرکزی مقصد یہ ہے کہ شرق اسلامی کے سیاسی، تعلیمی اور بیتی نظام میں تبدیلیاں کی جائیں اور بعض ملکوں کی نئی حد بندی کی جائے۔

ان منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ ''ترکی تجربہ'' کا اعادہ کیا جائے، لیکن خود ''ترکی تجربہ'' اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے مسائل حل نہیں ہوسکتے، ترکی نے مغرب کے تمام منصوبوں اور پلانوں کو نافذ کیا، مغرب کے مطالبات پورے کئے، اپنے مغربی حلیفوں کو مکمل تعاون دیا، رسم الخط بدلا، عربی اذان پر پابندی لگائی، مدارس بند کئے، اسلامی شعائر پر پابندی عائد کی، پردہ پر پابندی لگائی، مغربی لباس کو لازمی قرار دیا، سر ڈھکنے کو ممنوع قرار دیا۔ دین مخالف سیکولرزم کو اختیار کیا، یہودیوں کے ساتھ تعلقات استوار کئے، حرام کو حلال قرار دیا، اور حلال کو حرام ٹھہرایا، لیکن ان سارے اقدامات کے باوجود ترکی کو اقتصادی اور سیاسی ترقی نصیب نہ ہوسکی، نہ تو ترکی یورپین ملکوں کی برابری کرسکا، اور نہ ان مغربی ممالک کا اعتماد حاصل کرسکا، حتی کہ مسلسل کوششوں کے باوجود اب تک یورپین یونین کا ممبر بھی نہیں بن سکا، ترکی سے یورپ کے اسلام مخالف منصوبہ کے تحت مزید اقدامات اٹھائے جانے کا مطالبہ کیا

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رمئی ۲۰۰۴ء۔

جارہا ہے، اسی ضمن میں آج کل قبرص کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے، اور اس کے لئے مختلف پلان زیرغور ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''ترکی تجربہ'' سے شرق اوسط کے مسائل کیسے حل کئے جاسکتے ہیں، اور وہ ''کمالی پالیسی'' دوسرے ملکوں کو کیا فائدہ پہونچائے گی، جو خود ترک قوم کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی تھی۔

امریکی منصوبہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جمہوری نظام رائج کرنا چاہتا ہے، لیکن ترکی اور الجزائر میں عالمی طاقتوں کے ہی حکم پر جمہوریت کا خون کیا گیا، اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ڈکٹیٹرانہ وآمرانہ نظاموں کو خود امریکہ کی سرپرستی وپشت پناہی حاصل ہے، جہاں نہ آزادانہ الیکشن ہوتے ہیں اور نہ سیاسی پارٹیوں کو آزادی حاصل ہے، اور نہ وہاں آزاد عدالتی نظام قائم ہے۔

اگر واقعی امریکہ اپنے منصوبہ کے تئیں مخلص ہے اور جمہوریت کو بحال کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے ترکی میں رفاہ پارٹی اور الجزائر میں انقاذ پارٹی کی بحالی کے اقدامات کرنے چاہئیں، جن ملکوں میں مطلق العنانی اور ڈکٹیٹرشپ کا دور دورہ ہے وہاں شہری آزادی کو بحال کرانا چاہئے، نیز آزادانہ انتخاب کی راہ ہموار کرنا چاہئے، لیکن آزادانہ انتخاب سے امریکہ اور امریکہ نوازوں کو خطرہ ہے کہ اس سے اسلام پسند اقتدار میں آجائیں گے جیسا کہ مصر کے صدر حسنی مبارک نے خدشہ ظاہر کیا، ان حالات میں جمہوری نظام کس طرح قائم ہوسکتا ہے۔

یہ صورت حال جنگ عظیم کے خاتمہ کے وقت کی صورت حال کی یاد دلاتی ہے، یہ منصوبے ان منصوبوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں، جو پہلی عالمی جنگ عظیم کے بعد پیش کئے گئے تھے، اور ان میں سے بعض پر عمل بھی ہوا، اور عالم اسلام کا نیا نقشہ سامنے آیا، اس وقت ترکی خلافت عثمانیہ کی شکل میں ایک بڑی اسلامی مملکت تھا، جس کے زیرنگیں (زیرانتظام) ایشیا، افریقہ، اور یورپ کے بڑے علاقے تھے، جرمنی کا حلیف ہونے کی

وجہ سے اسے بڑے سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا، ان منصوبوں میں ترکی کی تقسیم کا بھی منصوبہ تھا، جس کو مغربی ملکوں نے مرد بیمار سے تعبیر کیا تھا نتیجہ میں یہ عظیم اسلامی سلطنت ایک بے حیثیت وغیر مؤثر ہو کر رہ گئی، مغربی تہذیب ومعاشرت اس پر مسلط کردی گئی، عالم اسلام خصوصاً عالم عربی سے اس کا ناطہ توڑا گیا، اس کی اسلامی شناخت ختم کی گئی، وہاں کا نظام تعلیم، نظام قضاء اور سیاسی نظام یکسر بدل دیا گیا، اسلامی نظام کے بجائے وہاں سلبی سیکولرزم یا مذہب مخالف سیکولرزم کو رواج دیا گیا اور اس نظام کو استحکام بخشا گیا جو ترکی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے راستہ میں اب تک رکاوٹ بنا ہوا ہے، فوج کو اس کا محافظ بنا دیا گیا، اس کی وجہ سے جب بھی کوئی قومی حکومت اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو فوج حرکت میں آجاتی ہے، اور اس سیاسی نظام کو ختم کردیتی ہے، صدر مملکت کو بھی کچھ خصوصی اختیارات حاصل ہیں جو قومی حکومت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں کے غلبہ اور ترکی کی بے بسی کی وجہ سے قسطنطنیہ کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا، لیکن عالمی طاقتوں کی باہمی چپقلش اور رسہ کشی نے اس کی واپسی میں رکاوٹ پیدا کردی، عالم عربی نے قومیت کی بنیاد پر علیحدگی اختیار کی، مگر وہ قومیت کے نام پر متحد ہونے کے بجائے مزید انتشار کا شکار ہوا، اس طور پر عالم عربی میں علاقائیت اور نسلی عصبیت کے رجحانات پیدا کردیئے گئے اور انہیں تقویت دی گئی جس کی وجہ سے عالم عربی جس کو قومیت کی بنیاد پر متحد ہونا چاہئے تھا علاقائی عصبیت (متعصّبانہ ذہنیت) کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں، سلطنتوں اور ملکوں میں تقسیم کردیا گیا، ایک ملک کو تین ملکوں میں تقسیم کیا گیا، قوم کے مزاج کے خلاف مغربی سیاسی، تعلیمی وثقافتی نظام نافذ کردیا گیا، جس نے قومی تعمیر اور دین وملت کی خدمت کے بجائے اپنی ساری توانائی سیاسی اور علاقائی کشمکش، مغربی اور مشرقی تہذیب کے درمیان ٹکراؤ پر صرف کی، حکام اور قوم کے درمیان خاص طور پر اسلام

پسندوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کیا گیا، اسلامی تشخص اور مشرقی تہذیب کو کمزور کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے، چنانچہ مغربی سامراج کے مفادات کی خدمت اور اس کے نظریات وخیالات کو اپنانے اور اس کے منصوبوں کے نفاذ وتکمیل کی وجہ سے پوری امت اسلامیہ افتراق واختلاف، انتشار وخلفشار، تفرقہ، ملکی اور علاقائی عصبیت اور تہذیبی تصادم کا شکار ہوگئی، وہ مسلمان جو بڑے فخر واعزاز کے ساتھ ''میں مسلمان ہوں، اور مسلمان میرا بھائی ہے'' کہتا تھا، اب یہ کہنے لگا کہ ''میں مصری ہوں'' ترکی ہوں، بربری ہوں، افغانی ہوں، ایرانی ہوں'' جب کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کی یہ امتیازی خصوصیت بتائی ہے کہ ﴿ومن أحسن قولاً ممن دعا الى الله وعمل صالحاً، وقال انني من المسلمين﴾ اس کی وجہ سے بعض مغربی مفکرین اب یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ امت اسلامیہ کا وجود ختم ہوچکا ہے، قرآن کریم نے امت اسلامیہ کو ایک امت قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے ﴿ان هذه أمتكم أمة واحدة، وأنا ربكم فاعبدون﴾ ایک دوسری آیت میں اس وحدت کا تذکرہ اس طرح آیا ہے ﴿وان يريدوا ان يخدعوك، فان حسبك الله، هوالذى أيدك بنصره وبالمؤمنين، وألف بين قلوبهم، لوأنفقت مافى الأرض جمعياً ماألفت بين قلوبهم، ولكن الله ألف بينهم، انه عزيز حكيم﴾

باہمی اخوت ومودت، الفت ومحبت، بھائی چارگی، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے ساتھ اظہار یکجہتی وہمدردی امت اسلامیہ کی خصوصیات ہیں، اور امت اسلامیہ کو ان خصوصیات پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ہدایت اور تاکید کی گئی ہے، دوسری طرف بغض وعناد، حسد وکینہ، باہمی اختلاف وانتشار، تفرقہ بازی گروہ بندی، نسلی اور قومی عصبیت سے سختی سے منع کیا گیا ہے، جس سے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہونے کا خدشہ ہو، اور غلط شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہوں۔

یہی وہ بہترین ہدایات اور مثالی تعلیمات ہیں جس کے نتیجہ میں صدیوں سے باہم دست وگریبان اور برسر پیکار چلی آرہی قومیں اور قبائل ایک امت بن گئے، اور جب تک مسلمان قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اوران کا شیرازہ متحد رہا، جب انہوں نے کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقہ سے انحراف کیا وہ اختلاف وافتراق کا شکار ہوگئے۔

تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسی شخصیات وجود میں آتی رہی ہیں جنہوں نے امت اسلامیہ کے بقاء اوراس کے امتیازی وصف ''وحدت'' کے تحفظ کی کوششیں کیں، اور اسلامی معاشرہ کے کلیدی عناصر کو تخریبی ومنفی نظریات وافکار سے بچائے رکھا، امت اسلامیہ کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے مابین اتحاد واتفاق پیدا کرنے پر زور دیا، اور نسلی، قومی، لسانی اور علاقائی رجحانات ونظریات کا مقابلہ کیا، تخریب کاروں اور دشمنوں کے منصوبوں کو ناکام بنایا، اور امت اسلامیہ کے شیرازہ کو اختلاف وانتشار سے محفوظ رکھا۔

ہندوستان جو مختلف ثقافتوں، زبانوں اور مذاہب کے ماننے والوں کا وسیع وعریض ملک ہے ایسے حالات سے متعدد بار دوچار ہوا ہے، جب اس پر تہذیبی، لسانی، قومی اور نسلی عصبیت کا حملہ ہوا، خاص طور پر سامراج کے عہد میں جب اس پر مغربی تہذیب کی یلغار ہوئی، ایسی تحریکیں، تنظیمیں، مکاتب فکر، اور فرقے وجود میں آئے جو شریعت اسلامی کی بقاء یا اس کی صحیح ترجمانی کے خلاف تھے، الحاد ولادینیت اور اخلاقی آزادی کی تحریکیں اٹھیں، لیکن محض علماء دین کی کوششوں کے سبب تمام تر سازشوں، ریشہ دوانیوں، آزمائشوں، رکاوٹوں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کے باوجود اسلام اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ باقی رہا اوراس نے قومی ونسلی یا ثقافتی کسی بھی عصبیت کا اثر قبول نہیں کیا۔

اہل فکر علماء اور اللہ کے نیک بندوں نے تخریبی تحریک اور دین کی تشریح وترجمانی میں انحراف کا مقابلہ کیا اور صحیح فکر کو پیش کر کے انہوں نے اپنا تعلیمی وتربیتی اور دعوتی نظام قائم کیا، اور تہذیب وثقافت کی حفاظت کی کوشش کی، اس راہ میں ان کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا، آزادی کے بعد ہندوستان میں جو مختلف قومیتوں، زبانوں اور تہذیبوں کا ملک ہے، مسلمانوں نے اپنے تشخص کو باقی رکھا، اور اس کو باقی رکھنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے، جس طرح انہوں نے مغربی کی لادینی اور خالص مادی تہذیب وفکر سے سامراج کے عہد میں اپنے کو محفوظ رکھا، انہوں نے اشتراکیت کے لادینی والحادی نظریات وفلسفۂ حیات سے بھی نئی نسل کو بچانے کا اہتمام کیا اس کے لئے لٹریچر بھی تیار کیا، تحریکیں بھی چلائیں، جلسے اور اجتماعات اور شخصی ملاقاتوں سے بھی کام لیا، ان مخلص اور دردمندانہ اقدامات کی وجہ سے ان علماء پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے، تشدد، تعصب، انتہا پسندی، علیحدگی پسندی، قدامت پرستی، اور رجعت پسندی کی تہمتیں لگائی گئیں، اور مختلف محاذوں سے، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ، تعلیم کے ذریعہ، سرکاری مشنری اور سیاسی تحریکوں کے ذریعہ ان کے خلاف نفرت وعداوت کی مہم چلائی گئی، لیکن یہ قائدین اپنی فکر اور طریقۂ کار پر ثابت قدم رہے، اور اسلامی ودینی تشخص وشعائر کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانی پیش کی، خصوصاً برطانوی سامراج کے عہد میں جب کہ اسلام اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا، تعلیم وتربیت کے دروازے ان کے لیے بند کر دیئے گئے تھے، تعلیم وقضا کا نظام بدل دیا گیا تھا، اس نازک ترین حالت میں جب کہ مسلمان زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ دل تھے، مسلم علماء دین نے اسلامی تشخص کے تحفظ وبقاء کے لئے مدارس اور دینی اداروں کا جال پھیلا دیا، اور اقتدار وصاحبان اقتدار سے مستغنی ہو کر اپنے نظام کو سخت ودشوار حالات میں چلاتے رہے، ماحول اور حالات کے تقاضوں کو

ملحوظ رکھتے ہوئے مؤثر وکارگر مختلف وسائل وذرائع اختیار کئے، نشر واشاعت سے بھی کام لیا، مجلّات ورسائل، وعظ وتذکیر اور علمی تحقیق کا نظام قائم کیا، دارالمطالعے، کتب خانے، نشر واشاعت کے ادارے قائم کئے، اور ایسے افراد تیار کئے جو قناعت پسندی سے کام لے سکیں، مسلمانوں کی دینی بیداری کے لئے عوامی تحریکیں شروع کیں، اور نظام حکومت اور سیاسی پارٹیوں سے ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر تعمیری اور اصلاحی طریقہ اختیار کیا، ان مخلص اور بے لوث علماء دین نے حالات کی ناسازگاری کے باوجود حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔

عالم اسلام کو اس وقت جو صورت حال درپیش ہے وہ اسی عزم وارادہ، غیرت وحمیت اور قربانی نیز منصوبہ بندی کی متقاضی ہے، اور یہی وہ آزمودہ نسخہ ہے جو عالم اسلام کو درپیش موجودہ خطرات سے ایک بار پھر نجات دلاسکتا ہے، اس وقت الیکشنی سیاست، سیاسی تحریکوں سے وابستگی نیز حکومت میں شامل ہونے کے بجائے عوام وخواص کی تعلیم وتربیت، اصلاح معاشرہ، اصلاح عقائد، سماجی مسائل کے حل کے لئے تنظیموں اور اداروں کے قیام کی ضرورت ہے، جو عوام کی مدد سے قائم ہوں، نہ کہ حکومت یا حکومت کی ایجنسیوں کی مدد سے، یہ ایثار وقربانی اور صبر وعزیمت کا راستہ ہے، اور یہی وہ راہ ہے جو اس امت کو درپیش نئے خطرہ وچیلنج سے بچا سکتا ہے، گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

نیا عالمی خطرہ (☆)

اگست کے مہینہ میں فرانس میں ایک یہودی سنٹر میں آگ لگنے کا واقعہ اور پھر اس واقعہ میں خود اسرائیلی پالیسی کے دو عنصر سامنے آتے ہیں:

(۱) ان یورپی ممالک میں دہشت گردانہ کاروائیاں اور دھماکے کرانا جن کے عالم اسلام کے ساتھ تعلقات و روابط قائم ہیں، یا جو مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ رکھتے ہیں، پھر مسلمانوں کو ان دھماکوں اور کاروائیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا تاکہ ان ملکوں کے عالم اسلام کے ساتھ قائم تعلقات خراب ہو جائیں۔

(۲) سامی دشمنی "Anti Semitism" اصطلاح کے ذریعہ یورپی ملکوں کی ہمدردی حاصل کر کے یہودیوں پر ہونے والی تنقید و مذمت کا سدباب کرنے کی کوشش کرنا۔

''سامی دشمنی'' کے نام پر اسرائیل اسلامی ملکوں میں ایسی تنظیموں، تحریکوں، شخصیات اور عبارتوں پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کرتا رہتا ہے جن سے یہودیوں پر تنقید و مذمت ہوتی ہو، حتی کہ قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اسلامی تاریخ کے نصاب تعلیم سے ان حصوں کو نکالنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جن میں یہودیوں کے خلاف مواد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو اسرائیل دنیا سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ اس کا احترام ملحوظ رکھا جائے، اس کے مفادات کو تحفظ فراہم کیا جائے اور اپنی مظلومیت کا رونا روتا ہے۔ دوسری طرف عربوں، مسلمانوں اور اسلام کو بدنام کرنے کی مہم روز بروز تیز ہوتی جا

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ر نومبر ۲۰۰۴ء۔

رہی ہے۔ صہیونی قلم کاروں، مورخوں، ادیبوں اور مصنفین نے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے اور مذمت میں ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، عالمی میڈیا جس پر صہیونیت کا مکمل کنٹرول اور قبضہ ہے، پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی خراب شبیہ پیش کر رہا ہے، اور مسلمانوں کے خلاف بغض، عداوت اور نفرت و کراہت کی مہم چلا رہا ہے، صاف شفاف اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کر رہا ہے، اسرائیل کی یہ اسلام دشمن مہم کسی سے مخفی نہیں ہے، اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو میڈیا اور ادب ولٹریچر پر نظر رکھتا ہے۔ دشمنوں نے ادب ولٹریچر اور میڈیا کے فن کی راہ سے جو حملے کیے ہیں، جو فکری وثقافتی یلغار کی ہے اس کے اثرات ونتائج جنگوں سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صہیونیوں کی جارحانہ تنقیدی مہم بڑے زور وشور سے جاری ہے اور ۱۱ر ستمبر کے حادثہ کے بعد اسلام مخالف مہم اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں اور زیادہ شدت آئی ہے، حالانکہ یہ مہم تمام عالمی معاہدوں، اخلاقی قدروں اور علمی اصولوں کے خلاف ہے۔

اسرائیل سامی دشمنی "Anti Semitism" اصطلاح کو مخصوص اغراض و مفادات کی حفاظت کے لیے استعمال کر رہا ہے، سامی دشمنی اصطلاح جرمنی میں یہودیوں کے خلاف نازیوں کے اقدامات کے بعد وضع کی گئی تھی، جن میں یہودیوں پر مظالم کیے گئے تھے، یہود ان مظالم کو ''ہولوکوسٹ'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اسرائیل نے ہولوکوسٹ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا، میڈیا اور ذرائع نشر وشاعت کے ذریعہ نازیوں کی وحشیانہ کاروائی کا پروپیگنڈہ کر کے دنیا کی ہمدردی وحمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، اس کے برخلاف فلسطینیوں کو اسرائیل کے ہاتھوں ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے، متعدد بار ہزاروں فلسطینی شہید کیے گئے، ''صبرا'' ''شتیلا'' کے خونی واقعات جس میں فلسطینیوں کا قتل عام ہوا، کسی سے پوشیدہ نہیں، فلسطین میں جاری

جنگی کارروائیاں اسرائیلیوں کی وحشت و بربریت اور ظلم وسفا کی کی واضح دلیل ہیں، یہ کارروائیاں حقیقت میں انسانیت دشمنی اور بربریت و درندگی کی بدترین مثالیں ہیں، ان کارروائیوں سے نہ معصوم بچے محفوظ ہیں، نہ عورتیں، اسی کے ساتھ ساتھ جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، وہ میڈیا پر یہودی کنٹرول کے باوجود ساری دنیا کے علم میں آتا رہتا ہے۔ اس طرح اسرائیل نے سارے حقوق اور اختیارات اور ضمانتیں اپنے لیے مخصوص کر لی ہیں اور دوسری قوموں کو ان سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

تاریخ کے جائزہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں اور عربوں نے یہودیوں کے خلاف دشمنی اور بغض وعداوت کی کوئی تحریک نہیں چلائی، اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی جنگی مہم چھیڑی، بلکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ خود یہودیوں ہی نے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف دشمنی وعداوت کا محاذ کھولا، قرن اول سے یہودی اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے، متعدد اسلام دشمن تحریکوں کے قائد صہیونی رہے ہیں، اور موجودہ دور میں متعدد اسلام دشمن مستشرق صہیونی ہیں۔ اس سے بڑی بے انصافی کیا ہوسکتی ہے کہ عرب علاقہ کو عبرانی علاقہ بنا کر، عربوں کو ان کے وطن سے نکال کر مغربی ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کو دیا جائے، اصل باشندوں کے گھروں کو منہدم کر دیا جائے، کھیتیاں برباد کر ڈالی جائیں، مسلم رہنماؤں اور لیڈروں کو جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں، قتل کیا جائے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے، آج بھی ہزاروں مسلم بچے، بوڑھے جوان اور عورتیں جیلوں میں بند ہیں اور سخت اذیتوں اور سزاؤں سے گزر رہے ہیں، اور وحشیانہ وگھناؤنے طریقہ پر ان کو ٹارچر کیا جارہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ بیت المقدس کو ڈھانے اور مسجد اقصیٰ خاکستر کر دینے کی ناپاک سازشیں اور مجرمانہ کوششیں کی جائیں، اور اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا ارادہ

ظاہر کیا جائے، بلکہ اس کے لیے اقدامات کیے جائیں، حاخامات عربوں کو قتل کرنے اور ان کو ملک بدر کر دینے کی دھمکیاں دیں، اور ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے، اس میں پوری انسانیت کے ضمیر کا امتحان ہے۔

صہیونی ''سامی دشمنی'' کی اصطلاح کی آڑ میں مسلم رہنماؤں کو کسی بھی یورپی ملک جانے سے رکواتے ہیں، اور یورپی ملکوں پر دباؤ ڈال کر اسلامی ذہن رکھنے والوں رہنماؤں اور لیڈروں پر پابندی لگواتے ہیں، اس کی تازہ مثال حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے پروفیسر طارق رمضان اور یوسف اسلام کو یورپی ملکوں کے سفر سے روکا جانا ہے، صہیونیوں کے دباؤ میں آکر وہاں کے سرکاری اداروں نے انہیں ویزا دینے سے انکار کر دیا، ان کے علاوہ متعدد اسلامی شخصیتوں کو سامی دشمنی کے الزام پر یورپ کے متعدد ملکوں میں داخل ہونے سے روکا گیا، بعض کتابوں پر پابندی کا مطالبہ اسی بنیاد پر کیا گیا کہ ان میں سامی دشمنی کا مواد پایا جاتا ہے۔

اسی طرح صہیونی میڈیا نے اسلامی خطرہ کا پروپیگنڈہ کیا ہے اور پوری مغربی ممالک میں مسلمانوں کی موجودگی کو ایک بڑے خطرہ کی شکل میں پیش کیا ہے، اسرائیلیوں کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی تعداد پوری دنیا کے لیے خصوصاً مغربی دنیا کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون نے اپنے حالیہ بیان میں جس میں فرانس پر سخت تنقید کی ہے، کہا ہے ''فرانس میں مسلمانوں کی بڑھتی تعداد جو کہ چھ ملین کے قریب ہے ملک کے لیے خطرہ ہے'' اس طرح اسرائیل پوری مغربی دنیا میں مسلمانوں کی موجودگی کو عالمی امن وامان کے لیے خطرہ بنا کر پیش کر رہے ہیں، چونکہ صہیونیوں کا اکثر مغربی ملکوں پر پورا کنٹرول ہے، اس لیے صہیونی اسلام مخالف پروپیگنڈہ میں ایک حد تک کامیاب ہیں، یہود اپنی نسل کے علاوہ دوسری نسل سے تعلق رکھنے والوں سے عداوت رکھتے ہیں اور ہر ممکن طریقہ

سے ان کو پریشان و ہراساں کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، صہیونیوں نے اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر پوری دنیا پر قبضہ کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کو بروئے کار لانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اپنائے جارہے ہیں۔

درحقیقت اسرائیل دنیا میں دہشت گردانہ کاروائیاں کرتا رہتا ہے اور پھر ان کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دیتا ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف عالمی رائے عامہ تیار کرنا ہے۔ اگست کے مہینہ میں فرانس میں ایک یہودی سنٹر میں آگ لگنے کا واقعہ کوئی نیا حادثہ نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے دنیا کے مختلف ملکوں میں رونما ہونے والے انتہا پسندانہ و دہشت گردانہ واقعات میں اسرائیلی ایجنسیوں پر شبہ کیا گیا ہے۔ استنبول، قاہرہ اور ریاض میں ہونے والے دھماکوں میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا ملوث ہونا ثابت ہو چکا ہے، خود ان ملکوں کی حکومتوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ دہشت گردانہ دھماکے اسرائیل کی سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوتے ہیں حتی کہ ترکی جو اسرائیل کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے، نے استنبول کے حالیہ دھماکوں کے بعد اسرائیلی ایئر لائنس کمپنی ''عال'' کو بند کر دیا تھا اور یہ الزام لگایا تھا کہ اس کمپنی میں اسرائیلی انٹلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ایجنٹ کام کرتے ہیں، چنانچہ ترکی حکومت کے اس اقدام کے بعد اسرائیل اور ترکی کے مابین فضائی رابطہ عرصہ تک منقطع رہا، مصر اور سعودی عرب کی حکومتوں نے بھی قاہرہ اور ریاض میں ہونے والے بم بلاسٹ اور حملوں کا ذمہ دار اسرائیل کو ٹھہرایا ہے۔ عالمی تحقیقی رپورٹوں اور دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو دھماکے اور دہشت گردانہ واقعات رونما ہوئے ہیں، ان میں اسرائیلی ایجنسیوں پر شبہ کیا گیا ہے، اور ان کا مقصد مسلمانوں کو بدنام کرنا ہوتا ہے، فرانس میں ہونے والے دھماکے سے ان لوگوں کے موقف کو اور تقویت ملتی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ گیارہ ستمبر کا واقعہ بھی صہیونیوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ اس کی تائید

میں متعدد رپورٹیں اخباروں، رسالوں اور انٹرنیٹ پر شائع ہوئی ہیں، گیارہ ستمبر کا واقعہ اسی نہج اور طریقہ پر رونما ہوا تھا، جس نہج اور طریقہ پر فرانس کے یہودی سنٹر میں آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا ہے، فرانس کے اس واقعہ کے بعد صہیونی میڈیا کے ذریعہ قیامت برپا کر دی گئی، فرانسیسی حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ سامی دشمنی کے خلاف سخت کاروائیاں کی جائیں، اس پروپیگنڈہ کے دوران فرانس کی اسلامی تنظیموں نے ان خدشات کا اظہار کیا تھا کہ یہ واقعہ اسرائیلیوں کی سازش ہوسکتا ہے، اور اس کا مسلمانوں کے خلاف فرنسیسی رائے عامہ کو اکسانا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ایک یہودی کی گرفتاری کے بعد یہ خدشات حقیقت میں بدل گئے اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ کارروائی اسرائیلیوں ہی نے کی ہے۔ کیوں کہ جو شخص گرفتار کیا گیا ہے وہ پچاس سالہ یہودی ہے، اور وہ سنٹر میں جہاں پر دھماکہ ہوا، گارڈ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

اس طرح کے دہشت گردانہ دھماکے اور مجرمانہ واقعات مغربی ملکوں میں واقع ہوتے ہیں اور ان میں اسرائیلیوں کا ملوث ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے، لیکن ان ملکوں کی حکومتوں نے صہیونیوں کے خوف وڈر سے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ ان واقعات پر پردہ ڈال دیا، اس لیے کہ ذرائع نشر واشاعت پر صہیونیوں کا کنٹرول ہے۔ سیاسی واقتصادی دباؤ ڈالنے کے تمام ذرائع ان کے قبضہ میں ہیں اور اس سے بڑھ کر امریکہ کی ان کو مکمل حمایت وتائید حاصل ہے۔ لیکن اب متعدد، واقعات میں صہیونیوں کے ملوث ہونے کے ثبوت ملنے پر مغربی ملکوں میں رائے عامہ بیدار ہونے لگی ہے اور یہودیوں سے نفرت وکراہیت بڑھتی جارہی ہے اور اسرائیل کے کالے کرتوتوں سے پردہ اٹھتا جارہا ہے، رائے عامہ یہ سمجھنے لگی ہے کہ اسرائیل سامی دشمنی کے نام پر مل رہی حمایت کا کس طرح استحصال کررہا ہے، یورپی ملکوں کے خواص وعوام میں یہ احساس بڑھ رہا ہے۔ اگر عوام میں یہ احساس وشعور بڑھتا رہا تو عجب نہیں کہ یہ

احساس اور شعور ایک تحریک کی شکل اختیار کرلے اور اس اجنبی عنصر کے تسلط و قبضہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی عالمی سطح پر تحریک شروع ہو جائے، حالانکہ یہ دونوں ملک اسرائیلی شکنجہ میں ہیں، ابھی حال ہی میں امریکی وہائٹ ہاؤس میں اسرائیلی جاسوسی نیٹ ورک کا انکشاف ہوا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مکر وفریب، دجل ومکاری دیرپا نہیں ہوتی، بلکہ حقیقت ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ اور حق ثابت ہو ہی جاتا ہے۔ "جاء الحق و زهق الباطل إن الباطل كان زهوقا" چنانچہ ایک یورپی مفکر لورانس براؤن نے کہا ہے کہ ہم کو پہلے یہودی خطرہ، نازی خطرہ، جاپانی اور چینی خطرہ سے ڈرایا جاتا تھا، لیکن یہ خطرات گمان کے مطابق ظاہر نہیں ہوئے، کیوں کہ ہم نے دیکھا کہ یہود ہمارے دوست ہیں، چنانچہ اس بنا پر ان پر ظلم کرنے والا ہمارا دشمن ہے، پھر ہم نے اشتراکیوں کو دوسری عالمی جنگ کے دوران اپنا حلیف اور موافق پایا، جہاں تک جاپان اور چین کا تعلق ہے تو یہاں بہت سے جمہوری ممالک ہیں جو ان دونوں کے مقابلہ کے لیے کافی ہیں، لیکن حقیقی خطرہ مسلمانوں سے ہے، مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کو زیر کرنے کی صلاحیت وقوت ہے، اور اس حیرت انگیز قوت حیات سے جس کے مسلمان مالک ہیں، ۱۹۵۳ء میں لورانس براؤن نے ایک فرانسیسی رہنما سے کہا تھا کہ یورپ کو کمیونزم سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ حقیقی خطرہ اسلام سے ہے، مسلمان ہماری مغربی دنیا سے ایک الگ دنیا رکھتے ہیں، یہ ایک خاص روحانی سرمایہ کے مالک ہیں، ان کے پاس ایک عظیم الشان سچی تہذیب وتمدن ہے، اس کے ذریعہ سے مسلمان ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، ان کو صرف وہ ترقی حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو مغرب نے حاصل کرلی ہے۔

لیکن موجودہ حالات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ دنیا کو خطرہ اسلام سے نہیں، بلکہ

آنے والے دنوں میں مغرب یہ جان لے گا کہ اسلام سراپا رحمت ہے، حقیقی خطرہ تو وہ دشمن ہے جس کو مغرب اپنا دوست سمجھتا ہے، جو لوگ حکماء صہیون کے پروٹوکول اور تلمود سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصل خطرہ صہیونیت اور صلبیت ہے، صہیونیوں نے دنیا کے امن وسکون کو غارت کرنے اور فساد مچانے کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنائے ہیں اور وہ پوری دنیا پر اپنا قبضہ جمانے اور غیر یہودیوں کے خاتمہ کے لیے کیسے کیسے ناپاک عزائم رکھتے ہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے گھناؤنے ہتھکنڈے اپنا رہے ہیں۔

کیا مہذب دنیا
تاریک دور کی طرف واپس جارہی ہے؟ (☆)

دنیا کی تاریخ میں قرون وسطی (Midle Ages) کو انحطاط وزوال، وحشت و بربریت، مذہبی ونسلی تعصب، جہالت وگمراہی، فقر ومحتاجی اور محرومی و درماندگی کی علامت اور عنوان سمجھا جاتا ہے، یہ وہ دور تھا جب فرمانروائے وقت مطلق العنان اور سفید وسیاہ کے مالک ہوا کرتے تھے، ہر طاقتور اور زور دست کمزور وزیردست کا استحصال اور اس پر اپنی حکومت وسیادت کو مسلط کرنا اپنا حق سمجھتا، اپنی طاقت اور اقتدار کے آگے اس کی سجدہ ریزی کو ازلی حق سمجھتا تھا، اس ذہنیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان صدیوں میں خوں ریز جنگ وجدل کے بڑے خوفناک مہیب وبے رحم شعلوں نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، کتنے بے گناہ اور معصوم افراد کے خلاف الزام تراشی کی گئی اور ان کو دفاع کا ادنیٰ حق دیئے بغیر بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا، تاریخ کا یہی وہ طویل اور تاریک ترین دور ہے جب یورپ ان حکمرانوں کے ظلم وجبر، انتہا پسندی اور دینی رہنماؤں کی وحشت وبربریت کا شکار ہوا اور اس پر جنگوں کا قہر ٹوٹا۔

یہ جنگیں دین ومذہب، قومی رنگ ونسل اور سیادت وقیادت کے جھنڈے تلے لڑی گئیں، پھر جب یورپ نے علمی ترقی وعروج کے دور میں قدم رکھا، اپنی اندرونی مشکلات کا حل تلاش کر کے ان پر قابو پالیا تو یورپ کا مزاج طالع آزما سامراج میں

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر فروری ۲۰۰۵ء۔

تبدیل ہوگیا، اس نے کمزور قوموں کو مختلف حربوں اور ہتھکنڈوں کا استعمال کر کے کبھی نگرانی وسرپرستی کے نام پر تو کبھی کسی ملک پر عارضی حکومت کا اختیار حاصل کر کے ان ملکوں اور قوموں کو زیر نگیں کرنا شروع کیا، جو قومیں مغربی سامراج کی سازشوں کا شکار ہوئیں، یورپ نے اس کا بری طرح استحصال کیا، ان قوموں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، عقائد ومقدسات کو مسخ کیا اور یورپ نواز مورخین نے ان قوموں کی ایسی نئی تاریخ پیش کی جس میں ان کے جذبات کی توہین وتحقیر کی گئی اور ان کے کارناموں پر خط مسخ پھیر دیا گیا۔

پھر تاریخ نے ایک کروٹ لی، کمزور وغلام قومیں طویل مزاحمت کے بعد آزاد ہوئیں، دوسری طرف دو عالمی جنگوں نے سامراجی ممالک کے کس بل ڈھیلے کر دیے، نو آزاد قوموں نے اپنی حکومتیں قائم کیں، اس کے بعد عہد و معاہدوں (Confederacy) کا دور شروع ہوا، تو ان آزاد ممالک نے اپنا سیاسی محاذ اور گروپ بنالیا، مقصد یہ تھا کہ سپر پاور طاقتوں اور حکومتوں کی طرف سے ہر قسم کے چیلنجوں اور خطرات کا متحد ہوکر مقابلہ کیا جائے، ان قوموں کی حکومتوں کے تحفظ کے لیے معاہدے کیے گئے، ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ جن نو آزاد ممالک نے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کر لی ہے، ان کی بقا وسلامتی کو یقینی بنایا جائے، کوئی ملک کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے، حقوق انسانی (Human Rights) کے دستاویز تیار کیے گئے جس میں دین ومذہب کی آزادی، اقتدار وملکیت (Possession) کی آزادی کی ضمانت دی گئی اور رنگ و نسل، دین ومذہب کی بنیاد پر تفریق کو مذموم قرار دیا گیا، اس طرح جن ممالک نے اس معاہدہ پر دستخط کیے تھے، گویا انہوں نے ایک پر امن بقائے باہم اور مشکلات کو اسلحہ اور قوت کے استعمال کے بغیر حل کرنے پر مفاہمت کر لی، ان معاہدوں میں اس کی

بھی صراحت تھی کہ ملزم کو اپنے دفاع کا پورا حق دیا جائے گا اور کسی بھی انسان کو عدالت اور قانونی چارہ جوئی کے بغیر طویل عرصہ کے لیے محبوس نہیں کیا جائے گا۔

ان حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف ایجنسیاں، تنظیمیں اور تحریکیں جیسے حقوق انسانی ایسوسی ایشن (Human Rights Association) ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) سرگرم عمل ہوگئیں، تہذیبی و ثقافتی سرمایہ کی حفاظت کے لیے یونیسکو تنظیم (Unesco) وجود میں آئی، بچوں کے حقوق اور حقوق نسواں سے لے کر حقوق حیوان تک کے نعرے لگائے گئے، صرف چرند و پرند ہی نہیں، پھاڑ کھانے والے درندوں تک کی حفاظت کا بیڑہ اُٹھایا گیا، کُتّے اور بلیوں کے ساتھ ناروا سلوک پر سزائیں مقرر کی گئیں، بعض ممالک میں جانوروں پر طبی تجربات پر پابندی لگائی گئی، یہ تھے یورپی تہذیب و تمدن کی فتوحات جن پر تہذیب کے کے معماروں کو ناز تھا، جدید تہذیب کے ان الطاف و عنایات سے نہ صرف خشکی پر بسنے والے انسان فیض یاب ہوئے؛ بلکہ جنگل، صحراء اور دریا بھی ان کے شرمندۂ احسان ہوئے۔

یورپی تہذیب کی اصلاحات تین ستونوں پر قائم تھی، آزادی، نرمی اور خوشحالی، جہاں تک آزادی کا تعلق تھا تو اس تہذیب کی آزادی کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ وہ زندگی کے تمام تر شعبوں پر حاوی تھا، اس تہذیب نے ہر اس اقدام کو سراہا اور ستائش کی نظر سے دیکھا جو آزادی کی اس منزل تک راہ ہموار کردے جہاں پہنچ کر مسلمات، محکم نظریات و افکار حتی کہ عقائد بھی بے دست و پا ہو جائیں۔

اس بے لگام آزادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تہذیب کے بنائے ہوئے اصول و قوانین میں تضاد اور ٹکراؤ نظر آنے لگا، چنانچہ اگر کسی شخصیت، یا کسی عقیدہ یا کسی فکر پر حملہ کیا جاتا اور اس فکر کا نمائندہ، یا اس عقیدہ کا حامل یا اس شخصیت کا پیرو اس پر احتجاج کرتا اور دفاع کے لیے کھڑا ہوتا تو اس کا یہ احتجاج اور حق دفاع کا استعمال

آزادیٔ رائے کے خلاف سمجھا جاتا، اس لیے کہ آزادی رائے تو انسان کا موروثی حق ہے، اس کی زبان جو چاہے اگلے، اس کا قلم جو چاہئے لکھے، لیکن دوسری طرف یورپ یہ راگ الاپنے سے بھی نہیں تھکتا کہ کسی شخص کو دفاع کے حق سے محروم کرنا یا قانونی چارہ جوئی کے بغیر کسی کو قید و بند کی سزا دینا، انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

بہرحال دنیا نے کسی طرح قرون وسطیٰ کو خیر باد کہ کر اس دور کا استقبال کیا جس میں آزادی ہی آزادی تھی، انسان وانسانیت کا احترام تھا، تہذیبی شناخت واقدار کے بقا کی ضمانت تھی، بین الملکی حکومتوں کو تحفظ حاصل تھا، اندرونی معاملات میں کسی کو کسی طرح کی دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی، ان آزادیوں اور قوموں کی حفاظت ونگرانی کے لیے تنظیمیں قائم کی گئیں، چنانچہ چھوٹے چھوٹے ممالک نے اپنی حکومتوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے بڑے ممالک کی پناہ حاصل کی۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ کے ان رکن ممالک کی تعداد جن کی اپنی فوج تھی، اپنی سرحدیں تھیں، تہذیب اور خاص معاشرتی فلسفہ تھا، ان کی تعداد ۱۹۴ تک پہنچ گئی۔

بلاشبہ اقوام متحدہ نے ماضی میں ان حکومتوں کی سلامتی و بقا میں اہم کردار ادا کیا، جب بھی کسی کے طالع آزمائی کی کوشش کی یا ہوس ملک گیری کی وجہ سے کشمکش کی صورت پیدا ہوئی، یا کسی ملک کی سلامتی اور اس کی تہذیب وثقافت کو کوئی خطرہ درپیش ہوا، تو اقوام متحدہ نے اس کے تدارک کی فوری تدبیر کی اور شرپسندوں کی شرپسندی سے ملک کو جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی کی، کتنی حکومتیں ایسی ہیں جو اقوام متحدہ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کوئی حکومت کسی ملک یا شہر کے نقشہ کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی، یا اس کی قومی شناخت اور تہذیبی سرمایہ کو مٹا نہ سکی، بہت سے آثار قدیمہ محض اقوام متحدہ کی کوششوں سے قصۂ پارینہ بننے سے محفوظ رہ گئے، اسی پس منظر میں ہنگامی

سلامتی کونسل قائم کی گئی اور طاقتور ممالک کو من مانی سے روکنے کے لیے اقوام متحدہ نے بڑے رکن ممالک کو ویٹو کا حق (Right of Vito) تفویض کیا۔

ان تمام سرگرمیوں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ دنیا تمام ممالک کے تعاون سے باہمی ضمانت، یکجہتی و ہم آہنگی کے جذبہ کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گی اور جدید تہذیب کے معماروں کا ایسی دنیا کی تخلیق کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا جہاں لوگ چین وسکون کی زندگی گزار سکیں، عزت وشرافت کی حکومت ہو، ہر انسان آزادی و خوشحالی محسوس کرے، لیکن کیا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوسکا؟

اچانک جدید عالمی نظام یا گلوبلائزیشن (Globalization) کا انقلاب آیا جس کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ سسکتی بلکتی دنیا کو قرار اور راحت وسکون فراہم کیا جائے، ترقی پذیر ممالک کی کوششوں اور تعاون سے کمزوریوں کا حل اور امراض کا علاج تلاش کیا جائے، لیکن ہوا اس کے برعکس، اس کوشش میں ایسے حادثات پیش آئے جس نے دنیا کو خوش بختی سے بدبختی، راحت وخوشحالی اور استقرار سے محرومی کے ڈگر پر ڈال دیا، ان واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ اس نظام کا مقصد آزادی دینا نہیں؛ بلکہ ختم کرنا ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آزاد ممالک کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا جائے جیسا کہ امریکی صدر کے حالیہ بیان سے یہ خطرہ سامنے آگیا ہے اس میں کہا گیا ''امریکہ کی آزادیاں اور امریکہ کی جمہوریت نہیں رہ سکتیں جب تک کہ دوسری اقوام میں بھی یہی اقدار سربلند نہ ہوجائیں۔''

جس وقت اس دنیا پر ایک ملک یا دو ملک، طاقتور وسائل و ذرائع کے ممالک چند حلیف ممالک کی قیادت تھوپ دی گئی، اسی وقت سے اس نے سامراجی دور کی طرف واپسی کا سفر شروع کردیا، پھر دنیا سامراجی دور سے اور پیچھے قرون وسطیٰ میں اس وقت پہنچ گئی جب اس کو رنگ ونسل، قومی اور مذہبی تعصب کی بھٹی میں جھونک دیا گیا،

معصوم اور بے گناہوں کے خون بہائے گئے، معمولی معمولی باتوں پر جنگیں ہونے لگیں، قوموں کی مذہبی آزادی، اقتدار اعلیٰ، قومی شناخت اور تہذیب کی آزادی، حصول علم اور تلاش رزق کی آزادی سلب کی جانے لگی، دنیا پر ظالمانہ و جابرانہ قوانین نافذ کیے گئے، سزا و جزا اور وحشت و بربریت کے ایسے طریقے اپنائے گئے جن پر انسانیت شرمسار ہو جائے، محلوں کے محلے، شہر کے شہر نذر آتش کر دئے گئے، کارخانے وانسانی آبادیاں مسمار کر دی گئیں، ظلم و بربریت کے اس خونی ڈرامہ میں نہ بچوں کے اسکول محفوظ رہے، نہ شفا خانے، خلاصہ یہ ہے کہ پوری دنیا پر ایک نیا عقیدہ ایک نئی تہذیب کو بزور طاقت مسلط کیا جا رہا ہے، اور اپنے مخالف کو تہ تیغ کیا جا رہا ہے۔

آج اقوام متحدہ اپنا گزشتہ وقار اور قوت و تاثیر کھو چکا ہے، آج اس کرۂ ارض پر کوئی ایک بھی ایسی طاقت موجود نہیں ہے جو ظالم کو ظلم سے باز رکھے اور مظلوم کی داد رسی کرے، کیا یہ صورتحال قرون وسطیٰ سے زیادہ خطرناک نہیں؟ قرون وسطیٰ میں تو کئی ایسی حکومتیں تھیں جن میں کسی سے ٹکرانے کا دم خم تھا، ان سلطنتوں میں بہت سے ایسے افراد موجود تھے جو زندہ اور بیدار ضمیر رکھتے تھے۔

ایک انگریزی رسالہ میں کسی لکھنے والے نے خوب لکھا ہے کہ آج دنیا میں اگرچہ ۱۹۴ ممالک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک تو بس ایک ہے باقی تمام ممالک صوبوں یا شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ The Times of India کے ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:۔

> ''فرانس کو چھوڑ کر پوری دنیا میں صرف ایک ہی ملک حکومت کر رہا ہے اور وہ ہے امریکہ، مسئلہ آج صرف اسلامی دہشت گردی کا نہیں ہے؛ بلکہ مسئلہ آج پوری انسانیت کی لاچاری و بے بسی کا ہے، اگر حالات کے رُخ کو نہ بدلا گیا تو اس کا خدشہ ہے کہ یہ دنیا دوبارہ سامراجی نظام کے گرفت میں آجائے۔''

برطانیہ سے شائع ہونے والا روزنامہ (Guardian) کی درج ذیل تحریر سے اس فکر کی تائید ہوتی ہے، روزنامہ تحریر کرتا ہے:۔

''عراق کی جنگ میں مکروفریب اور وحشت و بربریت کے جو نادر نمونے سامنے آئے ہیں، وہ برطانوی شہنشاہیت کی ماضی قریب کی تاریخ کی عکاس ہیں، فلوجہ میں امریکی حملہ کے تعاون کے لیے دوبارہ برطانوی فوج کو بھیجا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا سامراجی عہد کی طرف واپسی کا سفر کر رہی ہے، جب غاصبانہ قبضہ کے خلاف عوامی انقلاب کو طاقت وقوت کے بل پر خاتمہ کیا جاتا تھا۔''

خبروں کے مطابق عراق پر جو آخری حملہ کیا گیا ہے اس میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد مارے گئے ہیں، اس کے علاوہ افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، اسی کے ساتھ دوسرے ممالک کو نئی نئی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، آزاد ممالک کی آزادی سلب کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں، ان ممالک اور وہاں کے عوام کے مزاج کے برعکس سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی نظام نافذ کیا جا رہا ہے، یہ تمام کارروائیاں قرون وسطیٰ کی مطلق العنانی کو یاد دلانے کے لیے کافی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنوبی کیلیفورنیا کے ''امیریل'' یونیورسٹی کے ایک امریکی پروفیسر کا ایک بیان شائع ہوا ہے، اس بیان سے جہاں ایک طرف یورپ میں سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کے انداز ومزاج کا پتہ لگتا ہے، وہیں یہ بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بیان صلیبی جنگوں کے دوران صلیبی رہنماؤں کے بیان سے ملتا جلتا ہے، انہوں نے کہا کہ ''دہشت گردی اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے جب اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا جائے''۔

اخباری رپورٹ کے مطابق انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ کے خاتمہ کا واحد حل تمام مسلمانوں کا قتل ہے''۔

اس بیان کو پڑھیے اور اسرائیلی رہنماؤں کے ان بیانات کو پڑھیے جو انہوں نے اسلامی دہشت گردی کے خلاف جنگی کاروائیوں اور نسل کشی سے متعلق دیے ہیں، تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ یہ قرون وسطیٰ کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے بیانات سے زیادہ خطرناک ہیں، آج دنیا کے مختلف قید خانوں میں قیدیوں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا جارہا ہے، قرون وسطیٰ کی وحشت و بربریت بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔

یہ صورتحال اس بات کی طرف کھلا اشارہ کررہی ہے کہ یورپ آج امریکا کی قیادت میں قرون وسطیٰ کی طرف واپسی کا سفر طے کررہا ہے، مثل مشہور ہے ''جیسا بادشاہ ویسی ہی رعیت'' چنانچہ اس استحصالی سیاست اور منفی مذہبی تعصب کا اثر دنیا کے مختلف گوشوں میں پڑ رہا ہے، اس کی تازہ مثال تھائی لینڈ میں ۸۷ مسلمانوں کی دم گھٹنے سے ہونے والی موت ہے، یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب جنوبی تھائی لینڈ میں چھ مسلمانوں کی گرفتاری پر مسلمانوں نے احتجاج کیا، مظاہرین پر کمانڈو فوج کی فائرنگ سے چھ افراد موقع پر ہلاک ہوگئے جب کہ سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کرکے فوجی ٹرکوں میں بھیڑ بکری کی طرح ٹھونس دیا، چھ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد جب ان کو نکالا جانے لگا تو اس وقت تک ۸۷ افراد دم گھٹنے سے جاں بحق ہوچکے تھے۔

ایک اور مثال لے لیجئے، ترکی میں اگرچہ سیکولر اسلام دشمن نظام نافذ ہے، لیکن یورپی ممالک کی یورپی اتحاد میں اس کی رکنیت کو صرف اس لیے نامنظور کردیا کہ اس کا شمار اسلامی ممالک میں ہوتا ہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ سیکولرازم اور آج کی فکری آزادی کے سارے دعوے کھوکھلے، جھوٹے اور بوسیدہ ہیں؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ مذہبی تعصب و منافرت کا دور واپس آرہا ہے؟۔

بی۔جے۔پی۔کے موجودہ صدر اور سابق نائب وزیر اعظم و وزیر داخلہ لال کرشن

اڈوانی کا وہ بیان جو انہوں نے رانچی میں دیا تھا مذہبی منافرت کے دور کی واپسی کی کھلی دلیل ہے، انہوں نے کہا کہ ان کی پارٹی مذہبی پارٹی ہے، خدا نے اس کا انتخاب کیا ہے کہ ملک کو مشکلات سے نکال کر ترقی وعروج عطا کرے، کلیان سنگھ نے کہا کہ بابری مسجد کو کسی انسانی ہاتھ نے منہدم نہیں کیا، بلکہ اس کا انہدام فیصلۂ خداوندی ہے، روزنامہ (The Indian Express) نے ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ وہی فکر وتصورات ہیں جو افکار قرون وسطیٰ کے یورپ میں رائج تھے۔

افغانستان وعراق میں آج جس طرح مشنریاں پھیل رہی ہیں اور کام کر رہی ہیں، ٹینکوں اور توپوں پر صلیبی نشانات آویزاں کیے جا رہے ہیں اور جس طرح عیسائیت قبول کرنے پر لوگوں کو مجبور کیا جا رہا ہے، جس طرح اسلامی تشخصات ونشانات کو مٹایا جا رہا ہے اور اسلامی کاز کے لیے کسی بھی مالی امداد کے دروازہ کو جس طرح بند کیا جا رہا ہے، اس سے اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا قرون وسطیٰ کی طرف الٹا سفر کر رہی ہے۔

سامراج اور عیسائیت کی تبلیغ - نیا رجحان (☆)

عیسائی مبلغین اپنے مذہب کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ عیسائی محبت اور عفو و درگذر کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس کی تعلیمات کا لب لباب دوسروں کی راحت کے لیے خود تکلیف اٹھانا ہے، کفارہ کے تصور کی تشریح اسی سیاق میں کی جاتی ہے، اسی مقصد سے اسکولوں، اسپتالوں کا قیام، مریضوں کی تیمارداری اور خدمت خلق کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے تاکہ اس سے ان کے مذہبی شعار جذبۂ الفت و محبت کا اظہار ہو، اسی غرض سے وہ پسماندہ علاقوں میں اسکول، ریلیف کیمپ اور ہسپتال قائم کرتے ہیں اور نادار بچوں کی تعلیم کا نظم کرتے ہیں، اس کے اظہار کی غرض سے وہ اپنے گلے میں صلیب لٹکائے رہتے ہیں اور صلیب کا نشان بھی علامت کے طور پر عمارتوں پر نصب کیا جاتا ہے تاکہ اس سے ان کی قربانی و جاں نثاری کے جذبہ کا اظہار ہو، ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب انتقام کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر کوئی برا سلوک کرے تو اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، اگر کوئی کسی کے گال پر طمانچہ مارے تو اس کو چاہئے کہ اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کردے۔

اس مذہب کے پیروکاروں اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کو جو اذیتیں پہنچیں، وہ یہودیوں کے ہاتھوں پہنچیں جو ایک تاریخی حقیقت ہے، عیسائیوں نے یہودیوں کو اور یہودیوں نے عیسائیوں کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا، ماسونی تحریک عیسائیوں کو نقصان پہنچانے کے لیے قائم ہوئی، مسلمان جب اندلس میں داخل ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ یہودیوں پر

(☆) سہ روزہ دعوت، یکم مئی ۲۰۰۵ء۔

عیسائی حکمرانوں کی طرف سے سخت پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور وہ غلاموں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، مسلمانوں نے جو پابندیاں یہودیوں پر عائد تھیں، ان کو ختم کیا اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور اسی طرح مسلمانوں نے اپنے عہد میں عیسائی رعایا کے ساتھ ہمیشہ مساویانہ سلوک کیا، فلسطین میں ان کے اپنی مذہبی علاقوں کی زیارت کی سہولتیں دیں، انھوں نے کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ نہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو بگاڑنے کی کوشش کی اور نہ ان کے رہنماؤں کی حیثیت کو بگاڑا، قرآن کریم نے دشمنی کرنے والوں کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا ہے، عیسائیوں کے بارے میں قرآن کریم نے بڑے ہمدردانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر دوسرے انبیاء کے ساتھ بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے، عیسائیوں کے بارے میں ارشاد ہے:

> ایمان والوں سے سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے آپ یہود اور وہ جنھوں نے شرک کیا، ہی کو پائیں گے اور آپ ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں سب سے زیادہ قریب انھیں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور اس لیے کہ یہ تکبر نہیں کرتے۔ (مائدہ:۸۲)

یورپ کے عیسائیت کو قبول کرنے اور اسے اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کی خاطر ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے سے قبل عیسائیت کا یہی مزاج تھا، اس وقت عیسائیت کا زور خواہشات نفس اور مادی تقاضوں کو کچلنے پر تھا، دنیاوی وسائل اور دنیاوی اغراض ومقاصد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ رہبانیت پر قائم تھی، صلیبی جنگوں کے زمانہ میں کلیسا پر سیاسی اور مادی عنصر اور توسیع پسندی کا ذہن غالب آ گیا۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے عہد میں بظاہر کلیسا کے کنٹرول کو ختم کر دیا گیا مگر حقیقت میں عیسائیت کو سامراجی مقاصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ بنایا گیا، عیسائی مشنریوں

کی سرگرمیوں سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ سیاسی اقتدار کے لیے کلیسا کو کس طرح سیاسی تسلط اور سامراجیت کی تکمیل کا ذریعہ بنایا گیا، بعض مسیحی مبلغین کے بیانات سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ تبلیغ عیسائیت کا مقصد کسی کو عیسائی بنانا نہیں ہے، بلکہ ان کوششوں کا مقصد غیر عیسائیوں کو ان کے عقائد اور ان کی تہذیب وثقافت سے دور رکھنا ہے اور مغربی ثقافت ومغربی طرز فکر سے قریب کرنا ہے یا ان کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، مسلم ملکوں کو اس کا خاص نشانہ بنایا گیا، عیسائی تبلیغ کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ مسلمان اپنے معاشرہ سے جدا ہو کر ان کے ہم خیال بن جائیں اور ان کے مفادات کی تکمیل میں ان کا تعاون کریں۔ ایک مشہور مبلغ سموئیل زویمر کا کہنا ہے کہ ”عیسائی مشنریوں کا مقصد مسلمانوں کو عیسائیت میں داخل کرنا ہرگز نہیں ہے کیونکہ یہ تو ان کے لیے شرف وعزت کی بات ہے“۔ عیسائی مبلغین کا یہ رویہ اس لیے منفی ہے، حالانکہ کسی بھی مذہب وعقیدہ کی دعوت وتبلیغ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داعی مدعو کو اپنے عقیدہ کی تعلیمات سے متعارف کرائے جیسا کہ اسلامی دعوت وتبلیغ کا مزاج ہے۔ یہ مثبت طریقہ ہے اور اس میں دوسرے مذاہب کا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ حالت جنگ میں بھی غیر مسلم رعایا جو جنگ میں شریک نہ ہو، اس کے ساتھ حسن سلوک اور احترام کا حکم دیا گیا ہے، اس کے برخلاف عیسائی مبلغین دوسرے مذاہب کے بارے میں معاندانہ بلکہ محاربانہ رویہ رکھتے ہیں، وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کی وضاحت کے بجائے دوسرے مذاہب کی تعلیمات پر حملہ کرتے ہیں اور مغربی تہذیب جو خالص مادی تہذیب ہے، اس کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس کا بڑا ثبوت عیسائیت کا موجودہ مادی اور غیر اخلاقی تہذیب کے ساتھ روادارانہ رویہ ہے اور یورپ کے عیسائی ملکوں کے غیر انسانی سلوک پر خاموشی اختیار کرنا ہے، اس معاندانہ رویہ کا رخ سب سے زیادہ اسلام کی طرف ہے، اس لیے کہ عیسائیت کو اسلام اپنا

سب سے بڑا حریف نظر آتا ہے، جو حقیقت کے خلاف ہے، یہ تصور یورپ کے سیاسی عناصر کا پیدا کیا ہوا ہے، جن کی عالم اسلام کے ساتھ کشمکش سیاسی تھی، صلیبیوں نے اسے مذہبی رنگ دے دیا، تاریخ استشراق سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ مستشرقین کی اسلامی موضوعات پر بحث وتحقیق کا مقصد مذہب اسلام پر حملہ کرنا ہے، حقائق کو بدل کر پیش کرنا بیانات اور تحریروں میں کھل کر ہوتا رہتا ہے، بجز ان چند مستشرقین کے جنھوں نے انصاف پسند رویہ کا موقف اختیار کیا، اس معاندانہ رویہ نے صرف یورپ کے باشندوں خاص طور پر تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں صرف اسلام سے ہی نفرت وبیزاری، حقد وحسد اور عداوت نہیں بلکہ مشرقی ممالک کے لوگوں کو بھی اسلام سے بدگمان کیا جنھوں نے اس کا لٹریچر پڑھا یا ان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی، اس قسم کی معاندانہ تحقیقات ہی یورپ میں اسلام دشمنی کا اصل سبب ومحرک ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو اسلام کا براہ راست مطالعہ کرتا ہے، وہ اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اسے ان مصنفین واہل قلم کی مغالطہ آمیز تحقیقات کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، اس کا اظہار یورپ کے متعدد اسلام قبول کرنے والوں کے بیانات سے ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے، یہ موقف ومزاج عیسائیت کے اصل موقف ومزاج کے منافی ہے، اس لیے کہ عیسائیت کا حقیقی واصلی مزاج قرآن کریم کے بیان کے مطابق یہ ہے:۔

> اور جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھیں دیکھیں گے کہ ان سے آنسو بہہ رہے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ (مائدہ:۸۳)

عیسائیت میں یہ رجحان یورپ کے سیاسی اور سامراجی مزاج اور یہودی اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا، ان دونوں عناصر کے اتحاد سے عیسائیت میں انحراف آیا اور وہ سیاسی وسامراجی اور مادی مذہب میں تبدیل ہوگئی۔ مستشرقین نے جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت کو داغدار کرنے اور آپ کی پاکدامن زندگی کو ہدفِ طعن و تشنیع بنانے کی مذموم کوششیں کیں، سیرت مبارکہ کے موضوع پر ان کی تصنیف کردہ تمام کتابیں ان کوششوں کی بین دلیل ہیں، حالانکہ قرآن کہتا ہے:۔

جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک ایسے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، چنانچہ جب واضح نشانیاں آگئیں تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔ (صف:٦)

اس بشارت کی رو سے عیسائیت کو اسلام سے سب سے زیادہ قریب اور متعاون ہونا چاہئے، نجاشی نے جب قرآن پاک کی آیات سنیں تو اپنے تاثر اور اعتراف کو چھپا نہ سکا اور اس نے کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس سے ذرا بھی مختلف نہ تھے، قیصر روم نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے حالات سنے تو اس نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو ایک دن ان کا اس جگہ قبضہ ہوگا جہاں ہم ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

وہ (بچہ) بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے نبی بنایا اور (اس نے) مجھے بابرکت بنایا میں جہاں کہیں بھی رہوں اور (اس نے) مجھے نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ ہوں اور مجھے میری والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا اور مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا اور میرے اوپر سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں گا اور جس روز میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ (مریم:۳۰-۳۳)

مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ اپنی پوری تاریخ میں انتہائی رواداری کا معاملہ کیا، خاص طور پر بیت المقدس میں پہلی فتح سے لے کر آخری عہد تک وہاں کے عیسائی

مقدس مقامات اور عیسائی زائرین کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا۔ اندلس، مصر اور شام میں جہاں عیسائیوں کی بڑی تعداد آباد ہے، مذہبی رواداری اور سیاسی مساوات کا معاملہ کیا۔

سیاسی عناصر کے غلبہ اور سیاسی دباؤ کے سامنے کلیسا کے اپنے موقف ترک کر دینے کی وجہ سے کلیسا نے مسلمانوں کے بجائے یہودیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا، حالانکہ یہود ونصاریٰ کے مابین عداوت ودشمنی سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، سیاسی عناصر کے غلبہ کا سبب یہ ہوا کہ پوپ نے یہودیوں کی معافی کا پروانہ جاری کر دیا، اس دوستی کا اثر اتنا بڑھا کہ آج پوری عیسائی دنیا پر یہودیوں کا غلبہ وتسلط ہو گیا ہے، سیاسی واقتصادی غرض تمام شعبہائے زندگی میں ان کا پرچم اقبال لہرا رہا ہے، اس سیاسی اقتدار وغلبہ کا نشانہ مسلمان ہی بنائے گئے ہیں جو دنیا کے ایک تہائی حصہ میں آباد ہیں، مسلم دشمنی اور اسلام سے نفرت وبیزاری کے جذبہ کو ہوا دینے میں ان من گھڑت مضامین ومقالات اور مغالطہ آمیز کتابوں کا اہم کردار ہے جن کی زور وشور سے اشاعت کی جارہی ہے، ذرائع نشر واشاعت اسلام ومسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کا زبردست پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت وعداوت کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی جارہی ہے، اور اسلامی سرگرمیوں پر قدغن لگایا جارہا ہے، انہیں تمام سرگرمیوں اور مخالفانہ کوششوں کی وجہ سے یورپ میں مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں یورپ میں مسلمانوں کے بارے میں عیساؤں کا موقف معلوم کرنے کے لیے ایک سروے کرایا گیا ہے، اس سروے میں شریک ہونے والی ایک بڑی تعداد مسلمانوں سے ناخوش دکھائی گئی، جس سے ان کے وجود کو ملک کے لیے خطرہ قرار دیا، اس سے متاثر ہو کر یورپ کی بعض حکومتوں نے اپنے ملکوں میں مسلمانوں کی انسداد آبادی کے لیے عملی اقدامات بھی شروع کر دیے ہیں۔

دوسری جانب عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے اور اسلامی علاقوں کو عیسائی علاقہ بنا ڈالنے کے منصوبے بناتی رہتی اور اس کا اعلان کرتی رہتی ہیں، مزید

برآں یورپی ممالک اسلامی حکومتوں سے عیسائیوں کے مفادات کے تحفظ کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اور اگر اسلامی شریعت کی تطبیق ونفاذ کا کوئی قانون بنتا ہے تو یورپ میں ایک ہنگامہ دار وگیر بپا ہو جاتا ہے، لیکن عیسائی اکثریت والے ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف جب سخت کارروائیاں کی جاتی ہیں، تو یہی اقلیت اور انسانی حقوق کی دہائی دینے والے خاموش تماشائی بن جاتے ہیں، جس وقت اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرح کی یلغار ہے، یہودیوں پر تنقید پر پابندی لگائی جارہی ہے، یہاں تک کہ ہٹلر کے مظالم کی حقیقت پر بحث پر پابندی لگادی گئی ہے۔

دنیا کی تمام عیسائی تنظیمیں ذرائع ابلاغ، ٹریننگ یافتہ مشنریز جو ہر قسم کے اسباب ووسائل سے لیس ہیں۔ ان میں سائنسداں بھی ہیں، انجینئر بھی اور بہترین منصوبہ ساز بھی اس کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ وسائل وہ ہیں جن کا حصول انفرادی جدوجہد سے ممکن نہیں تا آنکہ حکومت وسیاسی حلقوں کا تعاون حاصل نہ ہو، یا کم از کم حکومت پشت پناہی کررہی ہو، اس لیے کہ ان مشنریوں میں اکثر تنظیموں کے پاس ہوائی جہاز، ریڈیو اسٹیشن، مواصلاتی نظام موجود ہیں، اور یہ چیزیں عیسائی دنیا کے نظام حکومت کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہیں، لیکن دعوت اسلام کی راہ میں معمولی سرگرمی پر سخت نظر رکھی جاتی ہے، اور اسلامی حکومتوں کی جانب سے دینی سرگرمیوں کو ملنے والے تعاون کی تمام راہیں مسدود کرنے کے احکامات صادر کیے جارہے ہیں، اسلامی حکومتوں کو ان تمام احکامات کو نافذ کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے، اسلامی دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کی راہ میں سخت ترین رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں، اور ان کے ہر کام کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جارہا ہے، چاہے وہ رفاہی کام کیوں نہ ہوں۔

ترکی سے شائع ہونے والے اخبار ''زمان'' نے ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۴ء کے اپنے شمارہ میں ایک رپورٹ بعنوان ''ترکی میں مسیحی سرگرمیاں'' شائع کی جس میں کہا گیا کہ مسیحی

تنظیمیں ۹۹ فیصد ترکی مسلمانوں میں کم از کم ۱۰ فیصد کو عیسائیت میں داخل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں، رپورٹ میں کہا گیا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے آئندہ ۱۶ برسوں میں مسلمانوں میں بائبل کے ایک لاکھ سے زائد نسخے تقسیم کیے جائیں گے اور ترکی میں مذہبیات کے علماء تیار کرنے کے لیے یہ تنظیمیں ایک مذہبی ادارہ بھی قائم کریں گی۔

اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ گزشتہ چند ہی سالوں میں تقریباً پندرہ ہزار سے زائد ترکی مسلمان اسلام ترک کر کے دیگر مذاہب مثلاً عیسائیت میں داخل ہو گئے ہیں، ایک طرف عیسائی مشنریوں کی یہ سرگرمیاں ہیں، دوسری طرف سیکولرزم کے ہاتھ اسلام کی دعوت اور تعلیم پر سخت پابندی ہے، ایسی ہی افسوسناک خبریں موریطانیہ کے بارے میں موصول ہوئیں ہیں۔

کویت سے شائع ہونے والے مجلّہ ''المجتمع'' نے ۱۴ فروری ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں ایک رپورٹ شائع کی کہ ''موریطانیہ کی اسلامی رفاہی تنظیموں پر پابندی عائد کی جارہی ہے، ۱۹۹۴ء میں مسلمانوں کی دسیوں رفاہی تنظیموں پر پابندی عائد کردی گئی۔ مدارس بند کردیے گئے، جن میں سرفہرست کلیہ الشریعہ اور دو اسلامی مدارس ہیں جب کہ سرکاری انتظامیہ ان غیر قانونی رسائل کی حمایت کرتی ہے جنہیں صلیبی عیسائی تنظیمیں استعمال کرتی ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ ''اخبارات میں ایسی کارروائیوں پر تنقید کی اجازت نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس موضوع پر لکھتا ہے تو اخبار ضبط کرلیا جاتا ہے، عیسائیت کے اس رجحان پر ''نواکشوط'' کے پادری نے کہا تھا کہ ''ہم نے بیج بو دیے ہیں اور اب بس فصل کاٹنے کا نمبر ہے''۔

عیسائی سرگرمیاں اسکولوں، اسپتالوں اور رفاہی کاموں کے ذریعہ جاری ہیں اور معاشرہ میں اباحیت و بداخلاقی کے پھیلانے کے سارے اقدامات کیے جارہے ہیں، اخباری رپورٹوں کے مطابق سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ تبلیغ عیسائیت نے باقاعدہ ایک مسلح جنگ کی صورت اختیار کرلی ہے۔

مجلّہ ''المجتمع'' نے لیبریا کے متعلق جہاں مسلمان بڑی اقلیت ہیں، لکھا ہے کہ وہاں عیسائی تنظیمیں بہت سرگرم ہیں، ایک رپورٹ کے مطابق عالمی چرچ نے ۱۹۹۵ء میں لیبریا میں جاری عیسائی سرگرمیوں کے تعاون کے لیے بڑا فنڈ مخصوص کیا ہے، لیبریا میں مسلم دشمن کارروائیوں کے سلسلہ میں ''المجتمع'' لکھتا ہے کہ صدر ٹائیلر کے عہد میں بڑی تعداد میں مسلمان ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور مسلح جھڑپوں میں ان کا جانی و مالی نقصان ہوا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ٹائیلر واشنگٹن اور ان امریکی کلیساؤں کے مخلص وفادار دوستوں میں ہے جو لیبریا کو اپنے منصوبہ کی پہلی کڑی قرار دیتے ہیں، سابق وزیر خارجہ کولن پاویل نے ۲۰۰۳ء میں صدر بش کے لیبریا دورہ سے قبل پادری ''بیل گراہم'' کے حوالہ سے جو دنیا کے مشہور عیسائی مبلغ ہیں، لیبریا میں جاری عیسائی سرگرمیوں کے حالات کے متعلق ایک رپورٹ بھی پیش کی تھی۔ ''المجتمع'' کی ایک رپورٹ کے مطابق عیسائی مشنریاں یورپ، افریقہ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں اپنی ملیشیا بھی تشکیل دے رہی ہیں، جو طاقت کے استعمال سے عیسائیت پھیلا رہی ہیں اور ان کو یورپ کے ممالک سے مدد مل رہی ہے۔

ان تمام رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی مشنریوں کا یورپی حکومتوں سے براہِ راست تعلق ہے اور یہ ڈھکی چھپی بات نہیں، ہر شخص اس سے واقف ہے، پوری دنیا میں عیسائی مشنریاں سرگرم عمل ہیں، اس سے یورپ کے اس دعویٰ کا پول کھل جاتا ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں غیر جانبدار ہے اور اس سے دین و دنیا کے درمیان تفریق بالکل غلط ثابت ہوئی ہے، بات صرف یہ ہے کہ پہلے بساط سیاست پر کلیسا کی حکمرانی تھی اور اب کلیسا پر سیاسی نظام کی بالادستی ہے اور یہ سابقہ حالت سے زیادہ خطرناک حالت ہے کیونکہ حکومتیں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرتی ہیں اور اسلامی سرگرمیوں کے تمام ذرائع و وسائل پر پابندی عائد کرتی ہیں۔

مشرق اور مغرب کے درمیان اختلاف کا سبب دولت نہیں، تصور حیات کا فرق ہے (☆)

مشرق ومغرب کے مابین حدِ فاصل دولت وثروت کی کثرت یا کمی، علم وواقفیت کی وسعت یا فقدان، یا بالفاظ دیگر فقر وافلاس، جہالت وناخواندگی، ترقی وپسماندگی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ حالات ہر فرد وخاندان، اور قوموں وملتوں کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور حالات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، اقوام وملل کی قدیم وجدید تاریخ میں اس انقلاب کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، دراصل مشرق ومغرب کے درمیان اختلاف اور امتیاز ایک خاص فلسفۂ حیات اور تصورِ زندگی کی بنیاد پر ہے، زندگی کا یہ تصور دونوں کو وراثت میں ملا ہے، دونوں علاقوں کا طرز زندگی ان کے اسی تصور حیات کی بنیاد پر قائم ہے، اس نظریہ زندگی کے بھی چند مخصوص اصول وضوابط اور مسلمہ قواعد وقوانین ہیں، اس تصور اور فلسفۂ حیات کا ہر شعبۂ زندگی پر اثر ہوتا ہے، اور ہر طبقہ کی زندگی میں خواہ وہ امیر ہو یا غریب، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، حاکم وکشور کشا ہو یا غلام محکوم ان اصول وضوابط کی جھلک نظر آتی ہے، ہر فرد اس کے دائرہ میں رہ کر اپنے شرف وعزت، معاشرہ میں اپنے مقام ومنصب، اور اپنی روایات واقدار کی حفاظت کرتا ہے، اور جو بھی ان مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے، معاشرہ میں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، بلکہ اس کو غیر مہذب اور سماجی لحاظ سے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

(☆) سہ روزہ دعوت دہلی، ۱۳/اگست ۲۰۰۵ء۔

مشرق ایک مدت تک اپنی روایات، خصوصیاتِ زندگی، اور تصور حیات کی حفاظت کرتا رہا، مغربی سامراج نے اپنے عہد میں ان قدروں میں کافی تبدیلیاں پیدا کردی تھیں، مگر اس کا اثر اس طبقہ پر زیادہ پڑا جو اس سے قریب تھے، یا اس کے آغوش میں پروان چڑھے تھے، اور انہوں نے اس اجنبی و نامانوس اور نو وارد تہذیب وثقافت کو اختیار کرلیا تھا، مگر وہ اپنے سماج سے کٹ کر زندگی گزارتے تھے۔

مغربی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر قائم تہذیب وثقافت کا دائرہ بڑھتا گیا، مگر اس کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ تک ہی محدود رہا، اور یہ تعلیم یافتہ طبقہ اقلیت میں ہونے، اور معاشرہ سے اپنے سماجی تعلق کی وجہ سے بعض اقدار وروایات کی پابندی پر مجبور تھا، تاکہ کلی طور پر وہ معاشرہ سے جدا نہ ہونے پائے، یہ طبقہ یورپ سے اپنے تعلق اور خاص فضاؤں میں نشوونما پانے نیز مغربی مصنفین کے پیش کردہ افکار وخیالات اور نظامِ حیات کو اخذ کرنے کی وجہ سے مغربی رنگ میں رنگ گیا تھا، اور اپنے دین ومذہب، اپنی تاریخ، اپنے ملک کی ذہنیت اور یوروپ کے سیاسی رہنماؤں کے بارے میں وہی نظریہ رکھتا تھا جس کو یورپین مصنفین نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں پیش کیا ہے، اس لئے کہ مغربی تعلیم کے ایسی ہی ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے، یوروپ نے ابتدائی مرحلہ میں علمی اعتبار سے پسماندہ اور کمزور قوموں کے افکار ونظریات میں تبدیلی لانے کے لئے علم کو آلۂ کار بنایا، مشرقی ممالک کے مفکرین ومصلحین اس علمی یلغار کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے، اور اس کے مقابلہ کی انہوں نے کوئی تدبیر نہ کی، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس علم سے صرف وہ لوگ متاثر ہیں جو مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کا سماج پر کوئی اثر نہیں ہے۔

اس علمی وفکری یلغار نے جس کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھا آزادی کے بعد نیا انداز اختیار کیا، جس سے اس کا دائرہ اثر اور وسیع ہوگیا، یہ ادب، اور وسائل ابلاغ کا حملہ تھا، جس سے مغربی فکر وتہذیب نے علمی حلقوں سے نکل کر عوام کو متاثر کرنا

شروع کردیا، یہ حملہ اگر علاقائی ہوتا تو علمی حملہ کی طرح اس کا اثر بھی محدود ہوتا، اسی میں وطنیت اور علاقائیت کی چھاپ بھی ہوتی لیکن ذرائع ابلاغ کے مغربی ذرائع سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کوئی فرد وخاندان اس حملہ سے محفوظ نہیں ہے، ریڈیو، ٹی، وی اور پریس کی روشن دان کی حیثیت ہے جس سے مغربی فکر وانقلاب ہر گھر میں داخل ہورہا ہے، اور ہر ذہن اس سے متاثر ہورہا ہے۔

مغربی تہذیب کے اثر انداز ہونے کا یہ ذریعہ علم کے ذریعہ سے زیادہ طاقتور، موثر اور وسیع ذریعہ ہے، علم کے سلسلہ میں جو غفلت برتی گئی، اور مغربی لٹریچر کا مقابلہ کرنے میں جو کوتاہیاں ہوئیں، وہی غفلت وکوتاہی اس ذریعۂ تربیت کے سلسلہ میں اگر برتی گئی تو وہ تہذیبی خودکشی کے مرادف ہوگی، بین الاقوامی میڈیا، مادی اسباب ووسائل، فنی تجربات اور فتح وغلبہ کے جن محیر العقول جنگی آلات سے لیس ہے، اس کے مقابلہ کے لئے چند باحمیت افراد کی یہ کوششیں نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں، مگر اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں، یہ کوششیں اس یلغار کو روک تو نہیں سکتی مگر کم از کم اس حملہ کے خلاف بیداری پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہوسکتی ہیں، ضرورت ہے کہ ان کوششوں کو ماہرین فن کا تعاون ملے، اور مادی وسائل بھی فراہم کئے جائیں، مسلم حکومتیں مغربی حکومتوں کی وفادار ہونے کی وجہ سے اس کی مدد نہیں کرسکتیں، مگر جن افراد کو مادی وسائل حاصل ہیں ان کو اس کوشش میں بھرپور حصہ لینا چاہئے، یہ اس لئے کہ مظلوم کا دفاع کرنے کے بعد ہی ظالم پر حملہ آور ہونے کی باری آتی ہے، اور ذرائع ابلاغ میں ترقی کے بغیر امت مسلمہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ اس حملہ کا دفاع کرسکے۔ اس وقت مغربی میڈیا ظالم کو مظلوم، اور مظلوم کو ظالم، امن کو جنگ اور جنگ کو امن اور بے حیائی کو فن ثابت کرنے میں مصروف ہے۔ اس کا مقابلہ اس ذریعہ اور اس ٹیکنک سے کیا جاسکتا ہے۔

بعض مفکرین اسلام نے اس سنگین حملہ کا صحیح اندازہ لگایا ہے اور صحافت، نشر واشاعت، ٹیلی ویژن، فلموں اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اپنے وسائل کے اعتبار سے اس حملہ کا مقابلہ شروع کیا ہے، جس سے بہت سے ذہنوں کو مدد مل رہی ہے، اور غلط فہمی دور ہو رہی ہے، اور صحیح رخ سامنے آرہا ہے، اس وقت ٹی وی کے متعدد چینلز اسلام دشمن عناصر کے تصرف میں ہیں، ان کے مقابلہ میں اسلام کے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کے ازالہ، اسلام کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرنے، مظلوموں کا دفاع کرنے اور ان کی مدد کرنے میں بہترین کردار ادا کرنے کے لیے محدود پیمانہ پر کام کر رہے ہیں، اسی طرح متعدد ویب سائٹ اسلامی فکر کے حاملین کے دست تصرف میں ہیں، خاص طور پر عرب ممالک کی طرف سے یہ کام زیادہ وسعت سے کیا جارہا ہے، مگر اس میں مزید وسعت اور قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ذرائع ابلاغ کے بعد ایک دوسری جنگ کی ابتداء ہو رہی ہے، اس جنگ کا مقصد کمسن ونوخیز بچوں کو مغربی تعلیم دے کر ان کے ذہنوں میں مغربی افکار وخیالات کی آبیاری کرنا ہے، یہ کام کارٹونی فلموں اور گیمس کے ذریعہ انجام پارہا ہے، لیکن اس حملہ کا دائرہ بھی ترقی یافتہ اور خوشحال طبقہ تک محدود ہے، اس حملہ کی قیادت امریکہ کر رہا ہے، امریکہ نے اس منصوبہ کی تکمیل کی خاطر اولاً اسلامی ممالک کے نظام تعلیم وتربیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی اس نے غیر مسلم اقلیت، سرکش وشر پسند عناصر کو ابھارا، انہیں باثر عہدوں تک پہنچا کر اسلام کے بارے میں اسے بدظن کیا، ان کے ذہنوں میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کئے، اور اسلامی حکومتوں سے ان عناصر پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا جن سے اسے اپنی مخالفت کا خدشہ تھا۔ یہ ایک نیا اقدام ہے جو سابقہ اقدامات اور مکاریوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ نے حال ہی میں ''عربی مدارس'' کے عنوان

سے ایک عربی پروگرام کے شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے، جس میں عربی زبان میں مختلف اقسام کی دلچسپ کتابیں فراہم کی جائیں گی، یہ کتابیں عربی ممالک کے ابتدائی مراحل کے چوتھے پانچویں درجات میں پڑھنے والے عرب بچوں کے لئے صہیونی اور امریکی بچوں کی کتابوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امریکہ نے دس لاکھ کتابیں بھیجی ہیں، جن سے ایک لاکھ بیس ہزار طلبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس کے لئے چھ ہزار اساتذہ کو تربیت دی جائے گی، اس منصوبہ کی پوری تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عرب دنیا کے بچوں کو امریکی فکر وثقافت سے مانوس کرا کے ان کو امریکہ کا ہمدرد بنایا جائے، تاکہ بعد میں وہ امریکی مفادات کے محافظ بنیں۔

عرب ممالک میں رائج نصاب تعلیم میں ترمیم وتبدیلی کے لئے امریکہ جو سرمایہ خرچ کر رہا ہے اس سے قطع نظر صرف اس منصوبہ میں خرچ کی جانے والی رقم خطیر خود ایک عظیم خطرہ کی پیشین گوئی کرتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ نے صرف مصر کے نصاب کو تبدیل کرنے کے لئے بیس لاکھ ڈالر کا بجٹ مقرر کیا ہے، اسی طرح اسلامی وقومی اور وطنی فکر پیش کرنے والے ذرائع اور پروگراموں کے دائرہ اثر کو محدود کرنے کے لئے بھی مالی سرمایہ مقرر کیا ہے، یہ منصوبہ صرف اسلام ہی کا مخالف نہیں، بلکہ ملک وملت کے مفاد کے بھی خلاف ہے، وہ لوگوں کے دلوں سے قوم ووطن کی محبت ختم کرنا چاہتا ہے، بعض امریکی تجزیہ نگاروں کے بیانات کے مطابق یہ بھی منصوبہ عالمگیریت کا ایک جز ہے اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، اور اس کی وجہ سے نئی نسل کے ذہن وخیالات میں پیدا ہونے والے اثرات کے ازالہ کی تدابیر نہ کی گئیں تو وہ دن دور نہیں کہ مشرقی زندگی مغربیت کے سانچہ میں ڈھل کر اپنا وجود کھو بیٹھے گی، اس فکری وثقافتی حملہ کا

نشانہ تعلیم یافتہ طبقہ بنا تھا اس لئے اس کا اثر چند مخصوص افراد تک ہی محدود رہا، معاشرہ کی رسوم اور رواج اور اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی، لیکن یہ آخری منصوبہ ملک وسماج کو مغربی سماج کے نقال اور مقلد محض بنادے گا۔

یورپ نے اپنی بیداری کے وقت مشرق پر جو فکری یورش کی تھی مسلمانوں کو ان کی پسماندگی کی وجہ سے اس کا تلخ تجربہ ہوا، کیونکہ وہ سائنس کے میدان میں پسماندہ تھے، اجنبی زبانوں سے ان کی واقفیت صفر کے برابر تھی۔

چند افراد جو ان زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے تو وہ مغرب ہی کے پروردہ اور اسی کے خوشہ چین تھے، اس لئے ان لوگوں نے محض مغربی مضامین کے اخذ کرنے پر ہی اکتفا کیا، لیکن مغربی تہذیب کے دامن میں جو مکر وفریب، اور فاسد عناصر موجود تھے اس کا ادراک نہ کر سکے۔

پھر جب ذرائع ابلاغ کا رواج ہوا اور یہودیوں کی اس پر بالادستی قائم ہوگئی تو انہوں نے میڈیا کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا، مسلمانوں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی، لیکن جب یہ خوب پھیل گیا، اور اس کا دائرہ اثر کافی بڑھ گیا، تب وہ اس میدان میں اترے لیکن اب بھی اس میدان میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، اگر مفکرین اسلام اور دانشوران ملت نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور علمی وفنی اعتبار سے اس کے مقابلہ کی تیاری نہ کی تو وہ دن دور نہیں جب اس سے ایک فکری وثقافتی انقلاب نمودار ہوگا۔

اس لئے حالات کا تقاضہ ہے کہ نوخیز بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت کے لئے نہایت مؤثر ودل آویز اور دلچسپ ادبی کتابیں تصنیف کی جائیں، درحقیقت یہ صرف بلاد عربیہ کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے، ہندوستان کے نصاب تعلیم میں بھی شدت سے ہمیں اس کمی کا احساس ہے، صرف درسی کتابوں کی تہذیب وتنقیح، نصاب تعلیم سے زہر آلود مواد کے ازالہ، اور عمدہ نصاب تعلیم مرتب کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ثقافتی میدان میں بھی اسی فکر کی ضرورت ہے۔

مغربی تہذیب چہرہ روشن
اندرون چنگیز سے تاریک تر (☆)

آقائے نامدار محسن انسانیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ جن کی عزت و شرافت، عفت و پاکدامنی اور انسانیت نوازی کی گواہی قرآن کریم نے ان الفاظ میں دی ہے (ورفعنا لك ذكرك) (إن شانئك هو الأبتر) (انك لعلى خلق عظيم) ایسی مقدس و پاک طینت شخصیت کے خلاف یورپی اخبارات میں شائع ہونے والے اہانت آمیز کارٹونوں سے مغربی تہذیب کی حقیقت و اصلیت اور اس میں پائے جانے والا تضاد سامنے آگیا ہے جس سے دنیا کو معلوم ہوگیا ہے کہ مغربی تہذیب، اخلاقی اور انسانی قدروں سے کس قدر عاری ہے، جب کہ مغربی تہذیب کے علمبردار دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ باہمی عزت واحترام اور عفو درگذر کی بنیادوں پر ہی کسی تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تعمیر ہوا کرتی ہے۔ تہذیبوں کے اولین اور بنیادی اصول یہی عفو و درگذر اور انسانی تعاون و ہمدردی کے جذبات ہوا کرتے ہیں، ہر وہ تہذیب جس میں یہ اصول و مبادیات اور عناصر موجود نہ ہوں، اسے ہرگز تہذیب و ثقافت کے نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ تہذیب انفرادی آزادی، مطلق العنانی، ظلم و زیادتی اور خودرائی کے سراسر مخالف ہے اور ہر وہ معاشرہ جس میں انفرادی آزادی، قومی عصبیت اور انانیت و خودمختاری کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/مارچ ۲۰۰۶ء۔

موقع ملتا ہو، اس معاشرہ میں حقیقی تہذیبی و اخلاقی اقدار کبھی بھی فروغ نہیں پا سکتے۔ اسی کے ساتھ ایک ایسے نظام وقانون کا پایا جانا بھی ضروری ہے جس میں مختلف طبقوں کے عقائد وخیالات اور دوسروں کے جذبات کا بھرپور خیال رکھا گیا ہو، اس لیے کہ جس معاشرہ میں باہمی تعاون و ہمدردی اور عفو و درگذر کی روح موجود نہ ہو، وہاں یک قطبی نظام عمل کا قیام کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں کسی شخص یا جماعت کو دوسروں کی توہین وہتک عزت کرنے، ان کے عقائد ودینی اقدار و روایات کا تمسخر کرنے اور ان کے مقدسات کو پامال کرنے کی پوری آزادی دی جاتی ہو، وہاں ایسے نظام عمل کے قیام کا منصوبہ کیوں کر پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

آج یورپ جس آزادی رائے کا راگ الاپ رہا ہے، اور اسے وہ تہذیب و تمدن کا رکن اساسی قرار دیتا ہے، اگر اس سے کسی انسان کی عزت وشرافت پر حرف آتا ہو، یا اس سے کسی مخصوص طبقہ کے عقائد اور مذہبی قدروں کی حرمت وتقدس کی پامالی ہوتی ہو تو خود یہ علمبرداران حریت اس آزادی پر پابندیاں عائد کرنے کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، کوئی بھی معاشرہ ایسا نہیں جو اظہار رائے کے حق کو مطلقاً آزادی دیتا ہو اور اس پر کسی قسم کی اخلاقی یا مذہبی پابندیاں عائد نہ کرتا ہو، پوری دنیا اس اظہار رائے کے حق کو کچھ اصول وضوابط اور حدود وقیود کا پابند بناتی ہے، اس لیے کہ اس کو مطلق آزادی دے دینے کی صورت میں لاقانونیت، طوائف الملوکی، اخلاقی وفکری انارکی کے عناصر سر ابھارتے ہیں یا کم از کم اس سے باہمی تعلقات میں کشیدگی اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہانت آمیز کارٹون شائع کرنے والے ڈنمارک کے اخبار کے خلاف ان مدعیان حریت نے سخت موقف اختیار نہ کرنے یا کم از کم ناپسندیدہ وغیر شائستہ قرار نہ دینے میں اسی فلسفہ حریت وآزادی

رائے کا سہارا لیا ہے، اسی لیے اس کارٹونسٹ پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی۔ ان کی نظر میں ایسا کرنا اظہار رائے کی آزادی میں مداخلت کے مرادف ہے۔

نائب امریکی وزیر خارجہ کے بیان سے بھی اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ صحافت کو کسی بھی طرح مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح انہوں نے اہانت آمیز کارٹونوں کے خلاف پوری دنیا میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں پر سخت تنقید کی ہے، انہوں نے کہا کہ یہ احتجاج اور مظاہرے غیر اخلاقی اور ناپسندیدہ ہیں، نیز امریکی وزیر خارجہ ''کونڈ ولیزا رائس'' نے کہا کہ ان کارٹونوں کی اشاعت سے وہ متفق نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ پورے عالم اسلام میں اس کے ردعمل کے طور پر ہونے والے اشتعال انگیز مظاہرے اور احتجاج بھی کسی طرح جائز نہیں قرار دیے جا سکتے۔ انہوں نے شام و ایران کو دھمکی دی کہ ان مظاہروں اور احتجاجوں کا انجام اچھا نہیں ہوگا، انہوں نے ان دونوں سے ان مظاہروں و احتجاجی جلوسوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، اس بیان کے فوراً بعد بعض مسلم ممالک خصوصاً پاکستان نے مظاہروں کے خلاف سخت کارروائیاں کیں، بڑی تعداد میں احتجاج کرنے والوں اور مظاہرین کو گرفتار کیا گیا۔

آزادیٔ رائے کے سلسلہ میں خود یورپ کے رویہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزادیٔ رائے کا فلسفہ متضاد بنیادوں پر قائم ہے۔ اس لیے کہ میڈیا اور صحافت کے ذریعہ جس وقت اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور ان کی مقدس و محترم شخصیات کی توہین کی جاتی ہے تو صحافت کو مطلقاً آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر مسلمان اسی آزادی رائے کے حق کا استعمال کر کے غیر انسانی و جارحانہ حملوں کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں تو یورپ کے مدعیان حریت اسے خلاف انسانیت و ناپسندیدہ عمل قرار دیتے ہیں، یہ عجیب و غریب

تضاد ہے کہ ایک طرف تو اظہار رائے کی مطلقاً آزادی حاصل ہو اور دوسری طرف اس پر پابندیاں لگائی جائیں۔

اس تضاد کی بدترین مثال یہ ہے کہ ڈنمارک کے اخبار ''جیلنڈس بوسٹن'' نے جب نبی انسانیت کے اہانت آمیز کارٹون شائع کیے تو یورپ و امریکہ نے اس کی اس ذلیل حرکت کو آزادیٔ رائے کا نام دے کر پروانۂ جواز عطا کر دیا اور ذرہ برابر بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس واقعہ کے بعد دیگر یورپین اخباروں نے بھی ان اہانت آمیز کارٹونوں کو دوبارہ شائع کیا، اور ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا، یہ مغرب کا خبث باطنی ہے، ان اہانت آمیز کارٹونوں کے تعلق سے خود یورپ کا آزدیٔ رائے کے سلسلہ میں متضاد رویہ اس کی دوغلی پالیسی کو بے نقاب کرتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کے ۲۵ رفروری ۲۰۰۶ء کے شمارے کے مطابق لندن کے میئر کین لیونگسٹن (Kenlevingiston) کو اپنے عہدہ سے صرف اس بنا پر ہٹا دیا گیا کہ انہوں نے ایک یہودی صحافی کا ایک نازی فوجی کیمپ کے چوکیدار سے موازنہ کیا، میئر کو عہدہ سے معطل کر دینا آزادیٔ اظہار رائے کے سراسر خلاف ہے، لیکن مدعیان حریت نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

دوسری طرف یہودیوں کے متعلق ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے ایک بیان پر پورے یورپ میں کھلبلی مچ گئی، اس لیے کہ صدر ایران نے ''ہولوکاسٹ'' کے سلسلہ میں اپنے شک وشبہ کا اظہار کیا تھا، کیوں کہ یورپ نے ہولوکاسٹ کی تحقیق و تفتیش کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے، یورپ ''ہولوکاسٹ'' کے مسئلہ پر لب کشائی کو سامی دشمنی پر محمول کرتا ہے، تازہ خبر ہے کہ آسٹریا کی ایک عدالت نے مشہور برطانوی مورخ ڈیوڈ آرونگ کو قید کرنے کی سزا دی ہے صرف اس بنیاد پر کہ انہوں نے بھی ہولوکاسٹ کی سچائی پر شک کا اظہار کیا ہے۔ آزادیٔ رائے پر پابندیوں کا

سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا، بلکہ یورپ نے تو تعلیم وتربیت کے مراکز پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ کسی شخص کو مغربی تہذیب وتمدن کی برائیوں پر تنقید کرنے کی آزادی حاصل نہیں، افغانستان وعراق میں جاری امریکی ظلم وستم اور ایذا رسانیوں، نیز عالم اسلام کے بیشتر ممالک میں یوروپ کے دباؤ، مختلف قسم کی پابندیوں کے خلاف بھی کسی کو آواز بلند کرنے کا حق حاصل نہیں، یہ واقعات کوئی نئے نہیں، پوری دنیا اس سے واقف ہے، خود امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے دہشت گرد کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کے دوران کہا تھا کہ ان کے منصوبے اور نظریہ سے جو شخص بھی متفق نہیں وہ ان کا دشمن ہے۔ دنیا کا کوئی بھی صدر یا لیڈر جو ان کی مخالفت کی جرأت کرے گا اس کے خلاف سخت کارروائیاں کی جائیں گی۔

اس عجیب وغریب تضاد کی تازہ مثال فلسطین کے پارلیمانی انتخابات میں ''حماس'' کی شاندار فتح ہے کہ جب فلسطینیوں نے جمہوری طریقہ پر اپنا حق رائے دہی استعمال کر کے ملک کے پارلیمانی انتخابات میں ''حماس'' کو منتخب کیا تو پورا یورپ چراغ پا ہو گیا۔ آزادیٔ رائے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ امریکہ حکومت کی تشکیل میں تنظیم حماس کا تعاون کرتا اور اس کی ہر ممکن مدد کرتا، کیوں کہ حماس کی فتح اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسطینی عوام نے اس میں آزادیٔ رائے کے حق کا استعمال کیا ہے، اس کے برخلاف امریکہ تنظیم حماس کی نہ صرف یہ کہ اس کی امداد بند کرنے اور اس سے تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی، بلکہ اسے اقتدار سے دور رکھنے کی تدبیریں بھی کر رہا ہے۔

پوری دنیا میں وسیع پیمانے پر آزادی رائے پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں، اور خود یورپ وامریکہ بھی اس کے مخالف ہیں حتی کہ بعض ممالک کی عدالتوں کے فیصلے بھی ان بندشوں اور پابندیوں سے آزاد نہیں، ججوں کو امراء وحکام کی خواہشات اور ان کے مفادات کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، آزادیٔ رائے کے حق کا استعمال

کرنے والے صحافیوں اور نامہ نگاروں کو کبھی تو نظر بند کر دیا جاتا ہے اور کبھی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

آزادیٔ رائے کے اس فلسفہ کا کھوکھلا پن اس واقعہ سے اور واضح ہو جاتا ہے کہ جس اخبار نے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے توہین آمیز کارٹون شائع کیے ہیں، اسی نے اس سے قبل بعض ان شخصیات کا جو ڈنمارک کی اکثریت کے نزدیک مقدس و محترم خیال کی جاتی ہیں، کارٹون شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے اس انکار کو مطلقاً آزادیٔ رائے کے مخالف نہیں سمجھا گیا، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ یوروپ آزادیٔ رائے کا ایک خاص تصور رکھتا ہے، اور اسی مقصد کے خاطر آزادیٔ رائے کے حق کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ان اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت سے حقیقتاً سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، اس سے تو مسلمانوں کی دینی غیرت وحمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے، اس لیے کہ ان کارٹونوں کے خلاف پوری دنیا کے مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں اپنے عشق ومحبت اور اپنی فدائیت ووفاداری اور جاں نثاری و جاں سپاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ دسیوں لوگوں نے تو آپ کی خاطر اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں اور ہزاروں نے اس سعادت وسرخروئی کے حاصل کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، اس ایمانی کاروان میں وہ لوگ بھی نظر آئے جو اس سے قبل آپ کے تئیں اتنے زیادہ مخلصانہ اور سرفروشانہ جذبات نہیں رکھتے تھے، اس واقعہ نے خوابیدہ جذبات کو مہمیز لگائی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں حرارت ایمان کے اضافہ کا سبب بنا ہے، جو یقیناً لائق ستائش اور قابل قدر ہے ڈنمارک کی اخبار کی اس قبیح اور قابل مذمت حرکت کے خلاف کثرت سے مضامین اور مقالے بھی لکھے جا رہے ہیں جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کی واقفیت میں اضافہ ہوا ہے

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت واخلاق کے سمجھنے کا نہایت بیش قیمت موقع فراہم ہوا ہے، لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے واقفیت حاصل کرنے کی خاطر سراپا شوق بنے ہوئے ہیں، اس واقعہ سے پوری دنیا کو معلوم ہوگیا ہے کہ مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا عشق ومحبت اور کس قدر غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں۔ اور آپ کی خاطر کیا کچھ کر گذرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں، اس اخبار نے درحقیقت خود اپنے ملک اور مغربی تہذیب کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی ہے، اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ مغربی تہذیب کس قدر بے باہمی تعاون و ہمدردی، الفت و احترام اور دیگر اخلاقی وانسانی قدروں کا نام ونشان نہیں، مغربی تہذیب درحقیقت دوسروں پر سب و شتم کرنے، ان کی عزت وآبرو اور مقدسات کو پامال کرنے والی ایک غیر انسانی تہذیب ہے، اور یہ بھی دنیا نے جان لیا ہے کہ یورپ کے یہ اربابِ حریت کس قدر غیر مہذب، رجعیت پسند اور تنگ نظر ہیں۔

سامراج کی تاریخ اور محرکات (☆)

مغربی سامراج کے محرکات متعدد رہے ہیں، وہ استشراق کی طرح مذہبی، تجارتی، سیاسی، ثقافتی اور تاریخی اسباب پر مشتمل ہیں، صلیبی جنگیں جن کا سلسلہ اربن دوم نے شروع کیا تھا، وہ ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک چلا، آخر کار فرانس کے حکمراں لویس نہم louisIX (۱۲۱۴۔۱۲۷۰ء) نے فوجی محاذ پر ناکامی دیکھتے ہوئے اپنے انتقال کے وقت وصیت کی کہ مسلمانوں کو جنگ کے ذریعہ مغلوب نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس مقصد کی تکمیل کے لئے سیاسی وسائل اختیار کئے جائیں، اوران میں افتراق اور باہمی ٹکراؤ اوران کے مذہبی عقائد میں شک وشبہ پیدا کیا جائے۔

یہ وصیت نامہ محفوظ ہے، اس کی بنیاد پر پوپ نے علمی مراکز کے قیام اور خاص طور پر اسلامیات کے مطالعہ کو عام کرنے کی ہدایات دیں، جس کو عالم اسلام کی علمی ،ثقافتی اور فکری تسخیر کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں ایک دوسری وصیت کا ذکر مقصود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ نے علمی اور ثقافتی اور ذہنی تسخیر کے ساتھ ساتھ فوجی غلبہ کے تصور اور عالم اسلام پر عملی قبضہ کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ اس کو اپنے سابق الذکر مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا۔

یہ وصیت نامہ جس کو سامراج کی دستاویز کہنا مناسب ہے ۱۵/مارچ ۱۶۷۲ء کو لیبنز leibniz (۱۶۴۶۔۱۷۱۶ء) نے جو جرمن مفکر تھا لویس چودہویں louisXIV کو روانہ کیا تھا، اس وقت فرانس طاقتور ملک تھا اور جرمنی سے اس کی

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/ستمبر ۲۰۰۶ء۔

کشمکش تھی، جرمن مفکر نے ۱۶۷۲ء میں پیرس جا کر لویس چودھویں کو جرمنی کے بجائے مصر پر حملہ کے فوائد سمجھائے، اس میں تحریر ہے:

''میں آپ کی توجہ ایک پلان کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں، یہ مصر پر حملہ اور قبضہ کا پلان ہے، مصر کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس پر قبضہ کرنے سے پورے عالم پر قبضہ کیا جا سکتا ہو، اور ساری دنیا کی تجارت اپنے قبضہ میں آسکتی ہو، یہ کثیر آبادی اور زرخیز زمین والا ملک ہے، جس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ قدیم زمانہ میں علم وتمدن کا مرکز رہا ہے، اور خدا کی نعمتوں کا حامل ،لیکن اب یہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے، جو ہمارے دشمن ہیں، یہ کیوں مسیحیت سے محروم رہے، یہ ایشیا اور افریقہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے ذریعہ ہم ایشیا اور افریقہ پر قبضہ کر سکتے ہیں، یہ بحر احمر Red Sea اور بحر ابیض Mediterranean کے درمیان حائل ہے، پورے مشرق تک پہنچنے کا راستہ ہے، آپ کے لئے مصر پر قبضہ آسان ہے۔

قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہے، لیکن اگر مصر پر ہنگامی حملہ کیا جائے تو خلافت عثمانیہ کے لئے اس کی مدد کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ مصر وسیع ریگستانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے''۔

لیبنز ہی نے نہر سوئز کا خیال پیش کیا، جس کی تکمیل بعد میں ۱۸۵۹.۱۸۶۹ء میں فرانسیسی ماہرین کے ذریعہ ہوئی۔

سامراج کی تاریخ سترہویں صدی سے شروع ہوئی ہے، برطانیہ، پرتگال، فرانس اور ہالینڈ نے متعدد اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کی اسی دور میں کوششیں کیں، جن کے نتائج اٹھارویں صدی میں ظاہر ہوے۔

نپولین نے مصر پر اٹھارویں صدی کے آخر میں (۱۷۹۸ء) قبضہ کیا ہے، اور

اس کے قبضہ سے مصر اور مشرق وسطی یورپ کے زیر اثر آ گیا، فوجی لحاظ سے نپولین کو مصر سے نکلنا پڑا، لیکن اس مختصر قبضہ کے دوران وہاں جو ذہنی تبدیلی آئی اس کے اثرات باقی رہے، مصری حکومت نے بعض داخلی مسائل کی وجہ سے برطانیہ سے مدد مانگی، جس کے نتیجہ میں مصر پر برطانیہ کا عملی کنٹرول ہو گیا، اور مصر کا سیاسی اور تعلیمی نظام برطانیہ کے قبضہ میں آ گیا، اور دینی اور قومی تحریکوں کو کچلنے کا کام انجام پایا، خلافت عثمانیہ کے آخر عہد میں اکثر علاقے برطانیہ اور فرانس کے قبضہ میں آ گئے، ان کے وہاں علمی اور تجارتی مراکز اس قبضہ سے پہلے ہی قائم ہو چکے تھے۔

ہندوستان کا ساحلی علاقہ سولہویں صدی میں پرتگال کے قبضہ میں آ گیا تھا، ہالینڈ کے لوگ تاجر کی حیثیت سے انڈونیشیا میں داخل ہوئے، اور سترہویں صدی میں اس پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سترہویں صدی سے شروع ہو گئی تھی، اور انہوں نے تجارت، صنعت اور زراعت میں حصہ لیا، اور تعلیمی ادارے کھولے، مغل حکمرانوں سے بڑی مراعات حاصل کیں، اور باقی علاقے ترقی دینے کے نام سے حاصل کئے، اور اپنی فوجی طاقت منظم کرتے رہے، آخر میں ۱۸۵۷ء میں پورے ملک پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

یورپ کے سامراج کی تاریخ مشرق وسطی سے شروع ہوئی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا وصیت میں ذکر کیا گیا ہے، موجودہ دور میں معلوم ہوتا ہے کہ پھر اس وصیت پر عمل کیا جا رہا ہے، اور سامراجیوں کی پوری توجہ عالم اسلام پر مرکوز ہے، اور دینی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کی راہ ہموار کی جا رہی ہے اور اس علاقہ کو دوسرے علاقوں پر کنٹرول کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے، اسکا نام گلوبائزیشن ہو، یا دہشت گردی کی بیخ کنی۔

سیکولرزم اور جمہوریت کے پیمانے (☆)

مغربی ذرائع ابلاغ نے سیکولرزم کے نام پر ترکی کے صدارتی انتخاب میں عبد اللہ گل کی شرکت پر بڑا شور مچایا کہ وہ اسلامی پس منظر رکھتے ہیں اور ایسے شخص کا حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونا سیکولرزم کے لیے بڑا خطرہ ہے، حالانکہ عبداللہ گل نے صدارتی انتخاب میں شرکت کے اعلان کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ترکی کے سیکولر قانون کی پابندی کریں گے، عبداللہ گل کی امیدواری پر اندیشہ اور خوف کی وجہ اسلامی رجحان رکھنے والی پارٹی سے ان کی وابستگی ہے اور وہ اپنی پرسنل زندگی میں اسلامی تعلیمات اور دینی احکامات کی پابندی بھی کرتے ہیں، اور انہیں عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہے، نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ:۔

> ترکی کے ایوان صدارت میں ایک ایسا شخص پہنچنے والا ہے جو اسلامی پس منظر رکھتا ہے۔

رپورٹر نے ترکی کی فوج اور یورپی یونین کے ذرائع کے حوالہ سے شائع کیا کہ:۔

> عبداللہ گل جو اس وقت وزیر خارجہ ہیں اگر صدر بن گئے تو یہ تشویش کی بات ہوگی، اس لیے کہ صنفی مساوات، شراب نوشی اور منی اسکرٹس کا استعمال خطرہ میں پڑ جائے گا، گل کی اہلیہ خیر النساء اسکارف استعمال کرتی ہیں۔

رپورٹر نے استنبول کے اخبار ''زماں'' کے ایک کالم نویس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

> حکمراں پارٹی اے کے پی جس سے عبداللہ گل تعلق رکھتے ہیں ایک نئی

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رمئی ۲۰۰۷ء۔

سماجی قوت ہے، یہ لوگ باعمل مسلمان ہیں، شراب نہیں پیتے، جوا نہیں کھیلتے، چھٹیاں ضائع نہیں کرتے، ان کے اندر زبردست توانائی ہے، جسے مملکت نے اب تک دبا رکھا تھا۔ (انڈین ایکسپریس ۲۶/اپریل ۲۰۰۷م، بحوالہ ''سہ روزہ دعوت''، یکم مئی ۲۰۰۷م دہلی)

چنانچہ عالمی میڈیا نے اسلامی پس منظر رکھنے کی وجہ سے ترکی جیسے سیکولر ملک کے صدارتی انتخاب میں عبداللہ گل کی امیدواری پر طوفان کھڑا کر دیا کہ اگر وہ صدارتی انتخاب میں کامیاب ہو گئے تو یہ سیکولرزم کے لیے بڑے خطرہ کی بات ہوگی، حتی کہ ترکی کی عدالت عظمی نے عبداللہ گل کے اسلامی پس منظر کی وجہ سے صدارتی انتخاب میں ان کی شرکت پر پابندی لگا دی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ دوسروں کے داخلی معاملات میں کس طرح مداخلت کرتا ہے، دوسرے یہ کہ یورپ سیکولرزم کا متضاد تصور رکھتا ہے، اس کے یہاں سیکولرزم کے دو پیمانے ہیں، ایک یورپ کے لیے اور ایک عالم اسلام کے لیے، یورپ میں دینی پس منظر رکھنے والے حکومت کے اعلی مناصب پر فائز ہو سکتے ہیں، کلیسا سے وابستگی اور مذہبی تقریبات میں علانیہ شرکت کوئی قابل اعتراض بات نہیں، بلکہ سیکولرزم اور جمہوریت کے دعوے کے باوجود مغربی حکام اور رہنما دینی تنظیموں اور اداروں سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس وابستگی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، فرانس اس کی تازہ مثال ہے، فرانس کے صدارتی الیکشن میں قدامت پسند نکولس سرکوزی کامیاب ہوئے ہیں جو کٹر عیسائی ہیں اور کلیسا اور مذہبی عیسائی اداروں اور تنظیموں سے گہرا ربط رکھتے ہیں، انہوں نے اپنے صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران ترکی کے یورپی یونین میں شرکت کی سخت مخالفت کی تھی، عربی اخبار ''الشرق الأوسط'' (۸/۵/۲۰۰۷ء) نے فرانس کے صدارتی الیکشن میں سرکوزی کی کامیابی کے اعلان پر یورپی ذرائع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

اب ترکی کے لیے یورپی یونین کا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔

سرکوزی نے تارکین وطن جو زیادہ تر الجزائر، تونس اور مراکش کے ہیں، ان کے خلاف قانون بنانے کی بھی بات کہی تھی، لیکن عالمی میڈیا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، جب کہ یہ انقلاب فرانس کے اصول و مبادی کے خلاف ہے، اور ان کے انتخاب کے بعد فرانس میں ان کے خلاف پر تشدد احتجاج ہوا، جرمنی کی چانسلر انجیلا مارکل کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے، ان کے انتخاب میں شدت پسند عیسائی تنظیموں کا ہاتھ ہے، امریکی صدر بش اور سابقہ صدور کی عیسائی مشنریز سے دلچسپی اور وزرائے خارجہ کے تعاون کی خبریں اخباروں میں آتی رہتی ہیں۔

لیکن جب کسی مسلم ملک میں کوئی اسلامی پس منظر رکھنے والا حکومت کے اعلی منصب پر فائز ہوتا ہے یا اس کا امیدوار ہوتا ہے تو یورپ سیکولرزم کا راگ الاپنے لگتا ہے، نجم الدین اربکان اس کی روشن مثال ہیں، مسلم ممالک کے دورہ اور افطار پارٹی میں شرکت ان کے لیے سیکولرزم کی خلاف ورزی قرار دی گئی، ان کی پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کی گئی، الجیریا کی بھی یہی صورت حال ہے، جہاں انتخاب کے بعد اسلامی ذہن رکھنے والوں کی کامیابی کے بعد انتخاب کالعدم کر دیا گیا، جس کی وجہ سے مسلسل خونریزی ہو رہی ہے، مصر کی صورت حال بھی ملتی جلتی ہے، وہاں اسلامی پس منظر رکھنے والی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لینے کے حق سے محروم ہیں، عالمی میڈیا انہی سیکولر ملکوں میں مشنری سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، یورپ کی طرح اور بھی سیکولر ممالک ہیں جہاں مذہبی پس منظر رکھنے والی پارٹیاں الیکشن میں شرکت کرتی ہیں اور ملک کے اعلی عہدوں پر متمکن ہوتی ہیں، ہندوستان بھی ایک سیکولر ملک ہے، یہاں وہ تمام پارٹیاں الیکشن میں شرکت کرتی ہیں جن کی دین سے وابستگی اور اپنی قومی تہذیب سے دلچسپی کسی پر مخفی نہیں ہے، اور انتخاب

میں کامیابی پر ملک میں حکومت کرتی ہیں اور اکثریتی فرقہ کے عقیدہ کے اعتبار سے کارروائی کرتی ہیں، جو اقلیتوں کے عقیدہ سے متعارض ہوتی ہے، اور وزراء حتی کہ وزیر اعظم بھی مذہبی تقریبات میں شرکت کرتا ہے لیکن مغربی میڈیا کو اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا، یہی نہیں بلکہ ایسی پارٹی بھی الیکشن میں حصہ لے سکتی ہے اور حکومت کر سکتی ہے جو ملک کو ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا اعلان بھی کرتی رہتی ہے، اس ذہن سے نصاب تعلیم میں ایسا مواد شامل کیا گیا ہے جو صرف ہندو مذہب کی ترجمانی کرتا ہے، ان سب باتوں کے باوجود ہندوستان کو ایک سیکولر اور جمہوری ملک کہا جاتا ہے، اور عالمی میڈیا کو مذہبی پس منظر رکھنے والی پارٹی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

یورپ کے اس دوہرے رویہ سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ منصوبہ بند طریقہ پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ عالم اسلام میں اسلام سے وابستگی ختم کرنا چاہتا ہے، سب سے پہلے مصطفیٰ کمال اتاترک نے یورپ کے اس منصوبہ کو اختیار کیا اور ترکی میں اسلام مخالف سیکولرزم کو نافذ کیا، بلکہ مغرب کی کورانہ تقلید کی، یہی سوچ عالم عربی کے بعض مفکرین کی بھی تھی، جو اس رجحان کے حامی تھے، مغرب سے متاثر ہونے والوں نے علی الاعلان مغرب کی خوشہ چینی کی دعوت دی، صرف علوم وفنون ہی میں نہیں بلکہ تمدن وثقافت، رہن سہن اور طور طریق یہاں تک کہ خورد ونوش اور لباس وپوشاک تک میں ان کی کامل پیروی کی مہم چلائی، اس تقلید کو آسان بنانے کے لیے باقاعدہ قانون کو ہاتھ میں لے کر سخت کارروائیاں کی گئیں، نصاب تعلیم اور طریقِ تربیت میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے مقصد کی برآوری کی گئی، اس اندھی تقلید کے علمبرداروں میں سرفہرست ''ڈاکٹر طٰہٰ حسین'' نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی فرانسیسی تحریروں میں لکھا ہے:۔

''ہم نے یورپ کے سامنے اس کا عہد کیا ہے کہ ہم نظام حکومت میں اس

کی پیروی کریں گے، انتظامی امور میں اس کے طریقہ فکر کو ترجیح دیں گے اور قانون سازی میں اس کی روش ہمارے لئے آئڈیل اور نمونہ ہوگی، ۱۹۳۶ء کا معاہدہ آزادی اور ۱۹۳۸ء کا اختتام رعایات کا معاہدہ، اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ دنیا کے سامنے صاف طور پر اس بات کا عہد کیا گیا کہ ہم حکومت ومملکت، انتظامی امور اور قانون وتشریع میں یورپ کی پیروی کریں گے۔

یورپ نے دین کو ایک شخصی معاملہ قرار دیا اور حکومت اور سماج سے اس کا رشتہ منقطع کردیا، لیکن مسلم ملکوں میں اس کے شخصی معاملہ بننے پر اس کو اعتراض ہے، اور سیکولرزم کو اس نے ذاتی زندگی، معاشرے اور سماج سے اسلام کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کا ذریعہ بنایا، جسے سیاسی بازیگر اور شعبدہ باز قسم کے افراد وقتاً فوقتاً چلاتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم اکثریت اپنی اکثریت کے حقوق سے محروم ہوگئی، غیر مسلم عناصر کی اعلیٰ مناصب تک رسائی ہونے لگی، دلوں پر ان کے نقوش واثرات قائم ہونے لگے، انھیں افکار ونظریات کو فروغ دینے کا بہترین موقع ہاتھ آیا، اسی طرح مغربی افکار ونظریات برگ وبار لانے لگے، اسلام دشمن کتابیں چاروں طرف عام ہونے لگیں، تعلیم گاہوں اور درسگاہوں تک ان کی رسائی ہونے لگی، کالجز اور یونیورسٹیز میں بڑے بڑے عہدے ان ہی اسلام دشمن عناصر کے سپرد کیے جانے لگے اور اسلام اپنے ہی گھر میں غیروں کی طعن وتشنیع اور حملوں کا شکار ہوگیا اور حکومت نے روشن خیالی اور آزادیٔ رائے کے نام پر ان لوگوں کی حمایت اور پشت پناہی شروع کردی، بعض روشن اور پاکیزہ تاریخ کے حامل ممالک بھی سیکولرزم کے اس منفی تصور پر اسلام دشمن سیاست اور پالیسی اختیار کرتے ہیں، جیسے ترکی، مصر، شام، عراق اور الجزائر وغیرہ جو مغربی سامراج کے تابع تھے اور اس کے منصوبوں کی تکمیل کررہے تھے اور اب بھی اس پالیسی پر قائم ہیں۔

عالم اسلام میں سیکولرزم ہی کو نظام حکومت ،نصاب تعلیم، ذرائع ابلاغ اور تہذیب وثقافت کے لیے بطور اصول کے مان لیا گیا اوران ممالک کے دستور سے اسلام کی بنیادی قانونی حیثیت کوختم کردیا گیااور سیکولرزم ہی حکومت کا خاص شعار قرار پایا، پھراس طرح ملحدانہ افکار ونظریات اور یورپی تہذیب وتمدن کے دروازے کھل گئے، مادیت اوراباحیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، سیکولرزم کی بنیادوں پر قائم ہونے والی حکومت ان اسلام دشمن شعلوں کواور ہوا دینے لگیں، دینی رجحانات وخیالات کے حامل افراد پر پابندیاں عائد کردی گئیں، اثر ورسوخ کی جگہوں سے ان کو بے دخل کردیا گیا اور ان تمام تحریکات اور پارٹیوں پر جن کے اندر دینی اسپرٹ پائی جاتی تھی، پابندی عائد کردی گئی اور الیکشنوں میں شرکت کا راستہ ان کے لیے بند کردیا گیا، اس طرح ان کے لیے سیاست وحکومت کے اندر اثر ورسوخ قائم کرنے، پارلیمنٹ تک پہنچنے یا دوسرے اجتماعی ادارے اورانجمنیں قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی، اور سیکولر حکومتوں نے ہر اس اقدام اورعمل کا جس پر دینی رنگ نمایاں ہوتا، امداد وتعاون کرنا چھوڑ دیا اوردین ومذہب کے خلاف چلنے والی سرگرمیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا، اس مدت میں عالم اسلام کے اندر ہر طرح کی اسلام دشمن تصنیفات ومقالات اور تبصرے پھیلا دیئے گئے، جن کو مستشرقین اوران کے مغرب پسند تلامذہ نے تیار کیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں اسلام، قرآن وحدیث اور فقہ اسلام کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے، ان مصادر کے سلسلہ میں یہ آواز بڑے زور وشور سے اٹھائی جانے لگی کہ آیا یہ اس زمانے کے لیے موزوں اورمناسب بھی ہیں، کیا یہ زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اسلامی شخصیات اوراسلامی مقدسات پر کیچڑ اچھالا جانے لگا اور یہ تمام حرکتیں آزادیٔ رائے وعقیدہ کی آڑ میں کی جارہی تھیں۔

عجیب وغریب معمہ ہے کہ یہی سیکولرزم یورپی ممالک اور دیگر سیکولر اور جمہوری ممالک میں جس میں ہندوستان بھی ہے دین ودنیا کے مابین مصالحت اور رواداری کا رویہ اختیار کرتا ہے، چنانچہ وہاں دین اور سیکولرزم نظام کے درمیان، دین اور علم وسیاست کے مابین کسی قسم کی کوئی کشمکش نہیں ہوتی، بلکہ دینی ادارے پوری آزادی کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، اپنی سرگرمیوں کا بلا جھجھک مظاہرہ کرتے ہیں، اور اپنے دینی مقاصد کے ساتھ حکومت تک پہنچنے کے لیے بھرپور کوششیں کرتے ہیں، یورپ میں کلیسائی نظام ہمہ گیر سرگرمیوں کا مظاہرہ کررہا ہے، تمام اداروں میں اس کا وجود نمایاں نظر آرہا ہے، اس کی سرگرمیوں کو سیاسی لیڈران اور رہنمایان ملک وقوم کی پشت پناہی حاصل ہے، دین کے نام پر ہر طرح کے مادی وسائل ان کے لیے مہیا کیے جارہے ہیں، یورپین حکومتوں کے زیر نگرانی جگہ جگہ مسیحی تبلیغ واشاعت کے مراکز قائم کیے جارہے ہیں، دنیا کے مختلف گوشوں میں لاکھوں کی تعداد میں راہب اور راہبات تبلیغ کی خاطر بھیجے جارہے ہیں، یورپی حکمرانوں کی یہ تمنا اور خواہش اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے کہ وہ مسیحیت کو عام کرنے اور دوسرے ادیان ومذاہب کو بے نام ونشان کردینے کے درپے ہیں، اور آئے دن اس طرح کی رپورٹیں اور خبریں آرہی ہیں کہ غریب مسلم ممالک کو مسیحی ممالک میں تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش چل رہی ہے، عیسائی نشر واشاعت کی ایجنسیاں اسلام اور دیگر مذاہب کے خلاف کتابیں شائع کرنے میں مصروف ہیں، اخبار ورسائل کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت پھیلائی جارہی ہے، اور ہر طرح کے سرپھرے، سرکش اور شوریدہ بخت لوگوں کو عالم اسلام کا ہیرو اور لیڈر بنایا جارہا ہے جن کا نہ جانے کس کس طرح سے اعزاز واکرام کیا جاتا ہے، اور پھر ان کی زندگی اور آرام وراحت کے تمام اسباب بہم پہنچائے جاتے ہیں، تجارتی کمپنیاں مسلمانوں کے عقائد ونظریات کو چوٹ

کسنے والے اوران کے احساسات وجذبات کومجروح کرنے والے سامان تیار کرتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کواپنی دینی تعلیمات پرعمل کرنے سے روکا جارہاہے، اور انہیں اپنی ملی اور دینی قدروں سے منع کیا جارہاہے، دینی مدارس بند کیے جارہے ہیں، مساجد پرسخت سیکورٹی لگائی جارہی ہے، اسلامی تشخص کومٹایا جارہاہے، بعض ممالک میں آذان تک پربھی پابندی لگادی گئی ہے، اوراسلام پسندوں اوراسلامی رجحان رکھنے والوں پرسخت نظر رکھی جارہی ہے، البانیہ میں جومسلم اکثریت کا ملک ہے، کمیونز کے عہید میں الحاد لازمی تھا، کمیونزم ختم ہونے کے بعد اسے عیسائی ملک میں تبدیل کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، جگہ جگہ کلیسا کی تعمیر ہورہی ہے، صلیب شاہراؤں پر نصب کی جارہی ہے، یہ سیکولرزم اور جمہوریت کا کھلا ہوا تضاد ہے۔

انسانیت کی بقاء ٹکراؤ میں نہیں، جوڑ میں ہے (☆)

مغربی مفکرین کے بقول ''تجدید وتبدیلی'' یورپی فکر کی اساس ہے اور یہی اس کی ترقی واقبال کا راز ہے، یورپ نے اپنے اس اصول ''تجدید وتبدیلی'' کو صرف سیاسی وقومی دائرہ ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ تغیر پذیر حالات کے مطابق سیاست میں تبدیلی کیساتھ ساتھ اس نے خالص دینی ومذہبی تعلیمات وکتب میں بھی تبدیلیاں کی ہیں، لیکن کئی صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے یورپ کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، بلکہ عداوت ودشمنی اور نفرت پر مبنی صلیبی رویہ ہی صدیوں سے چلا آرہا ہے، یورپ کی جدید نسل اپنے اسلاف کے اسی معاندانہ رویہ پر گامزن ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی قائل نہیں، یہ مغربی فکر کا کھلا ہوا تضاد ہے کہ خود یورپ بنیاد پرستی اور قدامت پرستی پر قائم ہے اور مسلمانوں پر قدامت پرستی اور جمود کا الزام عائد کرتا ہے۔

حالیہ دنوں میں بعض مسلم علماء نے ویٹیکن سٹی کو مذاکرات اور ڈائیلاگ کی دعوت دی، لیکن ویٹیکن نے یہ کہہ کر مذاکرات سے انکار کردیا کہ وہ ''قرآن کو ''نص الٰہی'' سمجھتے ہیں اور سنجیدگی وگہرائی سے اس پر بحث ومناقشہ نہیں کرتے''۔

ویٹیکن میں اسلامی امور کے ذمہ دار ''کارڈینال جان لویس توران'' نے فرانسیسی روزنامہ ''لاکروا'' کو انٹرویو میں کہا کہ مسلمان یہ بالکل پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص قرآن میں تبدیلی اور مناقشہ کی بات کرے، اس لیے ان کے نزدیک قرآن اللہ کا

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر فروری ۲۰۰۸ء۔

املاء کرایا ہوا کلام ہے، اور اس کے الفاظ بھی توقیفی یعنی منزل من اللہ ہیں'' انہوں نے مزید کہا کہ ''جب مسلمان قرآن کے تعلق سے اتنا جامد اور خشک عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کے ساتھ دین اسلام کے اصل موضوع پر بحث ومباحثہ کیونکر ہوسکتا ہے؟

بلکہ اکثر عیسائی علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ نصوص دینیہ خدا کے اشارہ اور مرضی کے مطابق انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں، اس لیے اس میں تبدیلی واصلاح اور حذف واضافہ کی گنجائش ہے''۔

بشمول عمرو خالد، زغلول نجار، محمد سلم عوا، مفتی مصر شیخ علی جمعہ، شیخ حمزہ یوسف ہانسن ۱۳۸ مسلم علماء نے مسیحی پادریوں کو دونوں مذہبوں کے درمیان مشترکہ عقائد مثلاً حب الٰہی اور احترام حقوق ہمسایہ کے موضوع پر مذاکرات اور گفت وشنید کی دعوت دی تھی، اور اس میں متنازع فیہ مسائل نہیں اٹھائے گئے تھے، لیکن اس پر بھی ویٹیکن کا جواب نفی میں تھا۔

ویٹی کن کے اس منفی رویہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک کلیسا اسلام ومسلمانوں کے تئیں اپنے قدیم صلیبی معاندانہ اور مخالفانہ اور ٹکراؤ پسند موقف میں تبدیلی نہیں لانا چاہتا، یورپین ممالک میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ جو استہزاء اور تمسخرانہ انداز اختیار کیا جارہا ہے اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو توہین آمیز سلوک اور ناروا الفاظ استعمال کئے جارہے ہیں، اس کا بین ثبوت ہے، خود پوپ بھی اس سے بری نہیں، وہ اسلام کے خلاف اس انسانیت سوز مہم میں پوری طرح شریک ہیں اور وقتاً فوقتاً اسلام اور پیغمبر انسانیت محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں اہانت آمیز بیان دیتے رہتے ہیں، گذشتہ ستمبر کو جوہانس برگ یونیورسٹی میں اپنے بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ اسلام تشدد پر مبنی ہے، عالم اسلام سے متعلق ان کا رویہ مغربی سامراج سے مختلف نہیں ہے۔

''توران'' نے مسلمانوں پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اسلامی حکومتیں عیسائیوں کو چرچ کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتی، جب کہ یورپ میں مسلمان پوری آزادی کے ساتھ مساجد تعمیر کر سکتے ہیں، توران کی بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ مسلمان یورپ میں کن سیاسی وسماجی بندشوں اور نت نئی مصیبتوں کا شکار ہیں اور مساجد ومدارس کی تعمیر میں انہیں کیسی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور نسلی تفریق وامتیاز کی بنا پر ان کے ساتھ کیسا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے، سوئٹزرلینڈ میں جسے غیر جانبدار ورواداری اور عدل وانصاف کا علمبردار خیال کیا جاتا ہے، متشدد عیسائی فرنٹ کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی نازیبا حرکت اس کی تازہ مثال ہے کہ دوران نماز جب کہ مسلمان اپنے مالک حقیقی کے سامنے سربسجود تھے، پیچھے کی طرف سے ان کی تصویر لی گئی اور ایک بینر پر جس پر جلی حروف میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ''فکروا برؤوسکم'' شائع کیا گیا۔

ہالینڈ میں مسلمانوں کیخلاف نفرت پیدا کرنے کی کوششیں نہایت شدومد کے ساتھ جاری ہیں، بعض متشدد عیسائی سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ تک کر رہی ہیں۔ اور اسلام اور مسلمانوں کی اہانت پر مبنی فلمیں شائع کی جارہی ہیں۔

ہالینڈ کی طرح آسٹریا کی بھی یہی صورت حال ہے کہ وہاں کی متشدد عیسائی سیاسی پارٹیاں حکومت سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ تعمیر مساجد پر پابندی عائد کی جائے، انہوں نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ آسٹریا میں اسلام کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے، ہالینڈ اور آسٹریا ہی پر کیا موقوف، فرانس، جرمنی اور یورپ کے بیشتر ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے یہی منفی رجحان پایا جاتا ہے، ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز اور دشمنانہ ومعاندانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے، اسلام مخالف تحریکیں اور تنظیمیں ہمہ وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہتی ہیں، ان تمام

غیر انسانی اور ظالمانہ کوششوں کا سبب درحقیقت کلیسا کا اسلام کے متعلق دشمنانہ رویہ ہی ہے۔

کلیسا کا یہ رویہ بھی کوئی نیا موقف نہیں، بلکہ وہ اپنے اسلاف کے قدیم روایتی روش پر آج تک عمل پیرا ہے، ارباب کلیسا نے کبھی اپنے اس منفی رویہ میں نظر ثانی کی ضرورت نہیں محسوس کی، بلکہ مغربی سامراج کی منشا کی مطابق عمل کر رہا ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یورپ میں ایسے روشن ضمیر اور دانشور بھی ہیں جو امن وامان اور پرامن بقائے باہم کے خواہاں ہیں اور جن کے مقاصد ومشن پر خودغرضی ونفس پرستی کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا، وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ارباب کلیسا اور سیاسی لیڈروں نے اسلام وعیسائیت کے درمیان جو خلیج اور دوری پیدا کردی ہے اس کو کم کیا جائے، اور سیاسی اغراض، رنگ ونسل، ذات پات کے بتوں کو پاش کر کے اخوت ومحبت کے مضبوط پل تعمیر کئے جائیں، اور مذہبی امتیازات کو یکلخت فراموش کردیا جائے۔

ہالینڈ کے وزیر اعظم ''بان بیٹر کانیڈ'' نے مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف سخت بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے یا جلاوطن کرنے کی دھمکی کسی قیمت پر برداشت نہیں کی جائے گی، انہوں نے جلاوطنی کا مطالبہ رد کردیا ہے اور یہ ہدایت دی ہے کہ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کو پورا تحفظ فراہم کیا جائے، ان کے ساتھ تعرض نہ کیا جائے، ہالینڈ کے وزیر اعظم نے مزید کہا کہ ''مسلمان دوسری قوموں کی طرح معاشرہ کے ایک فرد ہیں، انہیں پوری آزادی کے ساتھ پرامن بقائے باہم کے اصول پر عمل کرتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہئے، وہ خوب اطمینان وسکون کے ساتھ اپنے قومی ومذہبی شعائر پر عمل کریں، انہیں بالکل پریشان نہیں ہونا چاہئے، ان سے کبھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم اس ملک کے باشندے نہیں، اس لیے ملک خالی کردو، بلکہ نہایت رواداری اور انسانیت نوازی کے

ساتھ یہاں رہنے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے، مجھے وہ منظر بہت حسین لگتا ہے جب مسلمان اپنی مسجدوں سے نماز پڑھ کر نکلتے ہیں اور نہایت بشاشت وخندہ پیشانی کے ساتھ اپنے یہودی اور نصرانی بھائیوں سے بغل گیر ہوتے ہیں اور وہ سب بھائیوں کی طرح پیار ومحبت کی باتیں کرتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض، اوران کو جلاوطن کرنے کی باتیں بالکل نہ کی جائیں، بلکہ دوسرے تمام مذاہب کی طرح ان کے مذہب اوران کے دینی شعائر وتعلیمات کا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے''، انہوں نے مزید کہا کہ ''اصل خطرہ کی بات یہ نہیں کہ مسلمان اس ملک کے باشندے ہیں بلکہ سب سے بڑا خطرہ اور بھیانک سازش تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو جلاوطنی کی دھمکی دے کران کو ملک سے دور کردیا جائے''۔

رائٹس (متشدد مذہبی عیسائی) پارٹیوں کے جلاوطنی کے مطالبہ کو چیلنج کرنا ہالینڈی وزیراعظم کا یقیناً ایک جراتمندانہ اور قابل ستائش اقدام ہے۔

بعض یورپین ممالک میں مشرق ومغرب کے درمیان جوڑ اور مفاہمت کی کوششیں جاری ہیں، اسپین میں یورپ کی تنظیم امن واتحاد کے زیرنگرانی قرطبہ میں اسی تعلق سے ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی منعقد کی گئی جس میں یورپ کی ۳۰۰ نمائندہ شخصیات نے شرکت کی جن میں سرفہرست اسپینی وزیرخارجہ میغل انخیل موراتینوس ہیں۔

اس کانفرنس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ مہم میں ذرائع ابلاغ اور تربیتی وتعلیمی اداروں کے رول کا جائزہ لیا گیا، کانفرنس کے شرکاء نے اس کا اعتراف کیا کہ ۱۱ر ستمبر کے واقعہ سے مسلمانوں کی غلط شبیہ دنیا کے سامنے آئی ہے، اس سے اسلامی تعلیمات کے بارے میں منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں، ایسے واقعات سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر ابھرتی ہے۔

مشرق ومغرب کو جوڑنے کے لئے کی جانے والی کوششوں کی ایک کڑی

دو فرانسیسی رائٹروں کی مرتب کردہ تصنیف ''تہذیبوں کا امتزاج'' بھی ہے، اسے ایک فرانسیسی ادارہ نے شائع کیا ہے، اس کتاب میں صموئل ہنٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' کے برخلاف نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں، جوڑ، امتزاج اور ہم آہنگی ممکن ہے۔

اس کتاب کے مصنفین ''ایمانویل ٹوڈ'' اور یوسف کرباج نے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے جائزہ کی بنیاد پر کہا ہے کہ تہذیبوں میں باہم تصادم ہو ہی نہیں سکتا۔

ان کا کہنا ہے کہ ثقافتی وتہذیبی روایات کے تنوع سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے تصادم یا ٹکراؤ پیدا ہوگا، بلکہ یہ تو تاریخ انسانیت کے ذخیرہ میں اضافہ کی دلیل ہے۔

رپورٹوں اور تحقیقی جائزوں سے معلوم ہوتا ہیکہ یورپ میں دو قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں ایک ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' اور دوسرا ''تہذیبوں کا امتزاج'' کا۔

فی الواقع مشرق ومغرب کے درمیان جوڑ، قربت، مفاہمت اور تہذیبوں کے امتزاج وہم آہنگی کا نظریہ ایک مثبت وتعمیری تصور ہے، کیونکہ اس تصور سے انسانیت کی بقاء وسلامتی اور تہذیبی قدروں کا فروغ متوقع ہے، اس سے امن وامان، اخوت ومحبت اور ایثار ویکجہتی کی پژمردہ کلیوں میں جان پیدا ہوسکتی ہے، برخلاف اس کے اگر کشمکش وتصادم کی ذہنیت کو بڑھنے اور غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا تو انسانیت باہم دست وگریباں گروہوں میں بٹ جائے گی، امن عالم کے پیش نظر ہر شخص کی کوشش ہونی چاہئے کہ ٹکراؤ کے بجائے تہذیبوں کے امتزاج اور مشرق ومغرب کے درمیان جوڑ ومفاہمت کے تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، کلیسا کے جامد اور روایتی رویہ سے ہرگز مایوس نہ ہونا چاہئے۔

ڈائیلاگ مساوی فریقین کی طرح ہو (☆)

باہمی مذاکرات، بین مذاہب مکالمہ اور پُرامن بات چیت مسائل کے حل کرنے ، جماعتوں ،قوموں اور حکومتوں کے اختلافات وتنازعات کا تصفیہ کرنے اور ملکوں کے درمیان مفاہمت و سمجھوتہ کرانے کا بہترین وسیلہ ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ مکالمہ اور مذاکرات کا حقیقی مقصد مفاہمت، اتفاق رائے اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنا ہو۔ ماضی اور حال میں مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعہ بہت سے ایسے مشکل اور پیچیدہ مسائل حل ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے بے گناہوں اور معصوموں کے خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں، مذاکرات کے ہی ذریعہ سخت ترین دشمن خونریزی اور قتل وغارت گری کے بعد ایک دوسرے کے دوست اور معاون ومددگار بن گئے، اس کی ایک مثال امریکہ اور چین کی ہے اور مصر واسرائیل کی ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کمیونسٹ چین اور امریکہ کے درمیان جو عرصۂ دراز سے محاذ آرائی اور مقابلہ آرائی (سرد جنگ) کے دور سے گذر رہے تھے انتہائی خفیہ اور رزادارانہ طریقہ سے گفتگو کے ذریعہ مفاہمت کی منزل تک پہونچے اور دونوں ملکوں کے درمیان تعاون اور اشتراک عمل کا سلسلہ شروع ہوگیا اور تعلقات استوار ہوگئے اور کمیونسٹ چین متحدہ اقوام کا ممبر بن گیا، مذاکرات اور بات چیت ہی کے ذریعہ ویتنام کا مسئلہ حل ہوا جو عرصہ دراز تک خونی جنگ کا سبب بنا ہوا تھا، آخر کار امریکہ نے مسئلہ کو پُرامن طریقہ پر حل کرنے اور جنگ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/جولائی ۲۰۰۸ء۔

عصر حاضر میں بہت سی متحارب طاقتوں نے مذاکرات اور پُر امن مکالمہ کے ذریعہ ظلم وتشدد اور کشت وخونریزی کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا، جب کوئی فریق کسی مسئلہ میں اپنے نظریہ پر ڈٹا رہتا ہے، خودسری وانانیت اور نخوت وپندار کا غلبہ ہوجاتا ہے تو پھر باہمی کشمکش اور شکوک وشبہات کا دور شروع ہوجاتا ہے، الزام تراشیاں اور ایک دوسرے کو ملزم گردانا شیوہ بن جاتا ہے ایک دوسرے سے بچنے اور چوکنا اور محتاط رہنے کی کوششوں میں تیزی آجاتی ہے اور دن بدن فریقین کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی جاتی ہے، شکوک وشبہات میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور دشمنی ونفرت میں شدت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس وقت مذاکرات اور مکالمہ کا طریقہ علاقائی یا بین الاقوامی مسائل حل کرنے اور اختلافات ونزاعات کا تصفیہ کرنے کا بہترین ونفع بخش طریقہ سمجھا جارہا ہے۔ چنانچہ مذاکرات، مفاہمت اور مشترکہ تعاون کی غرض سے بین الاقوامی اور عالمی پیمانہ پر اور ملکی اور علاقائی سطح پر کانفرنسیں منعقد ہورہی ہیں، ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال کا نظم کیا جارہا ہے اور سیاسی قائدین ایک ملک سے دوسرے ملک کا دورہ کررہے ہیں، ان ملاقاتوں، دوروں اور نظریات وافکار کے تبادلہ کی وجہ سے مختلف ملکوں کے درمیان اختلافات، کشمکش، ٹکراؤ میں کمی آرہی ہے، دوریاں ختم ہورہی ہیں اور تعاون کی فضا قائم ہورہی ہے، حالانکہ ان کی پالیساں ایک دوسرے سے مختلف، سیاسی اور اقتصادی حکمت عملیاں اور مکاتب فکر مختلف، طریقہ کار مختلف، سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ الگ الگ، فکری نظریات مختلف اور قومی اور ملکی مصالح ایک دوسرے سے متعارض ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود مذاکرات اور لیڈروں اور قائدین کی ملاقاتوں اور دوروں کی وجہ سے زندگی کے مختلف میدانوں میں اشتراک عمل کی راہیں ہموار ہورہی ہیں اور مشترکہ تعاون کے دروازے کھل رہے ہیں۔ اشتراک عمل اور باہمی تعاون وامداد موجودہ زندگی کا شعار بن

گیا ہے، پوری دنیا ایک بستی میں تبدیل ہوگئی ہے اور جو تجارتی و صنعتی پابندیاں ورکاوٹیں حائل تھیں دور ہوگئی ہیں۔ ایکسپورٹ، امپورٹ اور برآمدات ودرآمدات کی پابندیاں ختم ہورہی ہیں۔ افکار ونظریات کا تبادلہ ہورہا ہے۔ بہت سے ملکوں میں آمدورفت کے قوانین میں نرمی آرہی ہے، یورپ اور امریکہ کے متعدد ملکوں میں جہاں پہلے خانہ جنگی اور آپسی عداوت کی فضا تھی اور طویل جنگوں کا سلسلہ جاری رہا تھا، اب مفاہمت کی فضا قائم ہے سفر، تجارت میں تعاون کا ماحول ہے۔

گویا کہ پوری دنیا میں فروعی یا علاقائی اختلافات کے ساتھ ایک ہی نظام رائج ہے اور جزوی اختلافات کے ساتھ ساتھ مشرق ومغرب میں ایک ہی تہذیب وتمدن کا دور دورہ ہے، اگر کوئی شخص ایک ملک سے دوسرے ملک کا دورہ کرے تو اسے ترقی پذیر معاشروں کی زندگی اور معیشت میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا، اس تہذیب وتمدن کے اثر سے وہ پسماندہ وطبقات بھی محفوظ نہیں ہیں جن کے افراد وسائل کی کم مائیگی کے باوجود اس ترقی پذیر تہذیب وتمدن کے لوازمات کا اہتمام کرتے ہیں، اب تہذیبوں اور ثقافتوں کے ٹکراؤ کا نظریہ جسے ایک مغربی مفکر ہنٹنگٹن نے پیش کیا تھا۔ اور جو موضوع بحث بنا رہا، موہوم ہوگیا ہے چنانچہ موجودہ زندگی کی جو صورت حال ہے اس میں اس ٹکراؤ کا وجود نہیں ہے، تجارتی اور صنعتی معاہدوں سے جن کی بنیاد پر ایک ملک کی مصنوعات وپیداوار کو دوسرے ملک میں آسانی اور آزادی کے ساتھ منتقل کرسکتے ہیں، اس ٹکراؤ کی مسافت کم ہوگئی ہے اور صارفین اپنی ضروریات، تقاضوں اور پسند کے مطابق عمدہ سے عمدہ اور بہتر سے بہتر اشیاء آزادی کے ساتھ اختیار کرسکتے ہیں، ان پر کسی طرح کی پابندیاں عائد نہیں ہوسکتیں، اسی طرح ایک عالمی نظام کے وجود کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہورہا ہے صرف دیوار برلن نہیں گری ہے بلکہ مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے درمیان قائم دیواریں منہدم ہورہی ہیں۔ سیاسیات، اقتصادیات اور

تجارت وصنعت میں یہ تعاون اور یہ آزادی اور سہولتیں بھی باہمی مذاکرات، بات چیت، نظریات وافکار کے تبادلہ اور موجودہ انسانی سوسائٹی کی متعدد یونٹوں میں سمجھوتہ اور اتفاق رائے کا نتیجہ ہیں۔

اس سمجھوتہ ومفاہمت کی بنیاد پر دوسرے میدانوں میں اختلافات کی خلیج کو پاٹا جاسکتا ہے جہاں آج کشمکش جاری ہے جو انسانیت کے انجام کار کے لئے خطرہ ہے۔

وہ میدان جہاں آج مفاہمت، اتفاق رائے اور یکجہتی کی ضرورت ہے، جہاں آج بغض وکینہ حسد ونفرت اور دشمنی ختم کرنے کی ضرورت ہے اور جس میدان میں انسانی طاقتیں اپنی توانائیاں ضائع کررہی ہیں اور جس کی وجہ سے حکومتوں، ملکوں، قوموں، طبقوں اور جماعتوں کے مابین رسا کشی اور کشمکش جاری ہے وہ مذہبی، دینی عقائد کا میدان ہے، ان عقائد کی طرف دعوت دینے کی آزادی کا مسئلہ ہے، دینی ومذہبی تعلیمات پر عمل کرنے، اپنانے اور برتنے کا مسئلہ ہے، حالانکہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں اس کی صراحت ہے اور اس آزادی کی عالمی معاشرہ کو بھی ضرورت ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔

آج کی دنیا ڈائیلاگ اور مکالمہ پر یقین رکھتی ہے، مسائل کو مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے پر بھروسہ کرتی ہے اور عصر حاضر میں بہت سے مشکل اور پیچیدہ مسائل حل کرلئے گئے ہیں اور متعدد میدانوں میں ٹکراؤ اور کشمکش کے عناصر کا خاتمہ کردیا گیا ہے، لیکن صلیبی یورپ نے اسلام کے خلاف جو جنگ شروع کی تھی وہ آج بھی اسی طرح جاری ہے، بلکہ اس میں اور زیادہ شدت اور تیزی آگئی ہے، صرف یہی نہیں کہ یورپ اسلام کے خلاف جنگ کررہا ہے اور اپنے دائرہ اثر میں سمجھوتے اور دوریاں ختم کرکے نزدیکیاں پیدا کرنے والے طریقوں پر عمل نہیں کررہا ہے، بلکہ سیاسی اور اقتصادی مصالح کی خاطر جو ممالک اس کے زیر اثر ہیں ان سب کو اسلام کے خلاف جنگ پر اکساتا رہتا ہے جو یورپ

کی نظر میں دہشت گردی کا مذہب ہے، اوران سب کو اس بات پر آمادہ کر رہا ہے کہ اس کے تصور کے مطابق جو دہشت گردی کے اڈے ہیں، خاص طور پر دینی مدارس حتی کہ اسلامی اقتصادی پروجیکٹوں اور منصوبوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا جائے، افغانستان اور عراق اس کی واضح دلیل ہیں، حتی کہ زکوٰۃ جمع کرنے اور اس کو تقسیم کرنے کو دقیانوسیت اور قدامت پسندی کا عمل سمجھا جا رہا ہے اور دہشت گردی کا ایک عنصر گردانا جا رہا ہے اور یہود ونصاریٰ جن میں شدید عداوت اور نفرت تھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد و متفق ہو گئے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے جو امدادی پروگرام اور منصوبے ہیں مثلاً یتیموں کی پرورش ونگہداشت، فقراء اور محتاجوں کی مدد اور بچوں کو اسلام کی تعلیم دینے جیسے اسلامی پروگرام بھی امریکہ اور اس کے دباؤ میں آنے والے یورپین ممالک کے سربراہوں اور لیڈروں کی نظر میں دہشت گردانہ عمل ہیں۔

اس جنگ کا دائرہ اثر اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ مسلم اکثریت والے ہر اس ملک کا عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے جہاں اسلامی شریعت کے نفاذ و تطبیق کی کوششیں کی جاتی ہیں، اور اس کے زندگی کے خاص نظریہ کو اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ قرآن وحدیث اور علوم اسلامیہ کے خلاف عرصہ دراز سے علمی جنگ جاری ہے ذرائع ابلاغ، نشریات واطلاعات اور اشاعتی اداروں کے ذریعہ تحریف و تضلیل اور دجالیت کی کوششیں جاری ہیں اور ایسی کتابیں، خبریں اور رپورٹیں شائع ہو رہی ہیں جن سے مسلمانوں میں ردعمل پیدا ہو، ان کا مقصد مسلمانوں میں اشتعال پیدا کرنا ہے، اس فضا میں مسلمان ہر ملک میں صلیبی جنگ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو کہ کئی صدیوں سے رُکی نہیں ہے۔

بلاشبہ اس موقف میں جس پر صدیاں گذر گئیں اور جس سے یورپ کو کچھ فائدہ نہیں ہوا سوائے دشمنی کی فضا میں اضافہ کے، جیسا کہ ڈنمارک کے اہانت آمیز کارٹون

اور ہالینڈ کی فلم ''فتنہ'' ہے جس کی تائید سارے یورپین ممالک نے کی اور عدالت نے بھی اس کو جائز قرار دیا، سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین اور ہالینڈ کی ایک مرتد خاتون کی سرپرستی ہے، اس سے طبعی طور پر مسلم نوجوانوں میں یورپ مخالف جوش وجذبہ پیدا ہوگیا ہے، انصاف پسند حلقوں میں اس سے اسلام کی طرف ایک مظلوم مذہب کی حیثیت سے رجحان ومیلان میں اضافہ ہوا، یورپ کے انصاف پسندوں یا جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا انہوں نے اس موقف پر نکیر کی، ضرورت ہے کہ اس موقف پر نظر ثانی کی جائے، اور دوسرے میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مذاکرات اور باہمی گفتگو اور مکالمہ کے طریقہ کو اپنانے کی کوشش کی جائے، لیکن اس کے لئے شرط اولین یہ ہے کہ یورپ ظلم وتشدد اور جنگ سے باز آئے اور مذاکرات مساوی فریقین کی طرح ہوں۔

آج کل یورپ کے بعض قائدین مسلمانوں کے ساتھ ڈائیلاگ اور مکالمہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کئی ملکوں میں مذاکرات اور گفت وشنید کے کئی دور بھی ہو چکے ہیں جن میں مسلم دانشوروں اور یورپ کے نمائندوں نے شرکت کی ہے، لیکن یہ مذاکرات پہلے سے قائم جمود وتعطل اور سرد مہری پر کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ اس لئے کہ اسلام اور مسلمانوں کے معاندین جن کا اسلامی دہشت گردی کا سایہ پیچھا کر رہا ہے، وہ دنیا کو اس کے خطرے سے ڈرانے کے عمل پر قائم ہیں، اور اس میں عالمی میڈیا اہم رول ادا کر رہا ہے، اور یہ معاندانہ رویہ جو عالمی سیاست کی علامت بن گیا ہے۔

ڈائیلاگ کی دعوت ۱۹۷۷ء میں ایک فرانسیسی مؤلف روجیہ جارودی نے اپنے اسلام لانے سے پہلے دی تھی، لیکن مذاکرات اور مکالمہ کی دعوت اگرچہ اس زمانہ کے مزاج اور تقاضہ کے مطابق تھی جس میں مسائل حل کرنے کی دعوت دی گئی تھی مقبول نہ ہوسکی اس لئے کہ یورپ مسلمانوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ اسلام دشمنی، حسد اور کینہ یورپ کو وراثت میں ملا ہے اور یورپ اس ''ورثہ'' سے

دستبردار ہونا بھی نہیں چاہتا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپین لائبریریاں اسلام دشمن مورخین اور مؤلفین کی کتابوں سے بھری پڑی ہیں، اس نظریہ اور طرز فکر میں تبدیلی اس وقت ممکن ہوسکتی ہے جب کہ ان آلودہ انباروں کی صفائی کردی جائے، مذاکرات کی دعوت کے برعکس صموئیل ہنٹنگٹن کی ثقافتوں کے ٹکراؤ کی دعوت کی خوب پذیرائی ہوئی، چنانچہ یورپین اہل قلم نے اس پر خوب بحث کی کیونکہ یہ دعوت یورپ کے مزاج وفکر سے ہم آہنگ تھی اور اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں یورپ کا جو موقف ہے اس کے موافق تھی، یہ حقیقت ہے کہ یورپ ابھی تک اس صلیبی ذہنیت اور فکر سے آزاد نہیں ہوسکا ہے جو پوپ اور پادریوں نے گیارہویں صدی میں اس پر مسلط کردی تھی، بعض پادریوں کو اس ذہنیت کی کمزوری کا احساس ہو چلا ہے اور وہ مفاہمت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اسپین کے پادریوں کی ایک جماعت نے اسلامی ملکوں کا دورہ کرکے صلیبی جنگوں سے معذرت کی ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کی دعوت دی ہے، لیکن یہ جماعت ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندہ ہے، یورپ کی رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کررہی ہے۔

مذاکرات اور مفاہمت کی جو آوازیں اُٹھ رہی ہیں ان میں برطانیہ کے ولی عہد کی بھی آواز ہے، ولی عہد نے اسلام کے نظام عدل وانصاف اور مساوات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا! اس کو سمجھنے کے لئے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت زیادہ لکھا جاچکا ہے، اسی طرح برطانیہ کے آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر راؤن ولیمز جنہوں نے ابھی حال ہی میں برطانیہ کے دستور میں اسلامی شرعی قوانین کو سمونے کی بات کہی، نے مختلف مذاہب خصوصاً عیسائیت، اسلام اور یہودی مذہب کے درمیان ڈائیلاگ شروع کیا اور انٹرفیتھ کے حوالہ سے گزشتہ تین سال میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے، مغربی دنیا کے بعض لیڈروں

نے بھی مذاکرات اور ڈائیلاگ کی ضرورت پر زور دیا ہے اور دوسرے حلقوں سے بھی ڈائیلاگ، بین مذاہب مکالمہ، باہمی مفاہمت اور اتفاق رائے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں، حالیہ بین مذاہب مکالمہ مکہ کانفرنس کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جارہا ہے، جس کا اہتمام خادم الحرمین شریفین شاہ عبد اللہ بن عبد العزیز آل سعود نے کیا، اسی طرح آئندہ مہینہ میں مڈریڈ میں بین مذاہب عالمی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا ہے، اگرچہ ابھی ان آوازوں میں وسعت نہیں آئی ہے پھر بھی اسلام مخالف تحریکات ورجحانات کا مقابلہ کرنے کے راستے میں ایک ابتداء اور پہل ضرور ہے۔

حالیہ دنوں میں مختلف یورپین ممالک میں اسلام اور مسلمان کے متعلق غیر مسلموں (خصوصاً عیسائیوں، یہودیوں اور بت پرستوں) کی رائے معلوم کرنے کے لئے کرائے گئے سروے سے بھی اس رجحان کی تصدیق ہوتی ہے، سروے میں شریک ہونے والوں کی اکثریت مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت اور سمجھوتہ کے حق میں ہے، یہ رجحان اسپین میں سب سے زیادہ ہے جو ماضی میں فکر وفن اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا اور یہاں ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ جن کے فکر وفلسفہ اور علمی تجربات کی روشنی میں یورپ نے ترقی کی، چنانچہ اسپین میں جگہ جگہ اسلامی سنٹر اور مساجد قائم ہورہی ہیں اور مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے، جس سے متشدد عیسائی مذہبی وسیاسی قائدین خوفزدہ ہیں اور اس رجحان کو بدلنے کے لئے کوششیں اور سازشیں کررہے ہیں، اسپین میں آج بھی شاندار اسلامی عہد کی یادگاریں موجود ہیں، جن کو دیکھکر سیاح مسلمانوں کی عظمت اور فکر وفن کے میدان میں اسلام کے امتیاز وتفوق کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ رجحان سابق پوپ کے عہد میں شروع ہوگیا تھا، لیکن موجودہ پوپ بینڈیکٹ نے اس رجحان کو بدل دیا اور سامراجی طاقتوں کے اشارہ پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول دیا اور سامراجی فکر کے حامل مفکرین اور اسلام دشمن اہل قلم کی زہر آلود

تحریروں نے اسلاموفوبیا کی صورت حال پیدا کردی، چونکہ یورپ میں اسلام حیرت انگیز شکل میں پھیل رہا ہے اس لئے یورپ کے سیاسی حلقوں میں اسلام کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کو جاری رکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

اس سب کے باوجود یورپ میں مفاہمت، ڈائیلاگ اور پرامن بقائے باہم کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے، اور یورپ کی اکثریت اس کے حق میں ہے، لیکن اس رجحان میں قوت اور وسعت اس وقت ممکن ہوسکتی ہے جب کہ یورپ میں ایسے مراکز اور سنٹر قائم کئے جائیں جہاں صلیبی آلودگیوں سے عقل وذہن کو پاک وصاف کرکے اور موروثی حسد اور کینہ سے ہٹ کر اسلام کا حقیقی مطالعہ کیا جائے۔ جو لوگ اس کھلے اور صاف ذہن سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، اسلام ان کو اپنی طرف مائل کرلیتا ہے، نتیجۃً ان کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہوجاتا ہے کہ اسلام عدل وانصاف اور رحمت کا دین ہے اور اس مادی دور میں زندگی کی حقیقی خوشحالی، سعادت مندی اور اطمینان وچین وسکون کی نعمت صرف اسلامی تعلیمات ہی پر عمل کرکے حاصل ہوسکتی ہے۔ دعوت اور پرامن بقائے باہم کی حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس رجحان کو فروغ دیا جائے اور ڈائیلاگ اور مذاکرات کے ہی ذریعہ اسلام دشمن صورت حال سے نکلا جاسکتا ہے، یورپ کے سیاسی حلقوں کے ساتھ مسلم حکمراں، قائدین، دانشوروں اور داعیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ معاندانہ رویہ اور اشتعال انگیزی سے پرہیز کریں کیونکہ اشتعال انگیزی دشمنوں کو موقع فراہم کرتی ہے، ہالینڈ کے سیاسی رہنماؤں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فتنہ فلم کے سلسلہ میں مسلمانوں نے جذبات کے بجائے معقولیت کا رویہ اختیار کیا، اس سے صورت حال کو کنٹرول میں مدد ملی۔

اخلاقی قدروں سے خالی علم کے تباہ کن نتائج (☆)

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں علم کے حصول پر سب سے زیدہ زور دیا اور اس کو اپنی مذہبی تعلیمات میں شامل کر کے اہل علم کو ایک بڑا مقام عطا کیا ہے، لیکن اسلام نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا، علم نافع اور علم غیر نافع، آج کے دور میں اس علم نافع اور علم غیر نافع کا سب سے زیادہ تجربہ ہو رہا ہے، یہ دور علم کی ترقی اور علم کے رواج کا ہے، اس دور میں اہل علم کا تناسب ہر دور سے بڑھا ہوا ہے، آج تعلیم وتربیت کے مراکز گاؤں گاؤں قائم ہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ علم کے یہ مراکز مساوات کا درس دیتے، انسانیت کا سبق پڑھاتے، اخلاقی قدروں کو فروغ دیتے، مل جل کر رہنے کے آداب بتاتے، بھلائی اور خیر خواہی کے جذبہ کو عام کرتے اور سوسائٹی کی تعمیر وترقی میں اپنا رول نبھاتے، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ آج علم استحصال کے طریقے بتانے اور ذاتی فوائد حاصل کرنے کے گر سکھانے کا کام کر رہا ہے، اور یہی رجحان موجودہ دور کے انسان کی محرومی اور اس کی بدبختی کا سبب ہے، اسی وجہ سے انسان آپس میں جھگڑ رہا ہے، اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے، خاندان خاندان اور حکومت حکومت ٹکرا رہی ہے، اس کی وجہ مقاصد کا اختلاف اور اپنے مقاصد پر اصرار ہے، علم آج گمراہ کرنے کا وسیلہ بن گیا ہے، اب علم کے سایہ میں مکر وفریب کا جال بنا جاتا ہے اور علم کے مراکز خوف ودہشت کا ماحول پیدا کرتے ہیں، جو ممالک علم میں ترقی یافتہ ہیں وہیں انسانوں کو قتل کرنے کے مہلک

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اگست ۲۰۰۸ء۔

ہتھیار بنائے جاتے ہیں، وہیں علم کے ذریعہ ان مجرموں کے جرائم کو چھپانے اور بے قصوروں کو ملزم قرار دینے کا کام کیا جاتا ہے، یہ وہ حکومتیں ہیں جو علم میں ممتاز اور تہذیب وتمدن میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔

انہی ترقی یافتہ حکومتوں میں ایک حکومت اسرائیل کی ہے جو تعلیمی لحاظ سے دوسری قوموں سے بہت آگے ہے، لیکن اس نے دوسروں کے ملک پر قبضہ کیا ہے اور وہاں کے اصلی باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں اور وہاں کے شہریوں کو دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور اس کی تائید اور مدد وہی ملک کر رہے ہیں جو علم وتمدن میں دوسری قوموں سے برتر ہیں، اسرائیل بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اس کے اہل علم اور اہل قلم اور یورپ کے ممالک میں رہنے والے نوبل انعام یافتہ ان جرائم کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انہی حکومتوں میں سابق سوویت یونین کی مثال ہے جس نے افغانستان پر قبضہ کیا اور لاکھوں بے گناہ لوگوں کا قتل کیا اور لاکھوں کو جلاوطن کیا، پھر ان شہریوں کے حقوق سلب کیے اور ظلم واستبداد کے ذریعہ وہاں کے باشندوں کو دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور اپنے تصور کے مطابق زندگی کا فلسفہ اختیار کرنے پر زور دیا، دنیا کے ایک بڑے حصہ نے اس کے غلبہ کے زمانے میں ظلم سہے اور غلامی کی زندگی بسر کی اور اس فلسفہ سے متاثر لوگوں نے دوسروں کے عقائد پر حملے کیے، علم میں ترقی یافتہ حکومتیں عرصہ تک اپنے علم اور اپنی تہذیب وثقافت کی برتری کے دعوے الاپتی رہیں، اور پوری دنیا کو جاہل ثابت کرنے پر تلی اور پسماندہ قرار دینے پر مصر رہیں، انہوں نے قوانین بدلے اور جھوٹی تاریخ مرتب کی اور علاقائی تہذیبوں کو بگاڑنے کا کام انجام دیا اور اس پر اپنی زبان اور اپنی تہذیب اور اپنی فکر تھوپنے کی کوشش کی، اس نے فلسطین اور قبرص کے مسائل پیدا کیے اور نسلی بنیاد پر حکومتوں کی مدد کی اور دنیا کو اس دوراہے پر

لاکھڑا کیا جہاں صرف قتل وغارت گری ہے، برطانیہ کے مظالم کا اندازہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے لگایا جاسکتا ہے، ہندوستان کے ایک ممتاز مورخ امریش مشرا نے اپنی کتاب War of Civilisations the Road to Delhi India AD 1857 میں ثابت کیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے گیارہ ملین آدمیوں کو قتل کیا۔

علمی اور تمدنی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں جرمنی ہے، ہٹلر کے زمانہ میں انسانوں پر جو مظالم ہوئے، وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں، یہی حال ان ترقی یافتہ یورپی ملکوں کا ہے جنہوں نے دو عالمی جنگیں چھیڑیں جن میں ستر ملین لوگوں کی جانیں گئیں، جرمنی میں یہودیوں کو زندہ جلائے جانے کے واقعہ (ہولوکوسٹ) کا (حقیقت ہو یا افسانہ) انکار تو درکنار اس پر شک کرنا بھی ناقابل معافی جرم ہے، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو انجام کس نے دیا؟ کیا مسلمانوں نے جن پر دہشت گردی کا الزام ہے یا مشرقی باشندوں نے جن پر جہالت اور پسماندگی کا لیبل چسپاں ہے؟ جواب اس کا صرف ایک ہے کہ جلانے کا یہ واقعہ اگر حقیقت ہے تو یورپی تہذیب وثقافت کی نمائندہ قوم جرمن باشندوں کی سفاکی اور درندگی کا کھلا ثبوت ہے، اور اگر جھوٹ ہے تو مغربی دنیا کے جھوٹ پر متفق ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔

ان مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے نمایاں نام امریکہ کا ہے، جس نے جاپان میں بے قصور جاپانیوں پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا، سالوں اس نے ویتنام میں خون کی ہولی کھیلی اور نہتے ویتنامیوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو بھیڑیا بکری کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد بھی جب اس کی خون کی پیاس نہ بجھی تو افغانستان، عراق، فلسطین کا رخ کیا اور ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

ان ترقی یافتہ ملکوں میں ایک نام فرانس کا بھی ہے، جس نے الجزائر میں دس

لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا، دینی اور جتماعی قدروں کے خلاف باغیوں کی پوری ایک فوج تیار کر کے پوری دنیا میں اس کا جال بچھایا۔

یہ چند مثالیں تھیں ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن ملکوں کی، اگر ان مغربی ملکوں کی خونی داستانیں قلمبند کی جائیں اور ان کے ظلم اور ان کی سفا کی کے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ تحریر میں لائے جائیں تو جلدوں کی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

آج پوری دنیا اخلاقی قدروں سے خالی علم کے مراکز کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہے، اس کی دلیل وہ خونی وارادات ہیں جو دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں ہو رہتی ہیں، اسی طرح طلبہ اور اساتذہ کا تخریبی تنظیموں میں شامل ہونا ہے، یہ عام صورت حال ہے جس میں دنیا کا ہر ملک مبتلا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آئے دن دہشت گردانہ کارروائیوں کی خبریں آتی رہتی ہیں اور یورپ کے عالمی شہرت یافتہ علمی اداروں کے فارغین ان تخریبی اور دہشت گرادانہ کارروائیوں کی سرپرستی کر رہے ہیں، اخلاقی قدروں سے خالی علم موجودہ دور میں سب بڑا چیلنج ہے، اور انسان کی سلامتی کے لیے خطرہ بن گیا ہے کیونکہ موجودہ دور میں علم اخلاقی اور روحانی قدروں سے خالی ہے، یہ انسان کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت پر توجہ دیتا ہے اور قلب وروح کی نشو ونما، روحانی ارتقا، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت برتتا ہے، جس کی وجہ سے نئی نسل کی تربیت غیر متوازن اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے، اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن گئی ہے، اس کے ظاہر وباطن، عقل وروح، علم وعقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی ہے، موجودہ علم کو مفید اور تعمیری رخ پر لگانے کے لیے کچھ اخلاقی بندشوں کی ضرورت ہے، اس کی صحیح رہنمائی اور اس کو نور نبوت سے جوڑنے کی ضرورت ہے، بغیر اس کے موجودہ علم کے تباہ کن نتائج سے بچنا مشکل ہے، علم کو صالح اور تعمیری بنانے کے لئے تعلیمی

اداروں کے نصاب ونظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے، کیونکہ موجودہ نظام تعلیم میں اخلاق پر کوئی زور نہیں اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے، بعض ملکوں میں نصاب تعلیم سے اخلاقی ودینی قدروں کو نکال دیا گیا ہے، یہ اقدام آئندہ نسلوں کے لیے بڑا خطرہ ہے۔

اسلامی مفکر ڈاکٹر محمد المبارک مغربی تہذیب اور اس کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی نقص اور عیب سے پاک نہیں ہیں، بلکہ اس کے تشکیلی عناصر اور محرکات غیر اخلاقی ہیں، اس کا مزاج مادہ پرستانہ ہے، اس کی اساس ہی دین واخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے، اس کے خمیر میں لادینیت والحاد ہے، اس تہذیب کا شعار انسانیت کی تباہی اور نوع بشری کی ہلاکت ہے، اس کا پیشہ تجارت ہے، مغربی تہذیب کے ہوتے دنیا میں امن واطمینان، الفت ومحبت، تعاون وہمدردی اور بھائی چارگی ناممکن ہے، کیونکہ اس کے عنصر میں فساد اور بگاڑ ہے، تہذیب جدید ہر جائز وناجائز طریقہ سے مادی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل کی دعوت دیتی ہے، اس تہذیب کا نشانہ انسان کی اصلاح اور تعمیر نہیں ہے، تہذیب حاضر نے اگرچہ انسانی زندگی کے بعض گوشوں میں بہتری پیدا کی ہے، لیکن انسانی زندگی کے اہم اور بنیادی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، جس سے انسانی زندگی میں بے چینی اور اضطراب نظر آتا ہے، بے شمار علمی وسائنسی ترقیات وفتوحات اور صنعت وحرفت اور معیار زندگی کو بلند کرنے اور دنیاوی لذت اندوزی کے مختلف وسائل کی ایجاد کے باوجود تہذیب حاضر انسان کی صالح تعمیر سے عاجز ہے، یہ بلند معیار زندگی اور بڑھتے ہوئے مصارف تہذیب حاضر کی پیداوار ہیں جس نے بنی آدم کے دل سے حق کی روشنی چرالی ہے، انسانی معاشرہ میں میں بھائی چارگی، حق وانصاف کی

بالادستی اور انسانی واخلاقی قدروں پر تیشہ چلادیا ہے، تہذیب حاضر نے بھائی بھائی میں پھوٹ وانتشار، معاشرہ میں عداوت ونفرت، مکروفریب، دروغ گوئی، حرص وہوس، مفاد پرستی، خودغرضی، ظلم وزیادتی قتل وغارتگری، بغض وحسد، کینہ وعناد اور اخلاقی برائیاں عام کردی ہیں، مغربی تہذیب کی اساس نہایت کمزور اور نامستحکم ہے، اس کی بلوریں دیواریں حالات اور حوادث کے سنگین حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، یورپ کی سائنسی تحقیقات خود مغرب اور انسانیت کے لیے چیلنج بن گئی ہیں، تہذیب حاضر اپنے اندر بڑی چمک دمک رکھتی ہے اور اس کا شعلۂ حیات بہت روشن ہے، لیکن اس میں دلوں کی موت، احساس مروت اور انسانی شرف وعزت کی ہلاکت ہے، کیونکہ جو قوم آسمانی رہنمائی سے محروم ہوتی ہے، اس کے کمالات کی حد اور اس کا مبلغ علم برق وبخارات سے آگے نہیں ہوتا، بیکاری وتعطل، جمود وخمود، آرام طلبی ولذت کوشی، عریانی، مے نوشی، افلاس، مفاد پرستی، خودغرضی، جنسی انارکی، اخلاقی بے راہ روی، مال ودولت کی محبت اور بدعنوانیاں مغربی تہذیب کی سرفہرست فتوحات اور کارنامے ہیں" (الفکر الإسلامي الحديث في مواجهة الأفكار الغربية، ص: ۳۱-۳۲، از: ڈاکٹر محمد المبارک)۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "نقوش قبال"، ص: ۸۴ پر نئی نسل پر مغربی نظام تعلیم کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا ہے، اور وہ ایسی نسل کو تربیت نہیں دے سکا ہے کہ جو اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی، اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرکے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی، بلکہ اس کے برعکس افریقہ

اور قطب شمالی کی نامعلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات ونباتات سے آگاہ ہے، لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل، برق وبخارات، ایٹمی اور جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتہ اس نے لگایا، لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا ہے، دنیا کو مسخر کرلیا، لیکن اپنے اوپر قابو نہیں پاسکا، وہ ہوا میں اڑتا اور پانی پر تیرتا ہے، لیکن زمین پر انسان کی طرح چل نہیں سکتا، یہ سارا قصور نظام تعلیم کا ہے، جس نے اس کا توازن غلط اور مزاج کو فاسد کردیا ہے، جب لکڑی ٹیڑھی ہوگی تو سایہ سیدھا کیسے ہوسکتا ہے؟''۔

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ''یہ عجیب بات ہے کہ شعاع شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظام سیارگان کو جاننے والا کسی راہ عمل پر نہیں پہنچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکا:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

جب اسلام کی حقیقی تصویر سامنے آنی ہے (☆)

امریکہ اور یورپی ممالک کے شہریوں کے لیے اسلام کی تصویر دن بدن خوفناک اور ڈراؤنی بنتی جارہی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مستقل خوف و دہشت کی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ خوف و دہشت کی اس فضا میں اُس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب سیاسی و مذہبی رہنما ایک ساتھ مل کر اسلام کے متعلق نفرتیں پھیلاتے پھرتے ہیں اور پھر ان کے سُر میں سُر ملا کر قلم کار، فنکار اور اداکار بھی اسی سمت چل نکلتے ہیں اور اسلام کے متعلق بدگمانیوں اور نفرتوں کا بازار گرم رکھتے ہیں۔

امریکہ و یورپ کے یہی سیاسی رہنما ہیں جو کبھی کمیونزم کے سخت مخالف ہوا کرتے تھے، آج انہوں نے اپنی مخالفت اور عداوت کا رخ اسلام کی طرف کر دیا ہے، اس کی اصل وجہ ان کے دل و دماغ پر سوار یہ انجانا سا خوف ہے، جو ان کو رہ رہ کر تڑپاتا ہے کہ اسلام اپنی فطری صلاحیت اور قوت و تاثیر کی وجہ سے عالمی بساط پر گھنیرے بادلوں کی طرح چھاتا چلا جارہا ہے اور لوگوں کو مغالطے میں رکھنے کی ان کی تمام تدبیریں اور جعلسازیاں لغو اور بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔ مغربی تہذیب جس نے بہت سی قوموں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا، اس کا یہ سحر دھیرے دھیرے ٹوٹتا جارہا ہے اور وہ تمام شیریں و خوشنما اصطلاحیں جو انہوں نے اسلام کو بدنام کرنے کی خاطر گڑھ رکھی تھیں، اب ان کا زہریلا پن لوگوں پر ظاہر ہونے لگا ہے۔

(☆) ماہنامہ ذکری جدید، اگست ۲۰۰۸ء۔

امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی نے میری لانڈ (Maryland) میں امریکی نول اکیڈمی (Knole Academy) کے جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اس صدی میں ہمیں تین بیرونی حملوں کا سامنا رہا: نازی ازم، کمیونزم اور اسلامی بنیاد پرستی، ان میں سے دو کمیونزم اور نازی ازم تو ختم ہو گئے، مگر اسلامی بنیاد پرستی ابھی باقی ہے۔''

اسلام کے متعلق اس طرح کا معاندانہ موقف اختیار کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک محض سیاسی وجہ ہو سکتی ہے، تاہم دوسری خالص دینی و مذہبی وجہ ہے۔ موخر الذکر وجہ کی بنیاد یہ ہے کہ مذہبی رہنما کلیسا کے پیروکاروں میں غیر مذہبی رجحانات کے بڑھتے ہوئے اثرات سے پریشان ہیں، اس بات کی نشاندہی وہ بیانات اور اعداد و شمار کرتے ہیں جو اکثر و بیشتر اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر فیصد سے زائد لوگ چرچ نہیں جاتے۔ اسی طرح کی ایک رپورٹ ''کریسچین سائنس مانیٹر'' (Christan Scince Monitor) نے شائع کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''امریکہ کی کم و بیش آدھی آبادی اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ عیسائیت سے کنارہ کشی اختیار کرنے والے زیادہ تر کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ رپورٹ یہ خلاصہ بھی کرتی ہے کہ عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ جو صدیوں سے امریکہ کی مذہبی شناخت چلا آ رہا ہے بہت جلد ایک اقلیتی فرقے میں تبدیل ہو جائے گا۔ گزشتہ صدی میں اسّی کی دہائی تک یہ فرقہ امریکہ کی آبادی میں 65% فیصد کی شمولیت رکھتا تھا، لیکن ان دنوں اس کے ماننے والوں کی تعداد محض 51% فیصد ہی بچی ہے۔ اٹھارہ سے انتیس سال کے

نوجوانوں میں صرف 43% فیصد جوان خود کو پروٹسٹنٹ بتاتے ہیں۔ سروے رپورٹ نے نصرانی مذہب میں ارتداد کا گراف 3.7% فیصد بتایا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ نہایت ہی تعجب خیز بات ہے کہ رومن کیتھولک فرقے میں بھی ارتداد بڑے پیمانے پر پھیل رہا ہے۔ 31.4% فیصد نوجوان جو پیدائشی کیتھولک تھے 7.5% فیصدی ارتداد کی وجہ سے آج ان کی تعداد 23.9% ہی بچی ہے۔ سروے رپورٹ میں مزید یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر دسواں آدمی ایسا مل جاتا ہے جو کبھی کیتھولک رہ چکا تھا۔"

تعلیم یافتہ حضرات مسلسل اسلام کی طرف آرہے ہیں۔ وہ اسلام کا براہ راست مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے متاثر ہو جاتے ہیں، یا پھر ان مسلمانوں سے ربط و تعلق کے نتیجہ میں اسلام قبول کرتے ہیں جو صحیح معنی میں اسلام پر عمل پیرا ہیں، وہ اسلامی معاشرہ میں سعادت و نیک بختی اور اعتماد و یقین کی عام فضا دیکھ کر اسلام کو ہمیشہ کے لیے گلے لگا لیتے ہیں۔ یہاں ایک اور خبر ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

"کناڈا (Canada) کی راجدھانی اوٹاوا (Ottawa) میں کارلٹون یونیورسٹی (Carleton University) نے آنے والے موسم خزاں میں اسلامی مطالعات کے لیے خصوصی شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ لیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبہ کے اندر اسلام کے متعلق تجسس اور خواہش میں اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ نیز سیکولر یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کے مواد پر جس کا مطالعہ عنقریب مکمل ہونے والا ہے، مسلم اقلیت کی طرف سے قابل لحاظ پیمانے پر ردعمل سامنے آیا ہے، کچھ اس کی تائید کرتے ہیں جب کہ کچھ اس کے تعلق سے خائف ہیں۔ جیسا کہ کناڈا کے "اوٹاوا سٹیزن" (Ottawa Citizen) اخبار نے نقل کیا ہے کہ یہ فیصلہ طلبہ

کی مذہب میں دلچسپی بطور خاص اسلامی مذہب اور اس کے متعلق علوم وفنون میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر لیا گیا ہے، جبکہ اب سے دس سال قبل ایسا نہیں دیکھا گیا تھا''۔

قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کے اسی دینی انحراف نے صلیبی جنگوں کو جنم دیا تھا، جن کو پوپ اربن نے ہری جھنڈی دکھائی تھی۔ یہ صلیبی جنگیں لمبے عرصہ تک چلتی رہیں اور بہت بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی کا باعث بنیں، یہی وہ جنگیں ہیں جنہوں نے مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان دوریاں پیدا کیں اور نفرتوں کو جگہ دی۔ ان سے پیدا شدہ نفرتوں کے نتیجہ میں عیسائی مذہبی رہنماؤں نے صلیبی جنگوں کے بعد مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کیے اور علمی و تحقیقی وسائل کا سہارا لے کر مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کو بڑھاوا دیا۔

اس کے بعد مستشرقین کا دور آیا جنہوں نے خاص طور پر عالم اسلام کو اپنی تحقیق وریسرچ کا موضوع بنایا اور اسلام اور مسلمانوں پر طرح طرح کے الزامات لگائے، یہاں تک کہ انہیں جاہل، ظالم، کٹر پنتھی، تنگ نظر اور خبطی بھی بتایا، حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف تھی، مستشرقین خود مسلمان علماء اور ان کے شاگردوں کے حاشیہ بردار، خوشہ چیں اور طفیلی تھے۔ لیکن صلیبی جنگوں میں شکست خوردگی کا جنون اور حسد ان کے قلم پر چھایا رہا۔

تجربات بتاتے ہیں کہ یورپی عوام نہایت بھولے بھالے ہیں، وہ ہر بات پر بہت جلد اعتماد کر لیتے ہیں، اپنے سیاسی و مذہبی رہنماؤں پر جان چھڑکتے ہیں اور ان کے لیے ہر طرح کی تعظیم وتقدیس روا رکھتے ہیں۔ یہ بات اپنے آپ میں تکلیف دہ ہو یا نہ ہو، تاہم یہ بات ضرور پریشان کن ہے کہ ان کے رہنما ان کی سادہ لوحی کا ہر زمانے میں فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ چنانچہ جب چرچ اور سائنس میں افکار ونظریات کی

جنگ چھڑی ہوئی تھی، اس وقت چرچ کو اقتدار حاصل تھا، جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے سینکڑوں اہل علم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور سائنسی علوم سیکھنے والوں کو زندہ جلا ڈالا تھا، اس وقت بھی عوام نے چرچ کا ساتھ دیا تھا اور اس کی ہر بات کو من وعن قبول کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں پورے یورپ پر تاریکی چھائی رہی، یہاں تک کہ اس وقت کے بادشاہ اور قائدین بھی مذہبی رہنماؤں کے اشاروں پر ناچتے تھے اور ان کے ابروئے چشم کی ہر ایک جنبش پر نظر رکھتے تھے۔

اسی طرح پندرہویں صدی عیسوی میں جب علم کو عروج واستحکام حاصل ہوا تو اہلِ علم نے چرچ کی مخالفت کی، اس کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ بذات خود دین عیسوی کو ہی علم وتمدن کا دشمن سمجھنے لگے اور دین کو اپنی زندگی سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہا۔ اس وقت بھی یورپی عوام نے اس دین مخالف رجحان کو بڑی آسانی کے ساتھ قبول کیا۔

اور اسی طرح استعماریت (Imperialism) کے زمانے میں جس نے چرچ اور سیاست کے درمیان خلیج کو ختم کر کے دونوں کے مابین قربت پیدا کرنے کی دہائی دی اور استعماریت کے علمبردار چرچ کی مدد سے اقوام عالم پر اپنے افکار ورجحانات قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے، اور باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنے اور حکومت کے سیکولر ہونے کا دعویٰ کیا، بے قید آزادی کا اعلان کیا اور اباحیت پسندی اور مادی طرز حیات کو فروغ دیا، چرچ نے استعماری قوتوں کے خوف کی وجہ سے اپنے یہاں اس مادی سیلاب اور سیاسی جور واستبداد کا کوئی نوٹس نہیں لیا، حالانکہ یہ سب کچھ عیسائیت کے نظریات وتعلیمات کے خلاف تھا جو کہ رہبانیت میں یقین رکھتی تھی۔ اس وقت بھی یورپی عوام ان کے قائدین کے ذریعہ پھیلائے گئے مکر وفریب کے جال میں بآسانی پھنس گئے اور انہوں نے چرچ کے اس موقف پر بھی کچھ گرفت نہیں کی کہ اس نے

استعماری قوتوں کے ذریعہ اٹھائے گئے تباہ کن اقدامات پر تسامح، عفو و درگزر سے کام لیا، بلکہ ان کو اپنا تعاون بھی دیا، چرچ نے نہ صرف یہی کیا بلکہ وہ عظیم جنگوں کے دوران مجرمانہ خاموشی بھی اختیار کی۔ یہی وہ اہلِ کلیسا ہیں جو کبھی یہودیوں کے سب سے بڑے مخالف اور دشمن ہوا کرتے تھے، آج وہی ان کے سب سے بڑے دوست ہوا کرتے ہیں، حد یہ کہ پوپ نے یہودیوں کی براءت کا اعلان بھی کر دیا۔

مغربی عوام کی یہی سادہ لوحی اور تقلیدی ذہن ہے جو انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے قائدین کے اسلام اور مسلمان مخالف موقف کو بے چوں چراں قبول کر لیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہر اس بات کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں جو انہیں سیاسی و مذہبی قائدین کی طرف سے پہنچائی جاتی ہے۔ مغربی اقوام کی سادہ لوحی اور تقلیدی ذہن کی شہادت وہ لوگ بھی دیتے ہیں جنہیں مغربی ممالک میں رہنے کا موقع میسر آیا ہے اور وہ ان کے مزاج، افتادِ طبع اور ان کی علمی و فکری پہنچ کے متعلق کافی معلومات رکھتے ہیں، عراقی محقق ڈاکٹر عبدالمنعم الطائی لکھتے ہیں:

> ''اکثر امریکی یہ تک بھی نہیں جانتے کہ ایران اور عراق جو آٹھ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہے، عالمی نقشہ میں کہاں پر واقع ہیں، اسی طرح بوسنیا اور ہرزیگوینا جہاں صربیائی درندے تین سال تک معصوموں کا خون بہاتے رہے اور افغانستان جسے امریکہ نے خاک و خون میں ملا دیا اور اس سے پہلے روس نے جس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، کے متعلق انہیں کچھ نہیں معلوم کہ وہ دنیا کے کون سے خطہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علم و معرفت کا عالم یہ ہے کہ وہ دنیا کے دو بڑے براعظم ایشیا اور افریقہ کو یورپ کا حصہ سمجھتے رہے ہیں اور اس کے برعکس بہت سے یورپی ممالک کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ایشیا اور افریقہ میں آتے ہیں۔''

مغربی اقوام اپنی اسی سادہ لوحی اور کم علمی کی وجہ سے ہر طرح کے افکار و رجحانات کو من وعن قبول کر لیتے ہیں اور ہر طرح کے دلائل (Justification) پر بغیر کسی ردو قدح کے ایمان لے آتے ہیں۔ عراق جنگ کے معاملے میں اس کی عملی مثالیں سامنے آچکی ہیں، امریکی لیڈروں کی طرف سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ عراق کے پاس عام تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں جو ساری دنیا کے لیے خطرہ ہیں، لیکن عراق کی تباہی کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کے تمام دعوے اور دلائل محض جھوٹ کا پلندہ تھے۔

آج اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط پروپیگنڈے کے نتیجہ میں مغربی اقوام خوف و دہشت کی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ اور یہ سب ان کے رہنماؤں کی کارستانیاں ہیں کہ وہ ان کو خوف و دہشت کی نفسیات میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں پھر وہی جن بوتل سے باہر نہ آجائے جو صدیوں تک ان کا پیچھا کرتا رہا تھا، اور تاریخی سلطنتِ روم کو لرزہ براندم کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں اہل یورپ کو اور اس کی افسانوی عظمت پر ایمان رکھنے والوں کو ایک بار پھر اسلام کی دعوت دینا یقینی طور پر اس دعوت کے مترادف ہے جو ان کو کسی بھیانک انجام سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ ایک طرح سے یورپین اقوام کو اُس زمانے کی طرف لوٹا دینے کی دعوت ہے جس میں یورپ محمد الفاتح اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ جنگی کشمکش سے گزر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی لیڈر، مفکر اور قلم کار اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ''دعوت'' کے لفظ کا زیادہ چرچا نہ ہو جو ان کے لیے اضطراب اور بے چینی کا باعث ہے اور اس بھوت کے بوتل سے باہر آنے کے تمام راستے مسدود کر دیے جائیں جو اگر بیدار ہو جائے اور حرکت میں آجائے تو تاریخ کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اسلام کے مخلص داعی طویل عرصہ تک مشرقی اور مغربی یورپ (جو اسلام دشمنی

میں ایک دوسرے کے شریک کار اور ہم نوا ہیں) کے اس معاندانہ اور مخالفانہ رویہ کا سامنا کرتے رہے ہیں اور یورپی اقوام ہمیشہ سے دجل وفریب اور مغالطہ آمیز فضا میں سانس لیتی رہی ہیں، ان کے لیے عالم اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جاننے اور اسلام کی درست اور سچی تصویر پر مطلع ہونے کے تمام ذرائع مسدود کر دیے گئے ہیں۔ اسلام کے ان مخلص داعیوں کو دونوں نظاموں (اشتراکیت اور سرمایہ داری) میں سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا تھا، اشتراکی نظام اپنی موت آپ مر چکا ہے جو پہلے دشمن کی حیثیت سے اسلام کے ساتھ برسرپیکار رہا تھا اور اسلامی جمہوریتیں آزاد ہو گئیں جو ہمیشہ ان کے سامنے سرخم کیے رہتی تھیں۔ تاہم یہ جنگ جس کی زمام کار امریکہ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے، ایک نئی شکل اختیار کر گئی ہے اور پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ اس جنگ کی پالیسی یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں اور اسلامی داعیوں کو چاہے وہ جہاں کہیں اور جس حالت میں ہوں دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے، بعض اسلام دشمن عناصر کی طرف سے ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں جو مسلمانوں کو مشتعل کرتے ہیں۔ قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف اشتعال انگیز بیانات، مذموم رسومات کے اجراء اور نازیبا فلموں کی نمائش کر کے ان کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے۔ اسلام کے مخلص داعیوں نے صلیبی جنگوں کے وقت بھرپور مزاحمت کی تھی، یورپ کی تہذیبی و ثقافتی جنگ کے خلاف بھی برسرپیکار رہے تھے، جب اس نے عالم اسلام کو علم، میڈیا اور عام انسانی حقوق کے احیاء کے نام پر زیر کرنے کی کوشش کی تھی اور آج بھی جب ان کے خلاف دہشت گردی اور اسلامی بنیاد پرستی کے نام پر جنگ چھیڑ دی گئی ہے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت وحمایت سے برابر اس کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان پر لگائے جانے والے تمام اشتعال انگیز الزامات و بیانات کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں اور اپنے دعوتی عمل کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

انتہائی تعجب خیز اور چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ نفرت وعداوت کی اس مسموم اور تاریک فضا میں مسلسل ایسی خبریں سامنے آرہی ہیں کہ تعلیم یافتہ حضرات، مفکر، قلم کار، اداکار حتی کہ مذہبی رہنما اور اسلام کے سخت دشمن بھی کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہورہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ مذہب اسلام کو گلے لگا رہے ہیں؛ بلکہ اس کے پرجوش داعی اور مبلغ کی حیثیت سے عالمی بساط پر ابھر رہے ہیں۔ ان کی تقریروں، تحریروں اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کا وسیع وعمیق مطالعہ کیا ہے اور اس کی صداقت ان کے دلوں میں گھر کر گئی ہے۔ اب وہ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ اس سے قبل اسلام کے بارے میں جو کچھ انہیں پہنچایا جارہا تھا وہ جھوٹ اور مکروفریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

آج اسلام کے حقیقی چہرے سے بہت سے حجابات اٹھ گئے ہیں، بہت سے شبہات والتباسات جو مستشرقین کے ذریعہ پھیلائے گئے تھے اور جنہوں نے انسانی عقل کو جیسے منجمد کر رکھا تھا، ایک ایک کر کے دور ہوتے جارہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں کثرت سے اسلامی ادارے قائم کیے جارہے ہیں، علمی و اقتصادی اکیڈمیاں اور تعلیم وتربیت کے مراکز جگہ جگہ کھولے جارہے ہیں، یہاں تک کہ اسلام کا بینکنگ نظام بھی مقبولیت کی حدیں چھورہا ہے اور اسلامی مصنفین اس پر کھل کر لکھ رہے ہیں۔ نیز ان اداروں کی سرگرمیاں محدود نہ ہوکر اسلام کے بیشتر موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اگر اسی طرح اخلاص ونیک نیتی اور اتحاد ویک جہتی کے ساتھ اور ہر قسم کے تعصّبات اور اختلافات سے ماوراء ہوکر، اسلام کو مضبوطی سے تھام کر، اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق کر کے ان کی سرگرمیاں جاری رہیں تو بہت جلد ثابت ہوجائے گا کہ اسلام وہ نہیں جو مغربی اقوام سمجھتی رہی ہیں اور مغربی قائدین ان کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ عنقریب

انہیں معلوم ہو جائے گا کہ پوری دنیا میں تنہا اسلام ہی وہ دین ہے جو انسانی معاشرہ کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

اس طرح کے حالات میں داعیان اسلام کی جو پہلی ذمہ داری بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ مغربی اقوام کے دل و دماغ سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے خوف و دہشت کے سائے کو دور کیا جائے۔ اس کے لیے انہیں شخصی ملاقاتیں کرنی ہوں گی، قراردادیں جاری کرنی ہوں گی اور جدید ذرائع نشر و اشاعت کا سہارا لینا ہوگا اور مغربی اقوام کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کرنی ہوگی کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور پیغمبر اسلام ساری انسانیت کے لیے سراپا رحمت ہیں اور اسلام ان کو زندگی کی ان مشکلات اور آزمائشوں سے نکال کر جن میں وہ مبتلا ہیں سعادت و نیک بختی کی زندگی میں داخل کر دے گا۔

انسانیت کی مصیبت

مغرب کے مشرق سے جدا ہونے میں ہے (☆)

اس سال ہجری اور عیسوی دونوں سال صرف دو دن کے فرق سے شروع ہوئے، دونوں کے درمیان یہ قرب کیا اس طرف اشارہ نہیں کرتا کہ مشرق و مغرب دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور دونوں میں فاصلے کم ہو سکتے ہیں، ٹکراؤ اور تصادم کا ماحول بدلا جاسکتا ہے اور انسانیت کی فلاح کے لیے دونوں میں اتحاد اور تعاون پیدا کیا جاسکتا ہے، یا مشترک مسائل پر غور کرنے لیے دونوں جمع ہو سکتے ہیں، مغرب کے ممالک اگر اپنے مفادات کی وجہ سے مشرق کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے، تو کم از کم مشرق کے ممالک جو مغرب کی تابعداری میں ہیں، اپنے مسائل حل کرنے لیے متحد ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے، ٹکراؤ اور کشمکش کی فضا قائم ہے اور یورپ اور عالم اسلام کے درمیان دوری بڑھتی ہی جارہی ہے، اس کشمکش اور دوری کا بنیادی سبب مغرب کی وہ سامراجی پالیسی اور مذہبی عصبیت ہے جس کی وجہ سے مسلم ممالک کے ساتھ خاص کر تعصب کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ذہنی اور فکری دوری بڑھتی جارہی ہے اور اسلام دشمنی پھیلتی جارہی ہے، گویا دونوں کے درمیان جنگ کا ماحول بنا ہوا ہے۔

مشرق و مغرب کے درمیان بڑھتی ہوئی اس کشمکش کے ساتھ ساتھ دنیا کے چھوٹے ممالک کے حکمرانوں اور عوام کے درمیان عالمی طاقتوں کی بے جا مداخلت کی

(☆) تعمیر حیات، ۱۰ر جنوری ۲۰۰۹ء۔

وجہ سے بڑی خلیج حائل ہوتی جارہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ بڑی طاقتیں ان ملکوں پر اپنا نظام تھوپنا چاہتی ہیں جو یہاں کے عوام کے فکر و نظام سے متصادم ہے، اس دوری اور بڑھتی ہوئی خلیج کے نتیجہ میں سخت کشمکش پیدا ہوجاتی ہے، جو کبھی کبھی مسلح تصادم کی صورت اختیار کرلیتی ہے، عوام میں نامقبول حکومتیں اس کو کچلنا چاہتی ہیں اور ظلم اور استبداد کا شکار افراد مسلح ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں، اس طرح ہر ملک میں ٹکراؤ کی صورت حال پائی جاتی ہے۔

اس سلبی سیاست کے نتیجہ میں ہزار ہا ہزار لوگ مارے جاچکے ہیں، دہشت گردانہ اور خودکش حملوں کے واقعات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، صومالیہ، سوڈان اور عراق میں سامراجی امریکی مداخلت اور سیاسی عدم استقرار کی صورت حال سے جانی و مالی نقصان ہورہا ہے، فلسطین میں خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے، جہاں غاصب اسرائیل خون کی ہولی کھیل رہا ہے اور عالمی طاقتیں اس کی پشت پناہی کررہی ہیں۔

حکمرانوں اور عوام کے درمیان اس بڑھتی ہوئی کشمکش کے ساتھ ساتھ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں خصوصاً عالم اسلام میں ایک ہی قوم کی مختلف جماعتوں کے درمیان نااتفاقی، دوری، رقابت، نفرت اور عداوت پائی جاتی ہے، حکمراں طبقہ کی منفی اور ملک وقوم مخالف پالیسی کی وجہ سے سیاستدانوں اور سماجی اور عوامی نمائندوں کے درمیان دوری پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں کا حکمراں طبقہ قوم کے ملی، معاشرتی، تہذیبی اور دینی مفادات کا خیال نہیں کرتا، بلکہ بڑی طاقتوں کے اشارہ اور حکم کے مطابق عمل کرتا ہے، لہٰذا ٹکراؤ، دوری اور ایک دوسرے سے عداوت اور بے اطمینانی موجودہ زمانہ کا شعار بن گیا ہے اور یہ ٹکراؤ بڑھتا ہی جارہا ہے۔

آج اس بات کا ہر طرف چرچا ہے کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک

گاؤں (Global Village) بن گئی ہے، لیکن یہ خام خیالی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ بات قدیم زمانہ میں تو ایک حد تک صحیح تھی، لیکن اس دور میں گاؤں گاؤں میں ٹکراؤ ہے، ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو برداشت کرنے پر تیار نہیں، بلکہ ایک خاندان کے مختلف افراد یہاں تک کہ والدین، اولاد اور سگے بھائیوں کے درمیان ٹکراؤ پایا جاتا ہے، ایک مکتب فکر والے دوسرے مکتب فکر والوں سے ٹکرا رہے ہیں، یہاں تک انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں یہ ٹکراؤ موجود ہے، حالانکہ تہذیب وتمدن کا تقاضہ یہ تھا کہ آپس میں اتفاق واہم آہنگی ہوتی، رفاقت وتعاون کا جذبہ ہوتا، انسانیت کا احترام ہوتا اور اطمینان واعتماد کی فضا قائم ہوتی، لیکن یہ ساری چیزیں اب معاشرہ میں غیر ضروری سمجھ لی گئیں ہیں، اس صورت حال کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات کی خاطر عوام پر اپنے نظریات تھوپتے ہیں اور عوام کی ضروریات سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔

مشرق ومغرب کی دوری اور ٹکراؤ، حکومت اور عوام کے درمیان یہ خلیج اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی باہمی کشمکش، بے اطمینانی اور شک وشبہ کی یہ فضا انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے، قیام امن کے لیے جو طریقہ اپنایا جارہا ہے، اس سے صورت حال مزید خراب ہوتی جارہی ہے، اس کا جائزہ لیتے ہوئے دو معروف انگریز صحافی Andrew Rachard اور Strauss Falk نے گزشتہ نئے سال کے آغاز کے موقع پر لکھا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جو پالیسی وضع کی گئی ہے، اس سے دہشت گردی کو مزید فروغ مل رہا ہے، ان کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ آزادیٔ رائے کی کمی اور عوام اور حکمراں طبقہ کے درمیان خلیج ہے، انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ لوگوں کو اظہار رائے کی پوری آزادی ملنی چاہئے، سیاسی قیادت پر بے اطمینانی اور شکوک وشبہات کو ختم کرنے کے لیے انہیں اپنے معاملات پر غور کرنے کا پورا اختیار ہونا چاہئے۔

نیا سال اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ قیام امن کے لیے ایسی پالیسی وضع کی جائے جس سے مشرق ومغرب کے عوام اور حکمراں طبقہ کے درمیان ٹکراؤ کے بجائے یکجہتی واتحاد، دوری کے بجائے قربت، کشمکش ورقابت کے بجائے رفاقت وتعاون، ظلم وزیادتی کے بجائے ہمدردی وہم آہنگی، تناؤ کے بجائے الفت ورواداری، نفرت کے بجائے محبت اور غرور وگھمنڈ کے بجائے بھائی چارگی واشتراک عمل کی فضا قائم ہو۔

ہجری اور عیسوی دونوں سال کا آغاز دو دن کے فصل سے ہوا، دونوں سالوں کا یہ اتحاد اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مشرق ومغرب دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنا چاہئے، دونوں کے درمیان دوری کا تصور غلامی کے عہد کا تصور ہے، جو مغربی سامراج نے پیدا کیا ہے، انگریز شاعر کپلنگ Kiplin نے کہا تھا کہ ''مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، دونوں کبھی مل نہیں سکتے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> یہ بات اگرچہ ایک ادیب کی زبان سے نکلی تھی، جو اس صدی کی ابتداء میں فوت ہوا ہے، مگر یہ دراصل ایک تصور ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خاص نظریہ یا تصور کسی سوسائٹی میں کبھی قبول ہو جاتا ہے اور افراد کے عقائد وجذبات کے بنانے اور ان کی پرورش میں اس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے، پھر اسی نظریہ یا تصور کو کوئی شاعر جو اپنی سوسائٹی کا ترجمان ہوتا ہے، اپنے بلیغ انداز میں موزوں کر دیتا ہے، جو ایک ضرب المثل بن کر پھیل جاتا ہے، پھر ہر دور میں اس کے بعد آنے والی نسلیں ہر جگہ اس کو دہراتی ہیں اور ایک اصول اور کلیہ کی طرح اس پر ایمان رکھنے لگتی ہیں۔

مگر اس تصور نے انسانی مفاد کو جتنا نقصان پہونچایا ہے اور جس درجہ اس نے انسانی وحدت کے اصول کو پارہ پارہ کیا ہے اور ان کے انداز فکر پر جو ستم ڈھایا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے نظریہ نے اس قدر نقصان پہنچایا ہوگا، کیونکہ یہ تصور بنی نوع انسان کے خاندان کو مشرق و مغرب کی دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیتا ہے، کہنے کو تو یہ ایک سادہ سی بات یا تاریخی حقیقت ہے، مگر لوگ اس کے بعد سے ہمیشہ مشرق و مغرب کو اس نظریہ سے دیکھنے لگے کہ یہ دو حریف کیمپ ہیں، یہ اولاً تو کبھی مل نہیں سکتے اور اگر ملے تو میدان جنگ ہی میں مل سکتے ہیں اور اگر کبھی اکٹھا ہوئے بھی تو ایک دوسرے کی ہجو کریں گے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کی برائیاں نکال کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کریں گے''۔

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، ص:۱۲)

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:۔

''اس صورت حال نے جس کی ذمہ داری فریقین پر عائد ہوتی ہے، اسلام کا اس سطح سے مطالعہ کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا، جس کا وہ مستحق تھا اور جس کی ہر حال میں اور ہر زمانہ میں ایک نوخیز ترقی پذیر اور حقیقت پسند تہذیب اور معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے، انیسویں صدی کے وسط میں جب سائنس اور ٹکنالوجی نے برق رفتاری کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا، اس کا زریں موقع تھا کہ مذہب سے (جس کا سب سے زندہ اور توانا نمائندہ اسلام تھا) علم و طاقت کے استعمال کے صحیح مقاصد اور انسانیت کی خدمت کا صحیح جذبہ لیا جاتا، ضبط نفس کی طاقت حاصل کی جاتی اور قومیت Nationalism اور وطن پرستی سے بالاتر احترام انسانیت اور مساوات اقوام و ملل کا نقطۂ نظر اور طریقہ فکر پیدا کیا جاتا اور قوموں اور ملکوں کے درمیان طاقت کے مظاہرہ کی اس مجنونانہ ریس سے پرہیز

کیا جاتا، جس نے دنیا کو اس وقت خودکشی وخودسوزی کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے اور جن کے ہاتھ میں دنیا کی قیادت تھی ان کے کان اس صدا سے آشنا ہوتے کہ ﴿تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الأرض ولا فساداً والعاقبة للمتقين﴾[سورہ قصص:۸۳] (وہ آخرت کا گھر ہے ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے تیار کر رکھا ہے جو زمین میں سربلندی اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور انجام نیک تو پرہیزگاروں کا ہی ہے)۔

اگر سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ خوف خدا اور احترام انسانیت اور غیر محدود طاقتور وسائل کے ساتھ صالح مقاصد اور جذبۂ مسابقت کے بجائے جذبۂ تعاون پیدا ہوتا (جو صرف ایک زندہ اور حیات بخش مذہب ہی عطا کر سکتا ہے) تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور ان متحارب مشرقی اور مغربی کیمپوں کے بجائے جن کی باہمی رقابت نے تہذیب انسانی بلکہ نسل انسانی کے فنا ہو جانے کا ہر وقت خطرہ پیدا کر دیا ہے، یہ دنیا ایک خوش اسلوب خاندان کی طرح زندگی بسر کرتی، لیکن مادی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی اور پھر سیاست (Politics) کی بے قید اور آزاد ترقی نے دنیا کو اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے کے خطرہ سے دوچار کر دیا اور اقبال کے بقول:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطرہ میں ہے اس کا آشیانہ

(اسلام اور مغرب، ص:۲۴-۲۶)

مغرب کی سامراجی پالیسی مغربی ممالک کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ احترام کا معاملہ کریں اور نہ ہی کمزور اور چھوٹے ملکوں کو اپنے نظام اور اپنے قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے کام کرنے کا موقع دیتی ہے، یہی

سامراجی سیاست حقیقت میں دنیا میں بے اطمینانی، کشمکش، ٹکراؤ اور بدامنی کا سبب ہے، یہ صورت حال اسی وقت ختم کی جاسکتی ہے جب کہ ایسی پالیسی وضع کی جائے جو عدل وانصاف پر مبنی ہو، اور دنیا کی تمام قوموں کو بلاتفریق مذہب وملت مساویانہ حقوق دلوائے اور عالمی سیاست کی نئی تشکیل کی جائے۔

موجودہ زمانہ جسے مشرق ومغرب کے درمیان قربت، رفاقت اور تعاون کا عہد کہا جارہا ہے اور جس میں جغرافیائی اور تہذیبی فاصلے کم ہوگئے ہیں، پوری دنیا ایک گاؤں میں سمٹ آئی ہے، اس بات کا مطالبہ کررہا ہے کہ زندگی کے لیے نئی منصوبہ بندی کی جائے تاکہ مشرق ومغرب کے درمیان کی خلیج پٹ سکے، آپسی ٹکراؤ اور رقابت کے بجائے باہمی اتحاد وتعاون کو فروغ ملے اور ایک امن پسند معاشرہ وجود میں آسکے جس میں ہر شخص کو اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اپنے مذہب اور کلچر کو بے خوف وخطر اختیار کرسکے۔ نئی نسل تخلیق پائے، امن عالم اور سلامتی کی توقع اس ''قران السعدین'' کے بعد ہی کی جاسکتی ہے۔

مسلمان ردعمل کی نفسیات کے شکار نہ ہوں (☆)

امریکی صدر باراک حسین اوبامہ نے مصر میں ۳؍جون ۲۰۰۹ء کو اپنی نوعیت کی تاریخی تقریر کی تھی، اس میں انہوں نے عالم اسلام کو مخاطب کیا تھا اور عالم اسلام کے ساتھ تعلقات کو از سر نو استوار کرنے کی بات بھی کہی تھی، نیز مسلمانوں کے دلوں سے ان تمام شکوک وشبہات کو رفع کرنے کی بات بھی کی تھی جو امریکہ پر نائن الیون کے حملوں کی پاداش میں (جن کی نسبت بڑی آسانی اور ڈھٹائی کے ساتھ مسلمانوں کی طرف کی گئی) سابق امریکی صدر جارج بش کے ذریعہ عالم اسلام پر مسلط کی گئی جنگ (جو تا حال جاری ہے) کے نتیجے میں مسلمانوں کے دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں، قارئین کو یاد ہوگا کہ سابق صدر نے عالم اسلام کے خلاف اپنی اس نام نہاد جنگ کو صلیبی جنگ سے بھی تعبیر کیا تھا۔

موجودہ امریکی صدر باراک حسین اوبامہ نے اپنے اس خطاب میں کہا تھا:

''میں یہاں دنیا بھر کے تمام مسلمانوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مابین ایک نئی شروعات کے لیے آیا ہوں، ایک ایسی شروعات جو مشترک مفادات اور باہمی احترام واکرام پر قائم ہو، جو اس حقیقت پر قائم ہو کہ امریکہ اور اسلام کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں، نہ ہی ایسا کوئی داعیہ موجود ہے جو دونوں کو باہم مقابلہ آرائی پر اکسائے، بلکہ دونوں کے یہاں ایسے قواعد وضوابط ہیں جو باہم مشترک ہیں اور یہ عدل وانصاف، تعمیر وترقی، عفو ودرگزر اور ہر انسان کی عزت واحترام کے اصول ہیں۔''

(☆) ماہنامہ ذکری جدید، اکتوبر ۲۰۰۹ء۔

اس تقریر کے بعد یہ توقع کی جارہی تھی کہ امریکی خارجہ پالیسی میں کچھ تبدیلی آئے گی یا سابقہ غلطیوں کو نہ صرف یہ کہ دہرایا نہیں جائے گا؛ بلکہ ان میں کسی قدر سدھار بھی ممکن ہو سکے گا، جیسا کہ بعض سیاسی اداروں کا خیال تھا، اس بیان کے بعد یہ توقع بالکل قرین قیاس تھی کہ اسلام تہمتوں اور بہتان تراشیوں کے مکڑ جال سے نکل جائے گا اور عالم اسلام کے خلاف نام نہاد دہشت گردی سے جنگ اور مقابلے کے نام پر کیے جانے والے پروپیگنڈے کا زور ٹوٹ جائے گا اور اس کی شدت میں کسی قدر کمی واقع ہوگی۔ امریکی صدر کے خطاب کے لہجہ کو دیکھتے ہوئے یہ خوش فہمی ایک فطری بات بھی تھی، انہوں نے کس قدر پرزور الفاظ میں کہا تھا کہ وہ عنقریب ایسے مثبت اقدامات کریں گے جو حالات کو سدھارنے پر مرتکز ہوں گے اور امریکی سیاست اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کے معاندانہ موقف میں تبدیلی کے ضامن ہوں گے اور اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا تھا کہ امریکی سیاست کے علاوہ ان تمام ممالک کی سیاست اور رویہ میں بھی تبدیلی آئے گی اور سدھار پیدا ہوگا جو امریکہ کے دم چھلے ہیں اور اسلام کے خلاف جنگ میں اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اس کے سر میں سر ملاتے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کو ایک عالمی خطرہ ثابت کرنے اور دوسرے ممالک کو اسلام کے خلاف اکسانے میں سب سے زیادہ اہم رول اسی امریکہ کا ہے۔ امریکہ نے بعض اسلامی ممالک کے خلاف ان کے اس جرم میں کہ انہوں نے دہشت پسند عناصر کو پناہ دے رکھی ہے، محض عسکری جنگ کے اعلان پر ہی اکتفا نہ کیا اور ان کو اپنے یہاں کی اسلامی تنظیموں اور اسلامی اداروں جو امریکہ کے زعم میں دہشت گردی کے اڈے ہیں، سے سختی کے ساتھ نپٹنے پر مجبور کرنے پر ہی بس نہیں کیا، نیز ان پر اپنے اپنے ملک میں رائج تعلیم و تربیت کے نظام میں تبدیلی کے لیے دباؤ بنانے تک اس جنگ کو وسعت دینے پر اور اسلامی تحریکات اور ان کے ذمے داروں پر پابندیاں عائد کرنے

پر ہی اکتفا نہ کیا؛ بلکہ اس نے زبانی جنگ بھی چھیڑ دی اور عالمی پروپیگنڈہ کے حملے کی عنان بھی ڈھیلی چھوڑ دی۔ اس نے اس کے لیے ہر طرح کے وسائل اختیار کیے، قلم و قرطاس سے لے کر میڈیا اور فلم انڈسٹری نیز دہشت گردانہ عناصر کے خلاف خطیر رقموں کے اعلانات تک تمام حربے، تمام آلات اور اسباب وسائل اس نام نہاد پروپیگنڈے پر لگا دیے۔ ایسے حالات میں نئے امریکی نظام کی جس میں عالم اسلام کے ساتھ تعلقات کو ایک بار پھر سے استوار کرنے اور قدیم موقف کو درست کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی، یہ ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ ان تمام اقدامات پر روک لگائے جن کے باعث ساری دنیا میں عالم اسلام سے خوف و دہشت اور مسلمانوں سے نفرت بڑھی ہے، خاص طور پر ان مسلمانوں کے خلاف وحشت میں اضافہ ہوا ہے جو دیندار سمجھے جاتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو استوار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے یہ تمام امیدیں اور توقعات جو امریکہ، اس کے حلیف ممالک اور عالم اسلام کے مابین تعلقات کی نئی شروعات کے تعلق سے صدر کے امید افزا بیان سے پیدا ہوئی تھیں، پوری نہ ہو سکیں، بلکہ اور الٹا مسلم دنیا کے خلاف جنگی محاذ آرائی میں شدت پیدا ہو گئی اور اس کے لیے نئی نئی تدبیریں اور پالیسیاں اختیار کی جانے لگیں تا کہ امریکہ کے ان مفادات کو بھنایا جا سکے جن کو کیش کرانے کا فیصلہ اس نے نائن الیون کے نام نہاد بم دھماکوں کے بعد لیا تھا یا پھر اس سے پہلے ہی۔

آج بھی عراق اور افغانستان کی صورت حال جوں کی توں برقرار ہے، وہاں کل جس طرح کے حالات تھے آج بھی اسی طرح کے حالات ہیں۔ آج بھی پاکستان پر اسی طرح دباؤ بنایا جا رہا ہے جس طرح پہلے دباؤ بنایا جا رہا تھا، پاکستان سے آج بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ اپنے ملک میں دینی عناصر کا قلع قمع کرے، خاص طور پر طالبان

سے سختی کے ساتھ نپٹے، طالبان جو اسلامی تشخصات و امتیازات کی گویا علامت بن گئے ہیں یا بنا دیے گئے ہیں جیسے اسلام کو فالو کرنے کے لیے وہی آئیڈیل اور نمونہ ہوں، چنانچہ ان کو مٹانے اور زیر کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کے پردے میں عام انسانوں کا قتل و خون بھی جاری ہے۔ یہ قابل غور ہے کہ افغانستان میں تعینات ناٹو کے زیر کمان مسلح فوج کی میعاد میں توسیع کی باتیں کی جا رہی ہیں، ناٹو افواج کے سربراہ نے اعلان کیا ہے کہ ناٹو کے زیر قیادت مسلح افواج کا افغانستان میں قیام امن و امان کا ضامن ہے، اگر وہ وہاں سے نکل جاتی ہے تو القاعدہ دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گی اور خطہ کا امن و امان معرض خطر میں پڑ جائے گا، خاص کر پاکستان کی سلامتی کو درپیش چیلنجز میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ناٹو کے سربراہ کے اس بیان کا سیدھا مطلب تو یہی ہے کہ اس علاقہ میں نسل انسانی کی تباہی و بربادی اسی طرح جاری رہے گی، ساتھ ہی اسرائیلی جارحیت اور اس کے ظالمانہ اور انسانیت کش اقدامات کی حوصلہ افزائی بھی اسی طرح کی جاتی رہے گی جس طرح اب تک کی جاتی رہی ہے اور فلسطینی علاقہ میں نئی بستیاں بسانے پر روک لگانے کے امریکی مطالبات کو حقارت کے ساتھ رد کر دینے کی اس کی جرأت اسی طرح حوصلہ پاتی رہے گی۔

ایران کے تعلق سے امریکی سیاست اور اس کی خارجہ پالیسیوں میں بھی کسی طرح کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، ایران آج بھی اقتصادی پابندیوں کی مار جھیل رہا ہے، جبکہ صدر اوبامہ نے اس قضیہ پر نظر ثانی کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ ایران کی تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ وہ بدترین قسم کی خانہ جنگی کی صورت میں غیر اعلانیہ جنگ کی چکی میں پیسا جا رہا ہے اور یہ سب یورپی ممالک کے اشاروں پر ہو رہا ہے، وہ ایران میں اس خانہ جنگی کو بڑھاوا دینے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہیں اور اس کے لیے مغربی میڈیا اور ذرائع ابلاغ و ترسیل کی تمام تر قوت صرف کر رہے ہیں۔

آج بھی مقبوضہ اسلامی ممالک میں غاصب قوتوں کا وجود مستقل برقرار ہے، بلکہ ان کی قوت میں مزید اضافہ ہی ہو رہا ہے، قتل و غارت گری اسی طرح ہو رہی ہے اور بم دھماکے آج بھی اسی طرح روزانہ کا معمول ہیں، جس کی وجہ سے دونوں طرف جان و مال کا نقصان اور خسارہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کا صاف مطلب تو یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی گھیرابندی، ان کے سیاسی نظام پر تسلط جمانے اور ان کو امریکی مفادات کے حصول کے تئیں لقمۂ تر بنانے کی امریکی سیاست میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے، اور نہ ہی تعلقات کی از سر نو استواری کے تعلق سے ایسی کسی نئی شروعات کا کہیں اتہ پتہ ہے جس کا امریکی صدر نے اپنے خطاب میں حوالہ دیا تھا اور پچھلی غلطیوں کو نہ دہرانے بلکہ ان میں کسی قدر سدھار لانے کی بات کہی تھی۔

یہ تو جنگی اور فوجی یلغار اور تسلط کی بات تھی جو مغرب کے تصور آزادی اور انسانی حقوق کے پرزور دعوں کے بالکل مغایر اور مخالف ہے، تاہم اس سے بھی زیادہ مہلک اور خطرناک جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ براہ راست دینِ اسلام کے خلاف بھی مغرب کی چوطرفہ جنگ جاری ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مغربی اور یورپی قائدین اس بات سے انکار کرتے رہے ہیں کہ وہ راست طور پر اسلام کے ساتھ برسرپیکار ہیں، ان کا ماننا ہے کہ وہ دہشت گردی اور بنیاد پرستی سے لڑ رہے ہیں، اور ان کی یہ جنگ سراسر عسکری اور ریڈیکل اسلام کے خلاف ہے، ان کا حقیقی ہدف دہشت گردی سے نپٹنا اور امن عالم کو فروغ دینا ہے۔

جب امریکہ کے نئے صدر باراک حسین اوبامہ نے زمام حکومت سنبھالی تھی تو ان کی طرف سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ دین اسلام کا دہشت گردی سے کوئی علاقہ نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ان سے قبل کے صدر اور وزراء کہتے آئے ہیں۔

لیکن اوپر کی سطور میں موجودہ حالات کی جو منظر کشی کی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب محض زبانی جمع خرچ کے سوا اور کچھ نہیں، دراصل یہ سب بہلاوے ہیں جبکہ حق بات یہی ہے کہ یہ جنگ راست طور پر دین اسلام کے خلاف لڑی جا رہی ہے اور یہ بات ہر وہ شخص جانتا اور سمجھتا ہے جس کی معاصر میڈیا پر اور یورپی ممالک کی رائج سیاستوں پر گہری نظر ہے۔ یہ اسلام کے خلاف جنگ ہی کا شاخسانہ تو ہے کہ ساری دنیا کے قلم کاروں اور فلمی اداکاروں سے لے کر میڈیا کے تمام لوگوں تک سب کے سب مستقل طور پر اسلام کو عالمی امن کے لیے خطرہ ثابت کرنے کی پرزور مہم چھیڑے ہوئے ہیں اور ہر گھڑی دنیا کو اسلام سے ڈرا رہے ہیں۔ کتابیں تصنیف کی جا رہی ہیں، بیانات جاری کیے جا رہے ہیں اور تجزیے اور ریمارک مستقل آ رہے ہیں، اور یہ بات ہم میں سے ہر کوئی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان سب کے نشانے پر اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہے صرف اور صرف دین اسلام۔ دوسری طرف کسی بھی ملک میں حکومتی سطح پر ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی جا رہی جو اس اسلام مخالف ذہنیت اور سوچ پر قدغن لگا سکے۔ لہٰذا حالات انتہائی حد تک ابتر ہو چکے ہیں، مسلمان ساری دنیا میں سخت دباؤ اور بے چینی محسوس کر رہے ہیں، اسلامی تشخصات اور شعائر کو نفرت انگیز حملوں کا سامنا ہے، اس کی سب سے قریبی دلیل صدر فرانس نکولس سرکوزی کا وہ نفرت انگیز ریمارک ہے جو انہوں نے حجاب کے سلسلے میں کیا ہے اور جس پر ساری دنیا میں اور بطور خاص فرانس میں اچھا خاصہ وبال کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف ایک ہندوستانی جج حجاب اور داڑھی کو طالبانی علامت قرار دے کر تمام حدود کو پار کر گئے۔ جج کے اس ریمارک پر جو ایک مشنری اسکول میں داڑھی پر پابندی عائد کرنے کے فیصلے کے خلاف ایک مسلمان طالب علم کے ذریعہ کورٹ میں عرضی داخل کرنے کے بعد سامنے آیا تھا پورے ملک میں وسیع پیمانے پر احتجاجات ہوئے اور مسلم قائدین سیاسی نمائندوں سے

مسلسل رابطہ بنائے رہے، تب کہیں جا کر مذکورہ جج نے معذرت خواہی کی، اپنا بیان واپس لیا اور اس مسئلہ کو عدالت کے ججز کی دوسری کمیٹی کو سونپ دیا۔ ابھی یہ مسئلہ زیریں عدالت میں زیر بحث ہی تھا کہ ہندوستانی فوج میں مسلم فوجیوں کو داڑھی رکھنے کی ممانعت سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ سامنے آیا جو ایک مسلم فوجی کے ذریعہ عدالت عظمیٰ میں پیش کیا گیا۔

یہ تو ہمارے ملک ہندوستان کی صورت حال ہے، جبکہ یورپی ممالک کی صورت حال اس سے کئی گنا زیادہ خراب اور ابتر ہے، ان ممالک میں داڑھی اور حجاب سے متعلق مسائل میں دن بہ دن شدت آتی جارہی ہے۔ مساجد اور مدارس پر حملوں اور اسلامی تحریکات سے وابستگی کے الزام میں مسلم نوجوانوں کو حراست میں لینے کی خبریں میڈیا میں مسلسل آرہی ہیں۔ اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کی عزت وناموس کو بٹا لگانے کی پرزور کوششیں جاری ہیں۔ کتابوں پر کتابیں لکھی جارہی ہیں، بیانات جاری کیے جارہے ہیں نیز اسلام اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اہانت آمیز خاکوں اور کارٹونوں کی بار بار اشاعت کی جارہی ہے اور ان سب پر مستزاد وہ گمراہ کن تصنیفات اور قرآن کریم میں تحریفات کی کوششیں ہیں جو ملت اسلامیہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں گی۔ مذہبی شرپسند تنظیمیں کھلے عام اسلام اور مسلمانوں کے کاز اور ان کے عزت وناموس کو زک پہنچارہی ہیں اور ان کو جان ومال کے خسارے سے دوچار کررہی ہیں، مزے کی بات تو یہ ہے کہ انہیں ان حکومتوں نے بھی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے، جو اپنے آپ کو جمہوری اور سیکولر حکومت کہلانے کی دعوے دار ہیں۔

یورپی ممالک کے اسلام مخالف جذبات اور عداوت کی یہ لہر ہندوستان تک بھی پہنچ چکی ہے، اب یہاں بھی زہریلی کتابیں منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک ہندوستانی وکیل ''بھسین'' کی کتاب منظر عام پر آئی ہے، انہوں نے اپنی

اس کتاب میں اسلام اور اس کی تعلیمات پر نازیبا الزامات عائد کیے ہیں۔ حکومت نے مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دی۔ پھر اس نے "Islam a world danger you must know this much about" کے نام سے مقالہ شائع کیا۔ یہ تمام واقعات اور اقدامات بتاتے ہیں کہ براہ راست دینِ اسلام کو نشانہ بنانے کی مغربی جنگ اب محض مغرب تک ہی محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ اس کے زہریلے اثرات اب ہندوستان جیسے ملک تک بھی پھیل گئے ہیں جس کی مسلم آبادی دوسرے کسی بھی مسلم ملک سے زیادہ ہے اور وہ یہاں کی سب بڑی اقلیت ہونے کے باوجود بھی سخت حالات سے گزر رہے ہیں، ان پر شر پسند عناصر کی طرف سے جو ملک کی اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں، حملے کیے جاتے ہیں اور انہیں دین اسلام سے روکنے کے لیے ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔

ساری دنیا میں اسلام سے خوف ونفرت کی یہ ذہنیت امریکہ کے سابق صدر کی ناموافق سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور اسی سے شہہ پا کر یورپی حکومتیں جو اسلامی ممالک میں اپنی شرمناک شکست وہزیمت کے بعد حالت جاں کنی میں تھیں ان کی مضمحل روح میں ایک بار پھر جان پڑ گئی۔ امریکہ کے ذریعہ کھڑی کی گئی اسلام کے ساتھ مستقل محاذ آرائی سے ان کو یہ موقع نصیب ہوا کہ وہ غفلت وجاں کنی کی کیفیت سے نجات پا سکیں اور اپنے داخلی امور ومعاملات میں بحرانی مسائل کا تصفیہ کر سکیں۔

سارے عالم میں تیزی کے ساتھ پنپتی ہوئی یہ ذہنیت اسی وقت تبدیل ہوگی جب امریکہ کی سیاست میں تبدیلی آئے گی اور امریکی سیاست میں تبدیلی کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جب باراک حسین اوبامہ عالم اسلام کے ساتھ تعلقات کی ''نئی شروعات'' کا اپنا وعدہ نبھائیں۔

دین اسلام تو انسانوں کی بھلائی اور رشد وہدایت کا ضامن ہے، وہ عفو ودرگزر،

امن وامان، تعمیر وترقی اور داد و دہش سے عبارت ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی اسلام کا کھلے ذہن سے مطالعہ کرے گا وہ اس سچائی کو پالے گا اور پھر اسلام کو اپنانے کے سوا اس کے لیے اور کوئی راستہ نہ رہ جائے گا۔ یا کم از کم اسلام کے تئیں اس کے رجحانات وخیالات میں زبردست تغیر واقع ہو جائے گا۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ کھلی ذہنیت کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنے سے لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہاں تک وہ لوگ بھی جنہوں نے قرآن کریم کو تنقید کا نشانہ بنایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وکردار پر کیچڑ اچھالا، جب انہوں نے کھلی ذہنیت کے ساتھ مطالعہ کیا تو ان کے موقف میں تبدیلی آگئی اور بالآخر انہوں نے تسلیم کیا کہ اسلام ہی دین حق ہے، وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کو ضامن ہے، اور پاکیزہ طرز معاشرت پر مبنی ہے، اسلام کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں، وہ خیر وشر کے درمیان تمیز اور پہچان کے اپنے اصول رکھتا ہے اور جن تعلیمات کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے وہ ہر طرح سے ٹھوس اور پختہ تر ہیں۔ اس بات سے شاید کوئی کور چشم ہی انکار کرسکتا ہے کہ انسان کی کرامت اور شرف وتمجید میں تمام انسانی فلسفے اور خود ساختہ یا تحریک شدہ مذاہب ناکام ہوگئے۔ اور یہ ناکامی ونامرادی کا ان کا یہی احساس ہے جو انہیں اسلام مخالف جذبات پر برانگیختہ کرتا ہے اور انہیں جنگ وجدال پر آمادہ کردیتا ہے۔

درحقیقت یہ جنگ زندگی کی خاص قدروں کے خلاف جنگ ہے اور اس طرح کی جنگ جو انسانی قدروں کے خلاف ہو وہ کسی بھی صورت میں انسانیت کی فلاح کا ضامن نہیں ہوسکتی، اس سے جو ایک چیز پیدا ہوسکتی ہے وہ صرف اور صرف انسانوں کی ہلاکت وبربادی ہے۔

بلاشبہ اس وقت ساری دنیا کے مسلمان اور خاص طور پر دینی تعلیمات وہدایات پر سختی کے ساتھ کاربند رہنے والے افراد ہر جگہ اور ہر مقام پر اس معاندانہ سیاست کی

وجہ سے جو اسلام مخالف تحریکات کے ذریعہ پروان چڑھائی جارہی ہے، قسم قسم کے مسائل میں گرفتار ہیں۔ پھر بھی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان ردعمل کی نفسیات کے شکار ہو جائیں اور وہ بھی عداوتوں اور نفرتوں کا جواب عداوت اور نفرت ہی سے دینے لگیں۔ ردعمل کی یہ نفسیات ان کے شایان شان بالکل نہیں ہے، ان کا کام تو یہ ہے کہ نصیحت وخیر خواہی اور دعوت الی اللہ کے عمل کو جاری رکھیں، اسلامی تعلیمات اور احکامات کو حکمت و مصلحت اور متوازن انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہیں کہ ان کے اسلام کو ہر حال میں یہی اور بس یہی حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ، وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ

(فصلت۔ ۳۳-۳۵)

''اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوسکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، یقیناً نیکی اور بدی یکساں نہیں ہوتیں، بھلے اور معروف انداز میں برائیوں کو دفع کرنے کی کوشش کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ جو شخص کل تک تمہارا جانی دشمن تھا وہ آج تمہارا جگری دوست بن چکا ہے، اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو صابر و شاکر ہے اور نصیبہ والا ہے۔''

آزادیٔ اظہارِ رائے کا مطلب (☆)

امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے تنظیم اسلامی کانفرنس کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی ہے جس میں مذاہب و ادیان کے سلسلہ میں گستاخی اور زبان درازی پر روک لگانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، انہوں نے اس پر اظہار رائے کی آزادی کے خلاف ہونے کا الزام دھرا ہے، نائب وزیر خارجہ مسٹر میکل بوسنر نے بھی اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> امریکہ اس تجویز کا شدید مخالف ہے جسے تنظیم اسلامی کانفرنس نے ممبر اسلامی ممالک کے مشورہ سے سلامتی کونسل میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا ہے، کیونکہ آزادی اظہار رائے موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد ہے، بلکہ ہماری تہذیب اور نظام زندگی کی اصل بنیاد ہے، اور یہ تجویز آزادی رائے پر ہی پابندی عائد کرتی ہے، لہٰذا تنظیم اسلامی کانفرنس کا یہ قدم انتہا پسندانہ ہے۔
>
> (الشرق الاوسط، ۲۸/اکتوبر/۲۰۰۹ء لندن)

سچی بات تو یہ ہے کہ اس تجویز کو کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس میں کسی بھی مذہب کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیے جانے کی مذمّت کی گئی ہے، دینِ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر انسان کا احترام کیا جائے، کسی کے ساتھ بھی برا سلوک نہ کیا جائے، حتیٰ کہ مذاق، تمسخر، تنابز بالألقاب سے روکا گیا ہے چہ جائے کہ وہ ادیان و مذاہب کے سلسلہ میں نازیبا حرکات کی تعلیم دیتا۔

(☆) تعمیر حیات، ۲۵/جنوری ۲۰۱۰ء۔

ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم [الأنعام:۸]۔ لايسخر قوم من قوم عسى أن يكونوا خيراً منهم ولا نساء من نساء عسى أن يكن خيراً منهن ولا تلمزوا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب [الحجرات:۱۱۔]

تنظیم اسلامی کانفرنس نے یہ اقدام اس حملہ کو روکنے کے لئے اٹھایا ہے جس کا نشانہ اسلام، نبی اسلام اور مسلمان ہیں، مغربی ممالک میں نبی رحمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ میں گستاخی کا سلسلہ جاری ہے، حیات طیبہ کو داغ دار کرنے کی سازشیں جاری ہیں، کبھی لٹریچر کے ذریعہ، کبھی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ، خاص طور پر ڈنمارک کی اخبار کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کارٹون شائع کر کے پورپی دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی، اسی پر بس نہیں، بلکہ اس جرم کے ارتکاب میں دنیا کے متعدد اخبار شریک ہوئے، باوجود اس کے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی جانب سے اس کی مخالفت ہوئی، اس کی مذمت میں مظاہرے ہوئے، اور احتجاج کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کیا گیا جس میں مسلمانوں کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا، اس کے بعد بھی اہانت آمیز کارٹون کی اشاعت پر روک نہیں لگائی گئی اور یہ غیر انسانی عمل جاری رہا، مختلف طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جاتی رہی، ان کی شبیہ بگاڑنے کے لیے ہر ممکن حربے اپنائے گئے حتی کہ اہانت آمیز فلم ''فتنہ'' بھی سامنے آئی، حالانکہ اس طرح کے گھناؤنے اقدامات بین الاقوامی قانون کے تحت سنگین جرم شمار کیے جاتے ہیں، اور اگر اہانت اور توہین کا شکار شخص عدالت چلا جائے تو مجرم پر مقدمہ دائر ہوتا ہے، اور اس پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے، تو اس شخصیت کی شان میں گستاخی کرنے والے کا جرم کتنا سنگین ہوگا جس کے ماننے والے دنیائے جہاں میں ایک تہائی سے بھی

زیادہ ہیں، جو اپنی عزت کو، اپنے مال کو، اپنی جان کو، اپنی آبرو کو اور اپنے ماں باپ کو اس پر قربان کرتے ہیں۔

فإن أبي و والده و عرضي
لعرض محمد منكم و قاء

(میرے باپ اور ان کے باپ اور میری عزت محمد کی عزت پر قربان ہے اور دشمنان دین تمہارے مقابلہ میں یہ ڈھال ہے)

اس بے لوث محبت اور فدائیت و جاں نثاری کا اندازہ ان احادیث شریفہ سے ہوگا جن میں اس کو کمالِ ایمان کی شرط شمار کیا گیا ہے، "لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده و ولده و الناس أجمعين"۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مسلمان کے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے جس سے صرف اسلام اور اسلام کے متبعین ہی واقف ہیں، اس کی حقیقت کو وہ کیا جانیں جنہوں نے اپنے دینی رہنماؤں کی خیالی تصویریں بنا ڈالیں اور ان کے سلسلہ میں اپنی خواہش کے مطابق پروپیگنڈہ کیا، ان میں آسمانی دین کے ماننے والے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دینی کتابوں میں دھڑلے سے تحریف کی اور ان میں غیر مستند قصوں کا ڈھیر لگا دیا، جن سے ان محترم شخصیتوں کی شان میں زک پڑتی ہے، الغرض کسی بھی طرح وہ ان کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

اس اہانت آمیز سلوک کی وجہ یورپ کی دین و اخلاق سے بغاوت ہے، بعض مغربی دانشوروں کی بے ادبی و گستاخی یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے، یہ عالم بغیر خالق کے وجود پذیر ہوا ہے، یہ دنیا اپنی فطرت پر رواں دواں ہے، مزید ان لوگوں نے انبیاء کی شان میں ایسی ایسی چیزوں کو منسوب کیا ہے جو کسی بھی طرح ان کی ذات سے میل نہیں کھاتی ہیں، اور ان کے نزدیک

مذہب انسان کا شخصی مسئلہ ہے، دین و مذہب کے سلسلہ میں آزادیٔ رائے قانونی حق ہے، بلکہ تہذیب معاصر کی بنیاد ہے، تو کیسے وہ غیروں کی معزز و محترم چیزوں کا پاس و لحاظ رکھیں گے، آزادی رائے کا ان کا یہ نعرہ صرف دینائے اسلام اور اسکی شخصیتوں تک ہی محدود ہے، اس کے برعکس کوئی شخص بھی ان کی سیاسیات، اجتماعیات، اقتصادیات اور اخلاقیات پر زبان بھی نہیں کھول سکتا، کوئی اپنے زندہ یا مردہ سیاسی لیڈر کی تنقید کی جرأت نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنے سیاسی و اقتصادی نظام پر کچھ کہہ سکتا ہے، یہ تضاد بالکل واضح ہے اس کی موجودہ دور میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، کہنے کو تو جمہوری نظام برپا ہے، لیکن اس کے معاملات آمریت جیسے ہیں، عوام الناس کو اتنی بھی اجازت نہیں ملتی کہ وہ اپنے سیاسی رہنما کی کسی بھی تجویز پر تنقید کرسکیں یا یہ کہ موجودہ نظام کی تبدیلی کا مطالبہ کرسکیں، اشتراکی نظام، مارکس، لینن، اسٹالین اور ترکی میں مصطفیٰ کمال اُتاترک کے خلاف زبان کھولنا جرم ہے۔

موجودہ دور میں ایسے دانشوروں اور قائدین کو تختۂ دار پر لٹکائے جانے کی مثالیں ملتی ہیں جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی رہنماؤں کی تائید نہیں کی، بلکہ ان کی پالیسی اور طریقہ کار پر نقد اور مخالفت کی، ان کے اس نقد اور مخالفت کو بہت بڑی خیانت شمار کیا گیا جس کے نتیجہ میں ان کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہولوکوسٹ اور سامی دشمنی بین الاقوامی سطح پر قانونی جرم ہے، اگر کوئی ہولوکوسٹ پر نقد کرتا ہے یا یہودیوں پر تبصرہ کرتا ہے تو اسے مجرم گردانا جاتا ہے اور سزا دی جاتی ہے، بات جب اپنوں کی آتی ہے تو قانون کا نام لیا جاتا ہے اور بات جب اسلام اور مسلمانوں کی ہوتی ہے تو آزادیٔ اظہار رائے کا راگ الاپا جاتا ہے، وہ آزادیٔ رائے کہاں ہے جسے موجودہ تمدن کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے؟ یہ مغربی تمدن کے دعویداروں کا کھلا ہوا تضاد ہے۔

یہ کہتے ہوئے تنظیم اسلامی کانفرنس کی تجویز کی مخالفت کرنا کہ اس سے آزادی

رائے کا حق سلب ہوتا ہے اور یہ اظہار رائے کے منافی ہے، اس کا مقصد صرف اسلام، مسلمان اور عربوں کی تنقید کا ایک حیلہ نکالنا ہے اور یہ اسلام اور اس کی تعلیمات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف نفرت وعداوت بغض وعناد پھیلانے کا چور دروازہ ہے، جو صلیبی جنگوں کے معاً بعد ہی کھل چکا تھا، مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا بیج بونے میں جس چیز کا سہارا لیا گیا، وہ مستشرقین اور متعصب یہود اور عیسائی قلم کاروں اور محققین کی من گھڑت اور بے بنیاد کہانیاں ہیں جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف گڑھ لی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، منصف مستشرقین نے خود اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

باوجود اس کے کہ یورپ نے علم وفن میں کافی ترقی کر لی ہے، لیکن اسلام اور پیغمبر اسلام کے تئیں اس کا نظریہ اور ذہنیت قرونِ وسطی سے چنداں مختلف نہیں ہے، حالانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام کی عظمت اور احترام کی تعلیم دیتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:۔

آمن الرسول بما أنزل إليه من ربه و المؤمنون كل آمن بالله وملائكته و كتبه ورسله لا نفرق بين أحد من رسله،[البقرة:۸۵]۔

سیدنا عیسی علیہ السلام اور موسی علیہ السلام جن کے متبعین یہود ونصاری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں (اور جنہوں نے محمد ﷺ کے نبی ہونے کی بشارت دی تھی) اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ قرآن پاک اور حدیث شریف میں بڑے ادب واحترام، نہایت عظمت اور جلالت شان کے ساتھ موجود ہے۔

جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو نشانہ بنا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنے انبیاء کی گستاخی کرتے ہیں اور اپنے اس نازیبا عمل کے ذریعہ اپنے

دین کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، اس کے ذریعہ وہ اخلاق کی ساری حدیں توڑ دیتے ہیں، بداخلاقی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟ موجودہ تہذیب وتمدن اور اس کے چاہنے والوں نے اخلاق ومعاملات کے بخیے کردئے ہیں، انسانی شرافت کی دھجیاں اڑادی ہیں، اب تو یہ کہتے ہوئے بھی ان کو عار محسوس نہیں ہوتا کہ انسان کی اصل حیوان ہے اور حیوان کے اندر خیر وشر کے مابین تمیز کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔

آزادی رائے کا یہ حسین لیبل اخلاق سوز، حیا سوز، جرائم کو قانونی شکل دینے کا ایک ذریعہ ہے، پھر نہ قدریں ہوں گی نہ اخلاق ہوں گے، نہ رہنما اصول پائے جائیں گے، نہ ضابطے ملیں گے، ملیں گے بھی تو وہی جو سیاسی قائدین نے تھوپ رکھے ہوں گے۔

آزادی رائے کی اس وقت کوئی معنویت نہیں رہتی جب حجاب پر پابندی عائد کی جاتی ہے، اور ان لوگوں پر دست درازی کی جاتی ہے جن کا عقیدہ اور نظریہ حیات مغربی نظریہ اور تصور حیات سے ٹکراتا ہے۔ جب کسی ایسے ملک پر فوج کشی کی جاتی ہے جس کا نظام ان کے نظام سے ٹکراتا ہو تو آزادیٔ رائے کا کیا مطلب؟، آزادی رائے مذہبی شعائر، مذہبی مقدسات، عبادت خانوں اور اخلاقی اور انسانی قدروں پر حملہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور انسانی معاشرہ میں جنسی بے راہ روی، اخلاقی انحراف کے فروغ کا پرکشش وسیلہ ہے۔

دنیا میں آج بھی کتنی قومیں ایسی آباد ہیں جن کی گردنوں میں غلامی کا طوق لٹکا ہوا ہے، عقیدہ کی غلامی اور گفتار وکردار کی غلامی نے ان کی زندگی کی خوشیاں چھین لی ہیں، کسی خاص جگہ کا تذکرہ نہیں بلکہ دنیا میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں انسانوں کو کسی بھی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے، کتنے ایسے لیڈر اور قائدین ہیں جو بیسوں سال سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کررہے ہیں، جیل کی سلاخوں کے پیچھے ظلمت وتاریکی میں

اپنی زندگی کے دن پورے کررہے ہیں، جہاں نہ روشنی ہے اور نہ ہی روشنی کی آس وامید، بہت سی پارٹیاں اور تنظیمیں ایسی ہیں جن پر پابندی عائد ہے، ان کو سرگرم عمل ہونے سے باز رکھا گیا ہے جس سے ان کی ساری صلاحیتیں معطل ہو کر رہ گئی ہیں۔

کتنے قائدین اور مفکرین ہیں جن کو جلاوطن کردیا گیا، وہ خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہیں اس ڈر سے کہ آزادی رائے کے دلدادہ گرفتار کرلیں گے، لیکن حیرت ہے آزادی رائے کے دعویداروں پر کہ انہوں نے ان غیر انسانی حالات سے چشم پوشی کر رکھی ہے اور وہ اس کو آزادی رائے کے خلاف بھی نہیں سمجھتے بلکہ عین مطابق گردانتے ہیں۔

آزادی رائے کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کی تابناک وشاندار تاریخ کو ملیا میٹ کرکے پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کی آگ لگا دینا ہے، اور یہ کام یورپ میں کئی صدیوں سے جاری ہے۔ جسے یورپی اہل علم وقلم، فنکار اور سیاسی لیڈران انجام دے رہے ہیں۔

یہ رخ تعمیری نہیں ہے (☆)

مختلف ملکی اور عالمی اخبارات ورسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مغرب میں اسلام سے خوف ودہشت کے ہسٹیریا نے سنگین صورت حال اختیار کرلی ہے، حالانکہ اب تک یہ خوف ذہنی، علمی اور فکری دائرہ میں محدود تھا، عالمی مغربی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے اسلام پسند ہی نہیں بلکہ عام مسلمان بھی شک کے دائرہ میں آگئے ہیں اور انہیں پورے یورپ میں ہراساں اور پریشان کیا جارہا ہے، حتی کہ انسانی زندگی کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل اسلامی تنظیموں، اداروں اور مسلم شخصیات پر مختلف بہانوں سے پابندیاں عائد کی جارہی ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہر قسم کی امداد پر بندشیں لگائی جارہی ہیں، یہ اقدامات سراسر شخصی معاملات میں مداخلت بلکہ فرد کے حقوق پر صریح ظلم ہے، اور یہ خود مغربی تہذیب کے خلاف ہے جس کی بنیاد ہی فرد کے حقوق کی حفاظت اور انسان کی شخصی زندگی میں عدم مداخلت پر ہے۔

اسلام اور مسلمانوں سے خوف ودہشت کا ہسٹیریا اتنا سنگین ہوگیا ہے کہ بعض یورپین ملکوں سے مسلمانوں کو نکالنے، مساجد کی تعمیر روکنے، مسلمانوں کے دینی اجتماعات اور جلسوں، اسلامی لٹریچر اور ان مسلم شخصیتوں کے یورپ میں داخلہ پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے جو مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور سماجی اصلاح وترقی کا کام کرتے ہیں اور ہر جگہ مسلمانوں کے نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی جارہی ہے۔

بڑے حیرت کی بات ہے کہ آج یورپ ایک بار پھر دینی عصبیت اور کلیسا کے

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رمئی ۲۰۱۰ء۔

زیر اثر آ رہا ہے، جس کا وہ پانچویں صدی عیسوی میں تلخ تجربہ کر چکا ہے، جب کلیسا نے پورے یورپ کو علم و آگہی سے کوسوں دور اندھیرے میں رکھ رکھا تھا، جس کی وجہ سے وہ صدیوں جہالت و ناخواندگی اور بربریت کی گھٹاٹوپ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا، گیارہویں صدی عیسوی میں اسلامی اندلس میں اسلامی تمدن سے واقفیت اور مسلمانوں سے براہ راست استفادہ کے بعد ہی یورپ میں علم و ہنر کی روشنی پھیلی اور بیداری آئی، لہٰذا اس کے بعد یورپ نے کلیسا اور مذہب کے خلاف بغاوت کر دی اور کلیسا و نصرانیت سے خلاصی پانے کے لئے اس نے سیکولرازم اختیار کیا، موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں یہ بات صاف عیاں ہے کہ یورپ پھر اسی کلیسا کی بالادستی کی طرف لوٹ رہا ہے اور دینی عصبیت فروغ پا رہی ہے، متشدد انتہا پسند عیسائی تنظیمیں مذہبی عصبیت کی آگ کو خوب ہوا دے رہی ہیں، حتی کہ حکومتیں ان کی انتہا پسندی کے سامنے بے بس نظر آ رہی ہیں، سوئزرلینڈ، ڈنمارک اور برطانیہ کے حالیہ واقعات اس کے شاہد ہیں، لہذا متعدد یورپین ملکوں میں مساجد اور میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اسکارف، حجاب اور داڑھی پر بین الاقوامی سطح پر پابندی لگائی جا رہی ہے حتی کہ بعض اسلامی ممالک بھی مغرب کی اندھی تقلید یا دباؤ میں اسلامی تشخصات و شعائر پر پابندی لگا رہے ہیں۔

مغربی میڈیا بڑے زور و شور سے یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ مسلمانوں میں بڑھتا ہوا دینی رجحان تہذیب حاضر کے لئے خطرہ ہے، اس گمراہ کن پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر بعض مسلم اکثریت والے ملکوں میں دعوتی عمل پر پابندی لگائی دی گئی اور دینی سرگرمیوں کے دائرہ کو محدود کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں غم و غصہ اور ان ظالمانہ اقدامات کے خلاف احتجاج و مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے بلکہ خونریز تصادم و ٹکراؤ کی نوبت آ گئی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام سے خوف اور دہشت کی اس ذہنیت نے نفسیاتی مرض کی شکل اختیار کر لی ہے، اسلام اور مسلمانوں کی توہین اور ان کے جذبات کو

ٹھیس پہونچانا اوران کے مقدسات کو پامال کرنا ایک عام سی بات ہوگئی ہے،اور اشتعال انگیز حرکتیں عام ہوتی جارہی ہیں، حتی کہ علمی مراکز اور سیاسی زندگی جواب تک اس وباء سے محفوظ تھی وہ بھی اسلام مخالف مہم کی لپیٹ میں آگئی ہے، لہٰذا یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور سیاسی میدان میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے۔

عالمی اخبارات کے مطابق کالیفورنیا یونیورسٹی میں گرلس ٹوائلٹوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اہانت آمیز اور نفرت انگیز تحریریں پائی گئی ہیں، اس کے بعد یونیورسٹی پولس نے یونیورسٹی کیمپس کے مختلف ٹوائلٹوں میں اسلام کے خلاف نفرت اور اشتعال انگیز تحریریں لکھنے اور چسپاں کرنے کا انکشاف کیا ہے، دوسری طرف فرانس میں متشدد انتہا پسند عیسائی پارٹی نے ایسے انتخابی پوسٹر لگائے ہیں جنہیں حقوق انسانی سے متعلق تنظیموں نے اسلام کی شان میں صریح گستاخی قرار دیا ہے، اور الجزائر نے اس پر احتجاج بھی کیا ہے۔ مرسیلیا کی ایک عدالت نے اپنے ایک فیصلہ میں کہا ہے کہ یہ اشتعال انگیز پوسٹر ایک مخصوص کمیونٹی کے خلاف نفرت اور عداوت کی فضا بنا رہے ہیں، اور یہ بڑی تشویش کا باعث ہیں۔

یہاں پر صرف دو مثالیں پیش کی گئیں، ورنہ ایسے سیکڑوں اہانت آمیز واقعات ہیں جن پر مغربی میڈیا نے پردہ ڈال رکھا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم بڑے زور وشور سے جاری وساری ہے، یہ رخ تعمیری نہیں ہے، بلکہ یورپین معاشرہ کے بکھراؤ کا پیش خیمہ ہے، جس کی بنیاد مذہب، عقیدہ اور نظام زندگی کے باب میں رواداری، یکجہتی اور باہمی تعاون پر ہے، یورپین تہذیب وتمدن فرد کی آزادی اور مذہبی تعصب سے دوری پر زور دیتا ہے، اگر اس بڑھتے ہوئے اسلام مخالف رجحان کو روکا نہیں گیا تو یورپ اجتماعی انتشار اور مختلف طبقات کے درمیان خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا بلکہ اس کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

یورپ میں مسلمانوں کی آبادی قابل لحاظ حد تک پہونچ گئی ہے، بلکہ بعض یورپین ملکوں میں مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں اوران کی آبادی کا تناسب روز افزوں ہے، اوران ملکوں کو اپنی بقا کے لئے ان کی ضرورت بھی ہے، لہذا وہ سیاسی قائدین جو اسلام کے خلاف نفرت پھیلا اور اسلامی خطرہ کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا طرز عمل بدلیں اور اپنا رخ تعمیری بنائیں ورنہ پورا یورپ بھیانک نسلی یا فرقہ وارانہ تشدد اور ٹکراؤ کے دلدل میں پھنس جائے گا۔ اسی طرح مسلم اکثریت والے ملکوں میں بھی دوسرے مذاہب کے ماننے والے خاصی تعداد میں رہتے ہیں، کیا بعید ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کے خلاف عالم اسلام میں ردعمل شروع ہوجائے اور غیر مسلم آبادی کے لئے مشکلات پیدا ہوجائیں، نائیجریا کا حالیہ قتل عام ایک بڑے خطرہ کی گھنٹی ہے، اور یہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان پائی جانے والی نفرت اور دشمنی کا طبعی نتیجہ ہے۔

واشنگٹن یونیورسٹی میں ادبیات اور علوم انسانیات (Anthropology) کے استاد ''جان بوین'' کہتے ہیں کہ اسلام سے یورپ کے خوف کی بنیاد غلط فہمی اور حقائق کی غلط تفسیر پر ہے، اور یورپین باشندے بآسانی اپنی مشکلات کیلئے بلی کا بکرا تلاش لیتے ہیں، چنانچہ اسلام ان کی ابتدائی مشکلات کی بلی کا بکرا بن گیا، بوین کہتے ہیں کہ

> یورپ کے اسلامائزیشن سے کوئی خطرہ نہیں ہے، کچھ مشترکہ موضوعات ہیں جن کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، اور اسلام پر تنقید کرنے والوں نے حقائق کی غلط تفسیر کر کے اسلام کے خلاف ٹکراؤ اور کشمکش کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے، بوین کے مطابق جیسا کہ سعودی اخبار ''الوطن'' نے نقل کیا ہے کہ دراصل مسلم مہاجرین یورپ کے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں، اوران مسلم مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک ہی اصل ٹکراؤ کا سبب ہے، بوین کہتے ہیں کہ اسلام سے خوف نتیجہ ہے

اس تصور کا کہ اسلام اور یورپ جدا جدا دین اور ثقافت کے حامل ہیں، اور دونوں میں بڑا فرق واختلاف ہے، اور یہ اختلاف مسلمانوں کی شرح پیدائش کے اعتبار سے بڑھتا جائے گا اور عنقریب یہ مسلمان اقتدار پر قابض ہو جائیں گے"۔

یورپ میں مسلمانوں نے افہام وتفہیم اور باہمی مفاہمت کا موقف اختیار کیا ہے اور اشاعت اسلام کا کام دوسرے ادیان ومذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری کے بغیر مثبت انداز میں کر رہے ہیں، گزشتہ عہد میں یورپ کی مذہبی رواداری کے سبب یورپ میں مسلمانوں نے مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم کئے ہیں، یہی نہیں بلکہ بعض مسلم شخصیات نے جو اپنے ملک میں مطلوب ہیں، یہاں پناہ لے رکھی ہے، سوئزرلینڈ اور برطانیہ میں ایسی بڑی تعداد ہے، امریکہ کا شعار ملک سے نکالے ہوئے یا جلاوطن کیے گئے افراد کو پناہ دینا اور تحفظ فراہم کرنا رہا ہے، اب اگر انتہا پسند اور متشدد مسیحی مذہبی عناصر غالب آ گئے تو یورپ اپنی اس شناخت اور امتیاز سے محروم ہو جائے گا۔

اس اسلام دشمنی اور عالم اسلام کے حصار کے پہلو بہ پہلو یورپ، امریکہ اور اسرائیل کے مابین دوستانہ اور تعاون کے روابط روز بروز گہرے ہوتے اور بڑھتے جا رہے ہیں، اس امریکی اور صہیونی وفاق کا اندازہ نائب امریکی صدر جو بائڈن کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں انہوں صراحتاً کہا ہے کہ: "اگر میں یہودی ہوتا تو ضرور صہیونی ہوتا"۔ بائڈن نے تل ابیب یونیورسٹی کے طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

"سابق صہیونی وزیر اعظم گولڈا مائیر مجھ پر بہت مہربان تھیں، بلکہ وہ میری ماں کی طرح تھیں، انہوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں جو حالات پیش آئے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسرائیل پڑوسی دشمن ممالک کے نرغے میں ہے، میں نے وعدہ کیا تھا کہ امریکہ میں

برسر اقتدار کوئی بھی پارٹی ہو، وہ اسرائیل کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلیگی اور اسرائیل کی ہر ممکن حمایت کرتی رہے گی''۔

حال ہی میں ایپک (AIPAC) امریکی صہیونی تنظیم نے اعلان کیا تھا کہ واشنگٹن میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کلیدی مقرر ہوں گی، ایپک نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب ہیلری کلنٹن کو باراک اوبامہ انتظامیہ میں وزارت خارجہ کا منصب سنبھالنے کے بعد صہیونی لابی کی عظیم تنظیم ایپک میں کلیدی مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا، مذکورہ کانفرنس میں سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر، امریکی کانگریس کے سینئر ارکان سینٹر چارلس شومر اور سینٹر لینڈسی گراہام بھی شریک ہوئے۔

موجودہ اسلام دشمنی مختلف بہانوں سے اسلامی دعوتی عمل پر پابندی لگانے، اسلامی تحریک اور اسلامی بیداری کو کچلنے اور دینی و اسلامی طاقت کے سوتوں کو خشک کرنے کے پیچھے کارفرما عناصر اور اسباب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس پوری مہم کے پیچھے صہیونیت ہے، جس کا یورپین حکومتوں اور وہاں کے سیاسی قائدین اور اہل فکر و دانش پر پورا کنٹرول ہے، عالمی صہیونیت نے اپنی سراغ رساں ایجنسیوں، اقتصادی اداروں اور اسلام دشمن تنظیموں کی امداد اور پشت پناہی کے ذریعہ عالم اسلام پر بھی اپنا شکنجہ مضبوط کرلیا ہے،، اس عالمی اسلام مخالف مہم کا مقصد مسلمانوں کو مختلف مسائل میں پھنسانا، ان کی وحدت وشیرازہ کو پارہ پارہ کرنا اور ان کی حکومتوں کو ایسے مسائل میں الجھانا ہے کہ ان کی ساری توانائی اسی میں صرف ہو جائے اور اسرائیل کے سامراجی منصوبوں کو روکنے کی طرف توجہ نہ ہو سکے اور اسرائیل بآسانی پورے خطہ پر قبضہ کرلے، غزہ کی ناکہ بندی وحصار اور مسجد اقصی کو گرانے کی حالیہ کوششوں میں اس صہیونی منصوبہ اور عالمی سیاست کے اثرات صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، کیا بعید ہے کہ اسلام سے جنگ اور مسلمانوں کو دہشت گردی کے مسائل میں الجھانا اسی عالمی صہیونی سیاست کا ایک جزء ہو؟۔

نئے نظام کے قیام کا نیا سامراجی منصوبہ (☆)

دنیا کا سیاسی نقشہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے، اس موجودہ منظر نامہ کو ''نظامہائے حکومت کی تبدیلی'' کا نام دے سکتے ہیں، ''نیا عالمی نظام'' (New World Order) کا نعرہ سب سے پہلے سابق امریکی صدر بش نے اپنے عہد اقتدار میں بلند کیا تھا جس کے بعد مغربی سامراج نے مختلف ملکوں میں نظام حکومت بدلنے کی کوشش کی اور اپنے موافق مہرے بٹھائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے ناپسندیدہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوتیں کرائیں۔ موجودہ وقت میں عوامی انقلاب کی طوفانی آندھیوں کا پہلا نشانہ تیونس اور پھر مصر بنا، بحرین بھی اس کی زد میں آیا، سعودی عرب کے بعض شہروں سے بھی اس طوفان بلاخیز کی لہریں ٹکرائیں، لیکن شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کی بے روزگاری اور فقر و افلاس کے خاتمہ کے لیے کیے جانے والے فیاضانہ کام سے یہ طوفان تھم گیا۔ پھر یمن و شام اس بغاوت کی زد میں آئے اور اطلاعات کے مطابق یہاں ابھی تک موجودہ نظام کے خلاف مظاہرے اور پرتشدد احتجاج جاری ہیں، مصر و تیونس میں مدت دراز سے قائم استبدادی نظام ختم ہوگیا اور موروثی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا، جو تیس سال سے کرسی اقتدار پر قابض تھے اور اپنے آپ کو مطلق العنان فرماں روا سمجھتے تھے اور اس بات کا مظاہرہ کرتے تھے کہ وہ ملک کے دستور و آئین کی بنیاد پر قوم کے منتخب نمائندے ہیں اور ہر انتخاب میں ان کی مدت اقتدار کی توسیع ہوجاتی تھی، اس طرح اقتدار میں باقی رہنے کا موقع انہیں بآسانی ہاتھ آجاتا تھا، اس

(☆) تعمیر حیات، ۲۵ رمئی ۲۰۱۱ء۔

لیے کہ ملک کے آئین میں ان کی مدت اقتدار کی توسیع وتجدید پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں، اقتدار کی بقا وتحفظ کی اس پالیسی پر کسی سیاسی ادارہ اور بین الاقوامی دستور ساز تنظیموں کو حتی کہ یورپی ممالک کو بھی کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، جن کے نزدیک اقتدار تک پہنچنے اور اسے قائم رکھنے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے، لیکن اچانک ان ملکوں میں یورپی ممالک اور خاص طور سے امریکہ کے حلیف حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب آتا ہے اور آن کی آن میں ان کی حکومت کا شیرازہ تار عنکبوت کی طرح بکھر جاتا ہے، حالانکہ ان حکمرانوں کو یورپ بلکہ امریکہ کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل تھی۔

بالآخر انقلاب و بغاوت کی اس آندھی نے لیبیا کا رخ کیا اور آج بھی وہاں انقلابیوں اور استبدادی نظام کے درمیان خونی تصادم جاری ہے، سینکڑوں جانیں اس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن رہی ہیں، اس نام نہاد عوامی انقلاب نے باقاعدہ مسلح جنگ کی شکل اختیار کرلی ہے، امریکہ، فرانس، برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک کی جانب سے ۳۵ رسال سے قائم آمرانہ نظام سے عوام الناس کی جان ومال کے تحفظ کے لیے انقلابیوں کی حمایت اور مدد کی جارہی ہے، اور ناٹو کی بمباری جاری ہے، لیکن اب تک حالات میں کسی خوشگوار تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے، باہم تبادلۂ خیال اور گفتگو کا سلسلہ تاہنوز قائم ہے، کسی معاہدہ پر ایک فریق اگر رضامندی کا اظہار کرتا ہے تو دوسرا اس سے انکار، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس انقلاب نے لیبیا میں سامراجی ممالک کو قدم جمانے کے مواقع فراہم کردئے، سامراجی ممالک کی اسی بیجا مداخلت، زبردستی کے تعاون اور ''مگرمچھ کے آنسو بہانے'' (Crocodile Tears) پر بعض حلقوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اس لیے کہ یہ پورا انقلاب درحقیقت سامراجی مقاصد کی تکمیل کا ایک نیا سامراجی منصوبہ ہے۔

عالم اسلام میں ہونے والے موجودہ انقلاب سے ۱۹۵۶ء میں مصر کا وہ انقلاب یاد آتا ہے جب مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو نیشنلائز کرنے کا قدم اٹھایا تو برطانیہ،

فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا تھا، اگر سوویت یونین کی مخالفت اور اس کی طرف سے فوری جنگ بندی کی دھمکی نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ مصر ایک مرتبہ پھر سامراجیت کے زیر نگیں آجاتا، جس کے ظالمانہ پنجوں سے بڑی قربانیوں کی بعد اس نے آزادی حاصل کی تھی، کیونکہ فضائی حملوں کے ذریعہ حملہ آور ممالک نے مصر کی حساس اور اہم جگہوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، چونکہ سوویت یونین اس وقت امریکہ کی طرح سپر پاور تھا، پوری دنیا میں اس کی سطوت و ہیبت قائم تھی، اور دوسری دنیا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ روسی صدر بلکانین نے حملہ آور ممالک کو دھمکی دی کہ ۱۲ر گھنٹہ کے اندر اپنی فوجیں مصر سے ہٹالیں، ورنہ اس کا رخ پیرس ولندن کی طرف ہوگا اور ایک نئی عالمی جنگ کی شروعات ہوگی۔ روسی صدر کی اس دھمکی کے فوراً بعد جنگ بند ہوگئی اور امریکہ نے عالمی جنگ کے خوف سے جسے ابھی ۱۰ر سال ہی ہوئے تھے، مصری سرحدوں سے فوجوں کو ہٹا لینے کی ذمہ داری لی اور جمال عبدالناصر اس سہ ملکی حملہ سے کامیاب نکلنے کے بعد ہیرو بن گئے۔

فتح حاصل کر لینے کے بعد جمال عبدالناصر نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تو ان کا بہت شاندار استقبال ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے بڑی طاقتوں کو شکست فاش دی ہو، اس لیے کہ ان سامراج مخالف ممالک میں سامراجیت کے ظلم وستم کے زخم ابھی ہرے تھے، خاص طور سے برطانوی اور فرانسیسی سامراج نے اپنے ماتحت ممالک میں ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے کہ خدا کی پناہ! ماتحت رعایا کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا، ان کے اقدار وروایات کی بخیہ دری کی، ان کی تہذیب وثقافت کے پرخچے اڑائے، ان کی روشن تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کیا، ان کے مالی ذخائر کے سوتے خشک کر دئے اور انہیں انتہائی اپاہج اور مفلس ملک بنا دیا اور جب سامراجیت کے اس ظالم شکنجہ سے انہیں رہائی ملی تو اس وقت ان کا حال یہ تھا کہ وہ دنیا کے سب سے کمزور، پسماندہ اور مفلس ملک تھے، چنانچہ جمال عبدالناصر کے اس بہادرانہ کارنامہ کو ان ممالک نے قدر کی نگاہوں سے

دیکھا، پورے عالم نے چین وسکون کا سانس لیا، ان کی فتح کو اپنی فتح سمجھا، اس لیے کہ جمال عبدالناصر نے مغربی سامراج کو مصر سے ذلیل وخوار واپس کیا تھا، جس سے ان سامراجی ممالک کی بڑی رسوائی ہوئی، اسی ذلت وشکست اور احساسِ ناکامی کا اثر تھا کہ برطانوی وزیراعظم لارڈ ایڈن نے فوراً اپنا استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔

مصر کی حفاظت چونکہ سوویت یونین کی مرہون منت تھی، اسی کی مداخلت کی وجہ سے مصر امریکی و برطانوی سامراج کے ناپاک عزائم سے بچ رہا تھا، اپنے اسی تعاون کی وجہ سے سوویت یونین تمام سامراج مخالف ممالک اور خاص طور سے مصر کا محسن بن گیا اور اسی وقت سے تمام سامراج مخالف ممالک سے اس کے تعلقات خوشگوار ہو گئے اور پھر اس کے نتیجہ میں عالم اسلام نیز عالم عربی میں اشتراکی نظریات کو برگ و بار لانے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایشیا و افریقہ اشتراکی ملک بن گئے، مصر، شام، عراق، لیبیا، الجزائر، سوڈان، یمن، صومالیہ اور دیگر ممالک میں اشتراکیت کا پورے طور پر تسلط قائم ہو گیا، اشتراکیت کا یہ قبول عام کوئی اچھی پیش رفت نہ تھی، بلکہ یہ ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ تھا، وہ سامراج سے کہیں زیادہ خطرناک اور اسلام دشمن تھی، اس لیے کہ اس کی پہلی زد اسلامی اصول وآداب اور دینی بنیادوں پر پڑتی ہے اور اشتراکیت کا ازلی حریف دراصل مذہب ہی ہے۔

عالم عرب میں نمودار ہونے والے موجودہ انقلابات سے ایک نئے خطرہ کا احساس ہوتا ہے، گذشتہ ۵۰ رسالوں میں عالم عرب میں ایسے عوامی انقلابات ظاہر ہوئے، ان میں سے اکثر نے بالآخر اشتراکی انقلاب کی شکل اختیار کر لی، وہ اشتراکی انقلاب جو یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کا دشمن ہے، جس کے نتیجہ میں مغربی یورپ اور مشرقی یورپ میں سرد جنگ چلتی رہی، لیکن ان عرب ممالک میں استبدادی سیاست کا نشانہ اسلامی تحریکات بنیں، لیکن کبھی کسی اشتراکیت مخالف ملک نے اسلامی تحریکات کا ساتھ نہ دیا، اور اسلامی تحریکات پر

ظالم حکمرانوں نے غیرانسانی و غیر قانونی پابندیاں عائد کیں، لیکن ان مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی گئی، اسلام پسندوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، سفاکیت و بربریت کا ہر طریقہ ان پر آزمایا گیا، شام میں اخوانیوں کے خلاف حافظ الاسد نے فوجی کاروائی کی اور ان پر فضائی بم باری کر کے ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن اس سب کے باوجود نہ یورپی ممالک کی جانب سے کوئی صدائے احتجاج بلند ہوئی اور نہ عالمی میڈیا میں مذمت کا کوئی بیان شائع ہوا، مصر، عراق، شام و یمن میں ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، لیکن پورا یورپ نہ صرف یہ کہ خاموش ہے بلکہ اس استبدادی سیاست کے علمبرداروں کو اس کا پورا تعاون حاصل ہے۔

فلسطینیوں پر اسرائیل کے خونچکاں مظالم، ان تک سامان رسد پہنچنے کے تمام راستوں پر فوجی پہرہ، غزہ کا اسرائیلی محاصرہ اور اس میں مصر کا تعاون اور صہیونیوں کی ناجائز و غیرانسانی کارروائیوں پر اقوام متحدہ، امریکہ اور اتحادی ممالک کی خاموشی کو آخر کیا معنی پہنائے جاسکتے ہیں؟ پھر آج ۳۰ رسال بلکہ ۵۰ رسال سے ظلم کی چکی میں پس رہے عرب عوام کے ساتھ سامراجی ممالک کی اچانک ہمدردی آخر کیوں؟ اور کہاں گیا وہ ذرائع ابلاغ جب یہ عوام فقر و افلاس کی آگ میں تپ رہے تھے، پھر آج آخر ایسی ہمدردی و بہی خواہی کس لیے؟ کیا یہ سب ان مظلوم اقوام کے جذبات کا خون کر کے سامراجی ممالک کے مقاصد کی تکمیل کا ایک نیا منصوبہ نہیں؟ اس سوال کا یقینی جواب تو آنے والا نظام اور مستقبل کے حالات ہی دے سکیں گے۔ لیبیا اور دیگر عرب ملکوں میں عوامی انقلاب کی ہمدردی اور حمایت ایک ایسے نئے نظام کی تمہید ہے جو سامراجی مفادات کا محافظ ہوگا، جن ملکوں میں حکمراں تبدیل ہوگئے ہیں، وہاں کی رپورٹیں اسی بات کی غماز ہیں اور وہاں اسلام پسندوں کو اقتدار سے الگ رکھنے کی منصوبہ بند کوششیں جارہی ہیں۔

مسلم رہنماؤں کی دانشمندی کی آزمائش (☆)

آج مسلمان دنیا بھر میں مختلف مسائل ومشکلات سے دوچار ہیں۔ ماضی میں انہیں تہذیبی تصادم اور فکری یلغار کا سامنا تھا، لیکن آج مسلمان بعض خطوں میں عسکری حملوں کا شکار ہو رہے ہیں، حتی کہ بعض ممالک حملہ آور طاقتوں کے زیر تسلط آ گئے ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی طاقت پارہ پارہ ہوگئی ہے، بے قصوروں کا ناحق خون بہہ رہا ہے اور پورا اسلامی معاشرہ داخلی انتشار اور خانہ جنگی کی دلدل میں پھنس گیا ہے، لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے ہیں۔ جبکہ بعض دوسرے مسلم ملک ہمہ وقت اسی نوعیت کے عسکری حملوں کے خطرات کے سائے میں جی رہے ہیں۔

حالیہ سالوں میں بعض اسلامی ممالک میں بھاری جانی و مالی نقصان کے بعد بڑے پیمانے پر انقلابات رونما ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کا انتظامی ڈھانچہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اب بھی وہاں حالات بدستور کشیدہ ہیں۔ وہاں جاری سیاسی اتھل پتھل سے بھی صرف نظر ممکن نہیں۔ بعض ممالک میں حالات اور بھی دگرگوں ہوتے نظر آ رہے ہیں حتی کہ وہاں عوام اور حکومت وقت کے درمیان مقابلہ آرائی کا بدترین منظر دیکھنے کو مل رہا ہے۔

مغربی ممالک کے موقف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مفاد اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ وہاں ہمہ وقت خون خرابہ کا ماحول گرم رہے، تاکہ مسلمانوں کی رہی سہی طاقت بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے اور ان کے اتحاد کا شیرازہ تسبیح کے دانوں کی طرح

(☆) سہ روزہ دعوت، ۲۵ر نومبر ۲۰۱۱ء۔

بکھر جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربی طاقتوں کے پاس بس یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ اسلامی بیداری اور عام مسلمان کے اندر پیدا ہونے والے جذبۂ خودی اس لہر کو روک سکنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو پوری دنیا کے مسلمانوں میں تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور اسی واحد طریقہ سے وہ اپنے اس احساس ناکامی کے داغ کو بھی دھو سکتے ہیں جو ان کے اندر عالم اسلام کے خلاف تہذیبی، ثقافتی اور عسکری جنگوں کے بے نتیجہ نکلنے کے سبب پیدا ہوا اور اسی طرح وہ اپنے ان سیاسی ایجنڈوں اور طور طریقوں کے خلاف ابھرتی ہوئی بے اعتمادی کی فضا کو بھی ختم کر سکتے ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے عالم اسلام پر اپنا تسلط ان قائدین اور نام نہاد دانشوروں کو آلہ کار بنا کر حاصل کیا تھا جو انہی کے ماحول میں پلے بڑھے تھے اور انہی کے تربیتی مراکز اور تربیتی اداروں کے تربیت یافتہ تھے۔ خاص کر ان فوجی حاکموں کے ذریعہ جنہوں نے سابقہ صدی کی پچاسویں دہائی کے انقلابات کے بعد زمام حکومت سنبھالی تھی۔

ایک طرف عالم اسلام میں تیزی کے ساتھ اسلامی بیداری آ رہی ہے اور عام آدمی کے اندر خود شناسی کا جذبہ موجزن ہے اور دوسری طرف مسلم سیاسی قائدین، مفکرین اور علماء جن پر مغربی ممالک کی قیادت کو بے حد اعتماد تھا اور جو انہیں تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے توسط سے حکومت تک پہنچنے میں ہر ممکن مدد دیتے تھے اور سیاسی واقتصادی حیثیت سے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتے رہتے تھے، ان کے تئیں مسلمان عوام میں بے اعتمادی کی فضا دن بدن بڑھ رہی ہے بلکہ ان کے خلاف بعض ممالک میں منظّم احتجاج بھی رونما ہو رہے ہیں۔ یہ تمام صورت حال مغربی لیڈر شپ کے لیے کسی بڑے خطرہ کے پیش خیمہ سے کم نہیں ہے اور عالم اسلام میں ان کے مفادات کو زبردست دھچکا لگنے کے قوی تر امکانات کا پتہ دیتی ہے۔

مغربی یلغار کے خطرے کے شدید تر احساس نے عالم اسلام میں بہت سی

تحریکات اور تنظیموں کو وجود بخشا اور اخیر زمانے میں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں کانفرنس وسمپوزیم کا انعقاد ہوا۔ جس میں لوگوں کو اسلام کی طرف رجوع ہونے کی دعوت دی گئی اور شعبۂ تعلیم سے لے کر شعبۂ اقتصاد تک زندگی کے ہر گوشہ میں اسلامی طور طریقوں کو اپنانے کی ترغیب دی گئی۔ مختلف عملی میدانوں میں تجربات کیے گئے، جو پورے طور پر کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ مثلاً اسلام کے اقتصادی نظام کو لیجئے جس نے نہ صرف اپنی منفعت کا لوہا منوایا ہے، بلکہ ایک ایسے اقتصادی اور معاشی بحران کے دور میں جبکہ پورا یورپ اور وہ ممالک جن کے بازار کا سارا انحصار یورپ پر ہے، اس کی لپیٹ میں ہیں، اسلام کے اقتصادی نظام نے خود کو اس مسئلہ کا مستقل حل ثابت کیا۔ چنانچہ انٹرنیشنل یورپی بینکوں میں اسلامی معاشیات کا مستقل شعبہ کھولا گیا اور نصاب تعلیم میں اسلامی اقتصاد کے موضوع کو شامل کیا گیا۔

اسی طرح اسلام کی طرف لوگوں کا بڑھتا ہوا رجحان اور مغربی ممالک میں مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ، بعض یورپی حکومتوں کا اپنی تعلیم گاہوں میں اسلامی تعلیمات کی تدریس کی اجازت دینا، کام کاج کی جگہوں میں ادائیگیِ نماز کے لیے سہولیات کی فراہمی، مسلمانوں کا اپنے دین سے جذباتی لگاؤ اور صوم وصلاۃ کا اہتمام بمقابلہ ان مسیحیوں کے جو اپنے کلیسا سے منحرف نظر آرہے ہیں اور عیسائیت سے ان کی بے توجہی اور بے اعتنائی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ سب بھی اپنے آپ میں قابل غور امر ہے۔

یورپ کے دانشوروں اور دیگر واقف کار حلقوں نے مسلم دنیا میں تبدیلی کی اس لہر کو اسلامی بیداری، آزادی کے تئیں مسلمانوں کی کوشش اور خود اعتمادی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے علمی، ثقافتی، سیاسی حتی کہ اب اقتصادی میدانوں میں بھی بعض ایسے طریقے اختیار کیے ہیں جن کے ذریعے مسلمانوں کی توجہ اسلام سے ہٹائی جاسکے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خود کفیل بننے اور مغربی ممالک پر تکیہ کرنے کی مجبوری

کے حصار سے آزاد ہونے کی ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں اور ان کو ان تمام کاوشوں سے بھی باز رکھا جاسکے جو مغرب کے نام نہاد مساوی تہذیب و ثقافت اور استعماری سازشوں کا پردہ فاش کرسکتی ہیں۔

مسلمانوں کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی غرض سے اسی طرح مسلسل سازش، پلاننگ اور منصوبہ بندی کے ذریعہ مسلم سوسائٹی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی امت مسلمہ کے درمیان انارکی اور باہم تصادم کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ متصادم گروہوں کو اسلحہ جات اور مادی وسائل فراہم کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عراق اور کویت، عراق اور ایران کے درمیان خوں آشام جنگ کے دوران دیکھا گیا۔ اسی طرح اخیر کے ان پرآشوب حالات کے دوران دیکھا گیا جو بیشتر عرب ممالک میں رونما ہوئے۔

افریقی ممالک میں بھی اسی طرح مسلح تصادم کی بھیانک صورتحال پیدا ہوئی جہاں متصادم گروہوں کو یورپی ممالک سے بڑی مقدار میں عسکری اور مالی امداد حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں اس طرح کے باہمی تصادم اور نزاع کی صورت پیدا کرنے کے علاوہ ان کی بعض اشتعال انگیز حرکتوں کی حوصلہ افزائی کرکے ان میں ردعمل کی نفسیات پیدا کی جاتی ہیں جو آگے چل کر انہیں کسی متشددانہ کارروائی پر آمادہ کردیتی ہیں۔ اور پھر ردعمل کے طور پر کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوتا ہے تو اسکو مزید ہوا دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ان کے سر 'تشدد پسند' اور 'دہشت گرد' ہونے کا الزام بہ آسانی لگایا جاسکے۔

انتشار اور انارکی کو بڑھاوا دینے کی کوششوں کے پس پردہ ساری دنیا میں ہونے والے وہ خودکش بم دھماکے بھی بڑا اہم کردار نبھاتے ہیں جن کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مسلمان قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ بعض مقامات پر کی گئی غیر جانبدارانہ تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان تخریبی کارروائیوں میں جس طرح کا مواد اور سامان

استعمال کیا گیا تھا، وہ سب باہر کے تیار کردہ تھے اور ان کو تیار کرنے میں تکنیکی اور فنی مہارت کے علاوہ خطیر مالی وسائل بھی درکار تھے، چنانچہ جس مسلم سوسائٹی پر ان کا الزام لگایا جاتا ہے، وہ کبھی ان اخراجات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی، بطور خاص ایک ایسے وقت میں جب وہ خود جہالت، غربت اور پچھڑے پن کی شکار ہے۔

ماہرین کی رپورٹ نے ان حقائق کو ثابت کر کے دکھایا ہے حتی کہ بعض بم دھماکے جو خود امریکہ میں ہوئے ہیں، اور جس نے امریکہ کے سابق صدر کو افغانستان اور عراق کو زیر کرنے کے سلسلے میں حق بجانب ٹھہرایا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کو تباہ و برباد کرنے کا مجاز قرار دیا تھا، وہ اس وقت بھی بعض واقف کار حلقوں کے نزدیک شک کے دائرے میں تھے۔ لیکن مغربی میڈیا دنیا بھر میں ہوئے دہشت گردانہ کارروائیوں کا ذمہ دار صرف مسلمانوں کو ٹھہرانے پر مصر رہی، اور انہیں ہر طرح سے بدنام کیا جاتا رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی دہشت گردی کے نام سے موسوم کیے جانے والی ان کارروائیوں کا ان ممالک پر بھی بہت برا اثر پڑا جو امریکہ اور یورپی ممالک کے زیر نگیں ہیں۔

یہاں ہمارے ملک ہندوستان میں دہشت گردی کے حوالے سے اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے وہ اِس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ یہاں بعض بم دھماکوں کی آزادانہ تحقیقات کرائی گئی ہیں جن میں اجنبی ہاتھوں اور غیر اسلامی تحریکات کا ہاتھ پایا گیا ہے۔ لیکن گرفتاری ان کی عمل میں آئی جو اس معاملے میں متہم اور ملزم ٹھہرائے گئے تھے۔ اس طرح مسلمان ہر جگہ معاندانہ رویے کی وجہ سے شک وشبہ کے دائرہ میں ہیں۔ ہر تشدد پسند واقعہ کے فوراً بعد اس کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے اور الزام ثابت کیے بغیر ہی مسلم جوانوں کو سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جاتا ہے۔

مغربی میڈیا کے اس پروپیگنڈہ کا دوسرا شکار جاپان ہوا ہے۔ وہاں مسلمان پرامن ماحول میں جی رہے تھے اور وہ جاپانیوں کے ساتھ باہم شیر وشکر تھے۔ لیکن

امریکہ کے دباؤ پر وہاں کے حالات بھی بدل گئے اور مسلمانوں کے تئیں وہاں کی حکومت کا رویہ بھی بدل گیا۔ وہاں اشتعال انگیز حرکتوں کے طور پر کتابیں، لٹریچر اور نصابی کتابوں میں ایسی متنازع تحریریں شامل کردی گئی ہیں جن کا منشا اہانت رسولؐ ہے یا ان کی مقدس کتاب کی توہین ہے یا پھر اسلامی شخصیات کے تشخص کو مجروح کرنا مقصد ہے، اس طرح کی حرکتوں سے مسلمانوں کے جذبات سے کھیل کر ان میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسلمان پرامن طور پر سہی، سڑکوں پر احتجاج اور اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں تو پولس زیادتی کرتی ہے یا اسلام مخالف تحریکوں کے ارکان کی ظلم و زیادتی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بسا اوقات یہ معاملے فرقہ وارانہ فساد اور بڑے گروہی تصادم کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حالیہ دنوں میں ملک (ہندوستان) کے مختلف مقامات پر مذہبی منافرت اور گروہی تصادم کے واقعات پیش آئے ہیں۔ اس دوران مسلمانوں کے غیض وغضب کو بھڑکانے کے لیے مقدس کتاب قرآن پاک کی توہین کی گئی۔ عبادت گاہوں کے تقدس کو پامال کیا گیا، ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، آندھرا پردیش، راجستھان، اتراکھنڈ، مہاراشٹر اور اتر پردیش اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

نفرت انگیز علمی وغیر علمی مواد اور ملبوسات بھی انہیں چیزوں کی فہرست میں آتے ہیں جن کے سہارے وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں ردعمل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ عمل پوری دنیا میں عام ہے۔ اس طرح کے عوامل انتشار اور انارکی کو موقع بموقع ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے غضب کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

اس طرح کے حادثات وواقعات یورپی ممالک میں واقع ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ ڈنمارک، ہالینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں پیش آئے ہیں۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ ممالک بھی جو مغرب کے تہہ دست ہیں اب وہ بھی اسی راہ پر چلنے

لگے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ سیاست شروع کر چکے ہیں۔ مسلمانوں، ان کے تعلیمی اداروں اور یورپ میں مقیم مسلم جوانوں پر مسلسل حملے ہو رہے ہیں، نقاب، داڑھی اور مسجدوں کے مناروں اور ان کی تعمیر تک پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن سے وہاں کے مسلمان دوچار تھے، جہاں تک ان کتابوں اور لٹریچر کا تعلق ہے جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کی گئی ہے اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، یورپی معاشرہ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ان کا معمول ہے۔ اس طرح کی اشتعال انگیز حرکتوں کے لیے مستشرقین اس کا اصل سرچشمہ مانے جاتے رہے ہیں۔

اس وقت مسلمان پوری دنیا میں اس طرح کے معاندانہ موقف اور اشتعال انگیز رویوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ سخت نفسیاتی بے چینی اور ذہنی کوفت کے ہولناک انجام اور غیرت وحمیت اور صبر وتحمل کی آزمائش کے مشکل ترین وقت سے گزر رہے ہیں۔ درپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تحریر وتقریر اور بیانات میں حکمت ومصلحت کے طور وطریقے اختیار کرنے کی زبردست آزمائش میں مبتلا ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اسلام نے مسلمانوں کو صبر کرنا سکھایا ہے اور ناگوار چیزوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور عدم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ لیکن وہ سوال جس کا جواب دینے میں عقل حیران ہے، یہ ہے کہ مغربی قائدین اور دانشور طبقہ جو اس بات کی دہائی دیتا ہے کہ جس زمانے میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ مذہب وعقیدہ کی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی (جس کے پیچھے دشمنانِ اسلام اپنا مکروہ چہرہ چھپائے ہوئے ہیں) نیز تمام مذاہب وادیان کا پاس ولحاظ اور ان میں عدم مداخلت کا دور ہے۔ ان کی اس بات میں کہاں تک سچائی ہے۔ خود ان کے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے حق میں شاید یہ دَور کچھ ایسی ہی صفات کا حامل ہو، تاہم حقیقت یہ ہے کہ

مسلمانوں کیلئے دوہرے معیار اور دہرے اقدار متعین ہیں۔ مسلمان حقیقی معنوں میں اُس آزادی سے محروم ہیں جس کا تذکرہ مغربی قائدین اپنی تقریروں میں اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں اور جو کچھ ان کے ملکی قانون میں لکھا ہوا ہے۔ مسلمانوں نے تو جب بھی اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور اپنی آزادی رائے کے حق کا استعمال کرنا چاہا ہے تو ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں اور انہیں ایسا کرنے کا سخت نتیجہ بھگتنا پڑا ہے، خواہ معاملہ ان کے اپنے دین کے دفاع کا ہو یا عقیدہ کے تحفظ کا۔

مغربی میڈیا نے ہر جگہ مسلمانوں کی مشکلات کو بڑھاوا دیا ہے۔ اور ان ذرائع ابلاغ نے بھی جو دوسرے ممالک میں معتبر مانے جاتے ہیں، لیکن تشدد پسند حرکتوں کے لیے مسلمانوں کو متہم ٹھہرانے اور ان کے اندر ردعمل کی نفسیات کو بڑھاوا دینے میں بڑے چست ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ان کے عائلی اور انفرادی مسائل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور جب معاملہ بگڑتا ہے تو اس واقعہ کو بار بار پیش کرتے ہے۔ لیکن جب مسلمان خود منظّم اور مسلسل ظلم و زیادتی کے شکار ہوتے ہیں، اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہیں تو اس موقع پر غائب ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ کثیر الجہات اور متنوع حالات ہیں جو پوری دنیا میں عام ہیں یہ تقاضہ کرتے ہیں کہ مسلم رہنما ان تمام مسائل اور حالات کا بغور جائزہ لیں اور حکمت و مصلحت اور دانشمندی کے ساتھ ان کا حل تلاش کریں۔ اس ضمن میں دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت اور میڈیا جیسے ذرائع و وسائل کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً حالات کو سمجھنے بوجھنے کے لیے افہام و تفہیم اور گہری سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

مغربی تعبیرات واصطلاحات

تاریخی حقائق وپس منظر (☆)

مغرب کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن میں کچھ تعبیرات گھر کر گئی ہیں، مغربی مفکرین اور اسکالرس نے یہ تعبیرات وضع کی تھیں تاکہ اس سے اپنے تصورات کا اظہار کرکے اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لاسکیں، آج ان تعبیرات کا استعمال کرکے اپنے منصوبوں کو پوری دنیا میں بروئے کار لانا چاہتے ہیں، پوری دنیا ان کا عام نشانہ ہے، ورنہ عالم اسلام اور خصوصاً عالم عربی ان کے نشانے پر ہے، ان میں خاص طور سے وہ ممالک جو یورپی ممالک کے قرب وجوار میں ہونے کے سبب، مغربی افکار ونظریات، تہذیب وتمدن کے سامنے سرنگوں اور ان کے زیر اثر آچکے تھے، جیسے مصر، شام وغیرہ، اور اس وجہ سے بھی کہ یورپی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ یہاں زیادہ تھے، خاص طور سے فرانس اور جرمنی سے پڑھ کر گئے تھے، ان طلباء نے وہاں کے صاحب علم وکمال اور ماہرین علوم وفنون سے علمی استفادہ کیا تھا، حصول علم کے بعد جب وہ اپنے ملک واپس لوٹے تو اپنے ساتھ وہاں کی تہذیب وثقافت، رہن سہن، وہاں کی طرز حیات اور بود وباش سے متاثر ہوکر جو کچھ ان کی آنکھوں نے وہاں دیکھا اور کانوں نے سنا تھا، سب ساتھ لائے، وہاں کی تہذیب ان کی گھٹی میں پڑ چکی تھی، پھر مغرب کے اہل علم وماہرین نے ان اسلامی ممالک میں تدریس کی غرض سے قدم رکھا، جہاں تعلیمی ادارے قائم تھے،

(☆) سہ روزہ دعوت دہلی، ۴ر فروری ۲۰۱۲ء۔

اس وقت یہ اسلامی ممالک عسکری حملوں، فتنوں اور اقتصادی بحران کا شکار ہونے کے سبب زخم خوردہ تھے، چونکہ حکمراں ملک کو درپیش خانگی مسائل اور مشکلات کا مناسب حل پیش کرنے میں ناکام رہے تھے، یہ حضرات جو یورپی ممالک سے وطن واپس آئے تھے، سمجھا کہ یورپ ہی بیداری کی اصل اور اس کا سرچشمہ ہے، حالانکہ وہ یورپی ممالک جو اب خوش حال اور ترقی پذیر تھے، ان پر ایک زمانہ تک فقر و جہالت اور جنگ و جدال کا ایک مہیب سایہ چھایا رہا تھا، غرض ان لوگوں نے مغرب کی مادی ترقی اور چکا چوند سے مرعوب ہو کر پھر مغرب کا رخ کر لیا، ان کے ذہن سے خود ان کی تاریخ محو ہو چکی تھی کہ مشرق و مغرب کے درمیان کیا فرق ہے؟ وہ اس بات سے بالکل ناآشنا تھے کہ آج وہ مغرب میں جو چمک دمک دیکھ رہے ہیں، ماضی میں اس کی حالت اس کے برعکس تھی، ماضی میں یورپ میں بیداری آنے سے پہلے، مختلف پسماندہ یورپی ممالک کے مفکرین قرون وسطی میں خود کو پسماندہ اور مفلوک الحال تصور کرتے تھے، جہالت، فتنے اور جنگوں نے انکے دل و دماغ کو دیوالیہ کر دیا تھا، ان کے احساس و شعور کی کایا پلٹ دی تھی، بعض جنگیں سو سو سال تک جاری رہیں اور بعض تیس تیس سال تک، خون خرابہ روز کا معمول بن چکا تھا، ملکی جائدادوں اور تاریخی ورثوں کی لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔

امریکہ ہوش کے ناخن لینے سے پہلے کیسا تھا؟ فرانس میں انقلاب آنے سے پہلے صورتحال کیا تھی؟ اہل کلیسا کے ہاتھوں برطانیہ کی باگ ڈور ہونے سے قبل اس کی حالت کیا تھی؟ اسی طرح جرمنی اور آسٹریلیا میں حالات کیا تھے؟ ظالم و جابر حکمراں کس طرح نہتے عوام کے ساتھ جبر و قہر کا معاملہ کرتے تھے؟ طلباء کے ساتھ کس طرح ناروا سلوک ہوتا تھا اور انہیں دبا کر رکھا جاتا تھا؟

تاریخ نویسوں نے واقعہ نقل کیا ہے کہ جرمنی کے قائد نے فرانسیسی حکمراں کو مشرق کا رخ کر کے مصر کو زیر کرنے کی صلاح دی تاکہ یورپی ممالک سے اس کی توجہ کو ہٹایا جا سکے،

خصوصاً جرمنی سے، اس طرح مغرب سے حملہ آور مشرق کا رخ کرنے لگے، مغرب کے حملہ آوروں کا مشرق میں داخلہ شروع ہوا اور اسے وہ داخلی کشمکش کا حل سمجھتے تھے۔

''قرون وسطیٰ'' (Middle Ages) ایک ایسا زمانہ تھا، جس میں یورپ علم وفن، تہذیب وتمدن اور ثقافت کے اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھا، جہالت کی تاریکی کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے برعکس دنیائے اسلام اس دور میں علم وفن اور تہذیب وثقافت کا مرکز جانا جاتا تھا، بحث وتحقیق، اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی میں اپنی مثال آپ تھا، اس دور میں برصغر ہند اور پڑوسی ممالک ایک ہی حکمراں کے تحت آتے تھے، اس حکمراں کا ایک رعب ودبدبہ تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ برطانیہ کا ایک وفد ہندوستان آیا، شاہ جہاں سے ملنے کی خواہش کی اور دیر تک انتظار کیا، اس کے باوجود ملاقات نہ ہوسکی، دوسرے عثمانی بادشاہ سلیم، سلیمان اور مراد بھی ایسے ہی بارعب تھے جن سے پورا یورپ تھراتا تھا، جو خطوط یورپی حکام نے ان مسلم سلاطین کے نام لکھے ہیں، ان میں مسلم سلاطین کے جس مقام ومرتبہ اور جاہ جلال کا اعتراف کیا ہے، وہ خطوط تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ایک مغربی مورخ لکھتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسویں میں جب مغرب کے بعض اشخاص بلند مقام ومرتبہ اور بلند اخلاق کے مالک تھے، وہ اپنی جہالت اور ناخواندگی پر فخر کرتے تھے، اہل اندلس کی قرطبہ میں ایک لائبریری تھی، جس میں کتابوں کے ۶۰ ہزار قلمی نسخے موجود تھے، اس دور میں فرانس، جرمنی اور اٹلی کے اندر کہیں کوئی کتاب کا پتہ چلتا تو وہ نہایت اچھوتی اور نادر کتاب مانی جاتی تھی، یہ کوئی بارہویں صدی کا زمانہ تھا، اندلس کے اندر تقریباً ۷۰ لائبریریاں تھیں، جن میں بڑی اہم اور قیمتی کتابیں تھیں، ڈوزی لکھتا ہے: لوگ جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں بھٹک رہے تھے، علم کی روشنی سے بالکل ناآشنا اور بے بہرہ تھے۔

علم کی روشنی ان تک امت مسلمہ کے ذریعے پہنچی تھی، علوم وفنون، فلسفہ اور دست کاری ودیگر ہنرمندی غیرہ ان سے سیکھی تھی، بغداد، بصرہ، سمرقند، دمشق، قیروان، فارس، غرناطہ اور قرطبہ علوم وفنون کے مراکز تھے، یورپ کا دارالسلطنت جس سے آج ہم سب مرعوب ہیں، ایک گاؤں سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں تھی، نہ تو وہاں علم کی رمق تھی اور نہ قابل لحاظ آبادی، مادی اور ادبی پہل سے پوری طرح پسماندہ تھا، اس کے برخلاف دارالسلام میں کوئی مدرسہ، جامعہ، شہر اور گھر ایسا نہیں تھا جہاں کتابوں کا انبار نہ ہو اور مطالعہ کا ذوب وشوق نہ پایا جاتا ہو۔

''قرون وسطی'' تعبیر کا استعمال پسماندگی، جہالت اور پچھڑے پن کو ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، مسلم اہل قلم خود اس تعبیر کا استعمال کررہے ہیں جو اپنی تاریخ اور یورپ کی تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اس تعبیر کا استعمال کم مائیگی، بے چارگی اور جہالت ونادانی کے معنی میں کرتے ہیں، لیکن اس تعبیر میں مشرق ومغرب کے درمیان تفریق کا جوراز پنہاں ہے، اس کا خیال نہیں رکھتے۔

اہل قلم کا حق بنتا ہے کہ اس تعبیر کا استعمال کرتے وقت اس فرق کو واضح کریں تاکہ جو لوگ ان تاریخی حقائق سے ناواقف ہیں، ان پر یہ حقیقت کھل سکے، یہ فرق ایک دوسری تعبیر سے بھی واضح ہے، مصنفین اس تعبیر کا بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے پس پردہ حقائق بیان نہیں کرتے، وہ تعبیر ہے ''النہضہ'' جس کے معنی ''بیداری'' (Renaissance) کے ہیں، یہ مغربی تعبیر ہے، اہل کلیسا کے ظلم واستبداد کے تحت انہی صدیوں تاریکی میں رہنا پڑا تھا، ان پر علم وادب کا دروازہ بند کردیا گیا تھا اور آسائش زندگی بڑھادی گئی تھی، جب ان کے لیے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں علم کا دروازہ کھول دیا گیا اور مسلم ممالک کے اندر جہاں مدارس ومکاتب اور دانش گاہوں کا جال پھیلا ہوا تھا، ترقی وہاں عروج پر تھی، یورپ سے آنے والا

ہر زائر یہاں کی چکا چوند دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا اور اس کے حیرت واستعجاب کی انتہا نہ ہوتی۔

صلیبی جنگ کے دوران یورپ نے مسلمانوں کے علمی سرمایہ سے خوب استفادہ کیا، یہ کوئی تیرہویں اور چودہویں صدی کا زمانہ تھا، اس دور کو اس نے اپنے لیے ''روشن دور'' سے (Enlightenment Age) تعبیر کیا ہے، ان علمی کوششوں کا ثمرہ سولہویں صدی میں ظاہر ہوا، اس زمانہ کو ان لوگوں نے روشنی کے دور سے تعبیر کیا ہے، چونکہ ان سے جہالت کی تاریکی دور ہوئی تھی، جس کا سایہ ایک زمانہ تک ان پر چھایا رہا تھا، اس طرح وہاں علماء، محققین اور فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے ان کے مسائل کی گتھیاں سلجھائیں، انہی علمی کوششوں اور فکری جدوجہد کے طفیل میں وہاں بیداری اور انقلاب نے دستک دی جسے وہ بیداری (نہضہ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

''قرون وسطی'' کی طرح ہی ''نہضۃ'' (بیداری) کی تعبیر ہے، جس کا استعمال اہل قلم حضرات اس بیداری کے پیچھے پوشدہ عوامل کو ظاہر کیے بغیر استعمال کرتے ہیں، عالم اسلام میں نہضہ کا کیا کردار رہا ہے؟ عالم اسلام میں بیداری کس طرح آئی؟ اس بارے میں یوروپی مصنفین سے متاثر اہل قلم حضرات بتاتے ہیں کہ مصر پر جب نپولین نے حملہ کیا اور اسے زیر کیا تو یورپ کے مشرق اسلامی میں مداخلت کی یہ پہلی کوشش تھی یا یہ نقطہ آغاز تھا جیسے کہ مصر اور ہندوستان۔ اسلامی ممالک کو فوجی یلغار کا سامنا کرنا پڑا جو بعد میں چل کر ''علمی وفکری یلغار'' میں تبدیل ہوگیا، آگے چل کر کچھ ممالک عسکری حملوں کی زد میں آگئے، چنانچہ وہاں مغربی تعلیمی، ثقافتی اور اقتصادی اداروں کا دبدبہ بڑھ گیا۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں مغربی ادارے کھل گئے، خلافت عثمانیہ کے زمانے میں یہاں کے کئی شہروں میں مشنری اداروں کا جال بچھ گیا اور یہ بیداری (نہضہ) دراصل فکر وعقائد کے مغایر اور ایمان وعقیدہ پر ایک قسم کا ڈاکہ تھا۔ اس نہضہ

کے زیر سایہ مغرب زدہ نسل کی ایک کھیپ تیار ہوئی، اس کی طرف ایک مغربی مفکر لارڈ کرومر نے اشارہ کیا ہے: مصری سماج میں تبدیلی اور اس تیز ترقی کا نتیجہ تھا کہ انہی افراد میں سے ایک ایسی جماعت مل گئی جو مسلمان تو تھے، لیکن انکا اندرون عقیدہ اسلامی اور خصائص اسلام سے خالی ہو چکا تھا، مصری جو مغرب سے بری طرح متاثر تھے، نام ان کا اسلامی ہوا کرتا تھا لیکن وہ حقیقت میں ملحد اور شکی مزاج مسلمان تھے، ان کے اور ازہری علماء کے درمیان ایک قسم کا خلیج تھا، ازہری علماء اور یورپی علماء کے درمیان سے یہ دوری ختم نہ ہو سکی۔

یہی نوجوان نسل نے بہت سے اسلامی ممالک میں اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی، مثلاً مصر، شام اور عراق وغیرہ میں، ان مغربی اداروں کے پروردہ، اور تربیت یافتہ طلباء برابر حکومت میں اپنی جگہ بناتے رہے، چنانچہ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ ظلم واستبداد کا معاملہ کرتے، یورپی ممالک اس پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے، چونکہ ان کی پشت پناہی حاصل تھی اور حکومت میں ان کی جگہ کی برقراری کا بھروسا دلایا جاتا، اس طرح سے ان کی سیاست چلتی تھی، جب پچاس کی دہائی یا اس کے بعد انقلاب آیا، جن لوگوں نے اس دوران حکومت سنبھالی، وہ بھی اسی فکر وخیال کے حامل تھے۔

عالم اسلام میں بیداری کا جو طوفان کھڑا ہوا تھا، اس کا مقصد عالم اسلام کو مغربی سیادت وقیادت اور اس کی نام نہاد تہذیب کے سامنے گھٹنے ٹکنے پر مجبور کرنا تھا، یا وہ اپنی بیمار تہذیب کو عالم اسلام پر زبردستی تھوپنا چاہتے تھے، تاکہ دنیائے اسلام اس کے زیر اثر آجائے، مشرق ومغرب دونوں ہی کیمپوں کا اصل ہدف ونشانہ اسلام تھا، ان کی لڑائی اسلامی شخصیات سے تھی، ان کی منشا مغربی افکار ونظریات، الحادی ومادی نظریۂ فکر کو تھوپنا تھا۔

ان فریب کن تعبیرات کے ذریعے پروپیگنڈہ جو مغرب میں نویں لوئس کے

اشارے پر شروع ہوا تھا، اسے پھر سے زندہ کیا اور ''روجر بیکن'' و ''رامولل'' نے نافذ کیا جو کہ اصل میں نصرانی تھا، اہل قلم حقیقی معنی اور لفظی مفہوم کے درمیان تفریق کیے بغیر استعمال کرتے ہیں، اس سے ذہن اس غیر انسانی طریقۂ کار کی طرف نہیں جاتا جس کا نصرانی استعمال کرتے ہیں اور جس بات کا خود ان کے پوپ اعلان کرتے ہیں، اسی طرح سوشل میڈیا ورکس اور انسانی خدمات ہیں، لوگوں کے ساتھ بھلائی اور تعاون کا معاملہ ہے، چنانچہ یہ پہلو بھی مغربی استعماری طاقتوں کے ذاتی مفاد سے وابستہ ہے۔

ان فریب کن تعبیرات میں استشراق بھی آتا ہے، چنانچہ اب وقت آگیا ہے کہ استشراق کے دعووں اور ان کے اہداف کا مطالعہ کیا جائے، ان کے پس پردہ مقاصد کا جائزہ لیا جائے اور محققین وحاقدین کے درمیان تمیز قائم کی جائے، تاہم اب ان تعبیرات کے پس پردہ راز سے پردہ اٹھ چکا ہے اور مغربی استعماری طاقتوں کا اصل چہرہ سب پر واضح ہو چکا ہے۔ اس کی تمدن کی اصلیت کا بھی پتہ چل گیا ہے اور بالآخر اس کی سیاست بھی آشکارا ہو چکی ہے جس کا تجربہ امریکہ کر رہا ہے اور اس کے اتحادی ممالک گزشتہ دس برسوں کے دوران کرتے آئے ہیں۔ اب امریکہ عالم اسلام کے مسائل ختم کرنے کی سیاست کا ناٹک کھیل رہا ہے، اس کا اصل مقصد وہ انقلاب ہے، جو عالم عربی میں جاری ہے، ساتھ ہی اس کا مقصد ان انقلابات سے دوچار کر کے اسلامی تحریکوں کو ختم کرنا ہے، اس کا اصل نشانہ فلسطین ہے جس کو ختم کرنا چاہتا ہے، جس کے متعلق ایک جانب سے اس کی تائید ہو رہی ہے اور دوسری جانب سے مخالفت، دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ جنگ اسلام سے نہیں، بلکہ القاعدہ اور دہشت گردی سے ہے، حالانکہ اس معاملے پر سے پردہ اٹھ چکا ہے کہ یہ جنگ دراصل اسلام سے ہے۔

فکروفن کے ذریعہ اسلام پر حملہ (☆)

ایک بیہودہ شخص کا ایک بیہودہ فلم بنانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کوئی پہلا واقعہ نہیں، گستاخی کی یہ مذموم کوششیں پہلے بھی کی جاچکی ہیں اور شائد آئندہ بھی ہوتی رہیں، وہ ذات جس کو اللہ تعالی نے رحمۃ للعالمین کا خطاب عطا فرمایا ہو اور جس کی رحمۃ للعالمینی کا اعتراف اپنوں ہی نہیں؛ دشمنوں تک نے کیا ہو، جس ذات کو منکرین رسالت نے ''الصادق الامین'' کے لقب سے پکارا ہو، عدل وانصاف کے لیے جس کا دروازہ دوست ودشمن دونوں کے لیے یکساں کھلا رہتا ہو، حضرت عیسی اور حضرت موسی علیہما السلام نے جس کی بعثت کی بشارت دی ہو، توریت وانجیل نے جس پر ایمان لانے کی تلقین کی ہو اور اس دور کے ایک معتبر ومعروف عیسائی قلمکار نے سو منتخب ترین لوگوں کی فہرست میں جس ذات گرامی کو سب سے اوپر جگہ دی ہو، افسوس صد افسوس کہ اسی ذات عالی مقام پر زبان درازی کی جرأت اب بڑھتے بڑھتے فلم سازی کی حد تک جا پہنچی ہے۔

گستاخی کی ان کڑیوں کو اگر جوڑا جائے تو اس کی پہلی کڑی ہم کو اس دور میں پہنچا دیتی ہے جو دور آپ کی بعثت کا ہے، یہودیوں کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اور اپنی زبان کو توڑ مروڑ کر ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو دوہرا مفہوم رکھتے تھے، ایک معنی اگر ان کے اچھے نکلتے تھے تو دوسرے معنی ان کے برے، قرآن کریم میں اس کی مثالیں موجود ہیں، یہاں پر اس کا ذکر بھی بے ادبی ہے۔

(☆) سنڈے امنگ، روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۱۱ر نومبر ۲۰۱۲ء۔

پھر اس بدزبانی اور بے ادبی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے رک جاتا ہے، مکہ فتح ہوتا ہے، اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آتیا ہے، دشمنان اسلام کی زبانوں پر تالے لگ جاتے ہیں، لیکن یہ تالے پھر کھلتے ہیں اور حیرت ہے اس وقت کھلتے ہیں جب یورپ نے مسلم حکماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا اور اسی استفادہ کے نتیجہ میں وہ اس تاریکی سے نکلنے میں کامیاب ہوا جس تاریکی میں وہ ایک ہزار سال سے ڈوبا ہوا تھا، (Robert Briffault) اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں لکھتا ہے کہ ''یورپ کی ترقی میں اسلامی تہذیب کا بڑا حصہ اور اس کے انمٹ نقوش ہیں''۔ وہ لکھتا ہے:۔ ''علوم طبیعیہ نے جس کا سہرا عربوں کے سر بندھتا ہے، یورپ کو صرف نئی زندگی ہی نہیں دی، بلکہ اسلامی تہذیب نے یورپ کی بیداری میں بڑا کردار ادا کیا ہے''۔

لیکن یورپ نے اپنے فطری مزاج کے مطابق اس نعمت بیش بہا پر جو اس کی بیداری کا سبب بنی تھی، تشکر اور امتنان کے جذبات کے اظہار کے بجائے منفی پہلو اپنایا، کیونکہ اس پر صلیبی روح غالب تھی اور سیاسی اغراض و مقاصد نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، چنانچہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن بن کر سامنے آیا اور یہ اسلام دشمنی نتیجہ تھی اس پستی کا جس سے یورپ ایک ہزار سال سے دوچار تھا اور یہی اسلام دشمنی نتیجہ تھی اس خوف کا جو اسلامی فتوحات کے دور میں یورپ کے دل میں مسلم حکمرانوں کی طرف سے بیٹھا ہوا تھا، پھر یہی خوف نتیجہ بنا اس بات کا کہ یورپ نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی تدبیریں کیں اور مسلمانوں کے مقدس مقامات پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرنے کی ناپاک کوشش کی، سامراج کے علمبرداروں نے اسلامی ممالک میں اپنے سامراجی دور میں اپنے تمام علمی، سیاسی اور اقتصادی حربے مسلمانوں کی طاقت کو توڑنے اور ان کے اندر شکست خوردگی کا احساس پیدا کرنے

اوران کے اتحاد کو افتراق میں بدلنے کے لیے استعمال کیے، مسلمانوں میں اس طرح کے احساسات پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کتابوں کے ساتھ تعلیم وتربیت، علم اور میڈیا کو اپنا ذریعہ بنایا اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کے غصہ کو بھڑکانے، ان کو وقتی جوش دلانے اور ان کے ایمان کو جانچنے کے لیے انہوں نے فنی طریقے بھی اختیار کیے، خاص طور پر انہوں نے فلموں کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا اور مغربی فلموں نے اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر پیش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، ایک فلم کا نام ہے ''Dance of the Seven Veils'' یہ فلم مسلمانوں کے صرف منفی پہلو کو اجاگر کرتی ہے، اور فلم ''Hollywood'' کی ہے۔

۱۹۲۱ء میں ایک دوسری فلم ریلیز ہوتی ہے جس کا نام ''The Sheik'' ہے، ۱۹۲۴ء میں ''A Cafe in Cairo'' نامی فلم تیار ہوتی ہے، ۱۹۲۸ء میں ''The Desert Bride'' کے نام سے ایک فلم ریلیز ہوتی ہے، یہ تمام فلمیں وہ ہیں جن میں عربوں کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے، ان کو تشدد پسند دکھایا گیا ہے، رقص وسرور کا دلدادہ اور عورتوں کو اغوا ''Kidnaf'' کرنے والا بے ضمیر دکھلایا گیا ہے، اس طرح کی فلموں کی تعداد ۷۸ تک پہنچتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں ایک فلم ''Phoenix'' نام کی ریلیز ہوئی، اس میں مسلمانوں کو بے ضمیر دکھلایا گیا ہے، فلم کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ لیبیا کے صحراء میں ایک جہاز گرتا ہے، جہاز کا پائلٹ اور مسافر عرب قافلہ سے مدد طلب کرتے ہیں، لیکن مسلمان بجائے مدد کرنے کے ان مسافرین کو لوٹ لیتے ہیں اور پائلٹ کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیتے ہیں۔

۱۹۶۶ء میں ''الخروج'' نامی فلم ریلیز ہوئی، اس کی کہانی ایک پندرہ سالہ اسرائیلی دوشیزہ کے اردگرد گھومتی ہے جو ایک عرب نژاد مسلمان کے ہاتھوں بے دردی سے ماردی جاتی ہے۔

۱۹۶۶ء ہی میں اس طرح ''Cast Elegant Shadow'' نامی فلم ریلیز ہوئی، تھی جس میں یہ دکھا گیا کہ عرب ایک اسرائیلی دوشیزہ کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش سامنے رکھ کر کس طرح خوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں عربوں کے تیل کے ذخیرہ کے مالک ہونے کے بعد ''Jane Fonda'' نامی عورت جس نے ویتنام کی جنگ کا انکار کیا ہے اور ''Role Offer'' نامی فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کیا ہے، اس فلم میں یہ دکھایا ہے کہ عرب مذہبی معاملات میں بہت تنگ نظر ہیں، عورت کے سخت دشمن ہیں اور وہ یورپی تہذیب کو ڈھانے پر کمر بستہ ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ''The one and the Eleven'' نامی فلم ریلیز ہوئی، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عربوں نے ایک خاتون کو اغوا کرلیا اور امریکی صدر سے فدیہ کی رقم مطالبہ کررہے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ''Network'' نامی جو فلم ریلیز ہوئی تھی اس میں دکھایا گیا کہ عرب امریکہ پر قبضہ کرچکے ہیں اور بہت تنگ نظری کا مظاہرہ کررہے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ''Black Sunday'' نامی فلم ریلیز ہوئی، اس میں دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا اور اس کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کچھ مسلمان ایک پارک میں فٹ بال کھیلنے گئے کچھ بچوں کے قتل کا منصوبہ بنارہے ہیں، لیکن اسرائیلی پولس افسر نے ان کے اس منصوبہ کو ناکام کردیا اور ان بچوں کو ان کے شر سے بچالیا۔

۱۹۸۲ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''Wrong is Right'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عرب بادشاہ دو نیوکلیائی بم انقلابیوں کے حوالہ کرتا ہے تاکہ وہ اس کو اسرائیل اور نیویارک میں گرادیں، لیکن امریکی صدر ان کی سازش کو ناکام کردیتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں ہی ریلیز ہونے والی فلم ''Desert'' میں یہ دکھایا گیا کہ ایک شیخ نے ایک دوشیزہ پر جادو کیا اور پھر اس کو اغوا کیا۔

ہالی ووڈ نے اپنی کئی فلموں میں مسلمانوں کو غاصب، انتہا پسند اور تمام برائیوں کی جڑ دکھایا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ دنیا میں تخریب کاری کا مشن لے کر آئے ہیں، اس پروپیگنڈہ میں اس کا ساتھ صرف میڈیا اور فلم انڈسٹری نے ہی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن نے بھی دیا۔

''Road to Makkah'' نامی فلم میں ہیرو کو جو امریکہ کی خفیہ اجنسی کا ایک افسر ہے، اس کو عالمی تجارتی مرکز پر حملہ کے موقع پر حملہ کا مجرم مسلمانوں کو قرار دیتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے دکھا گیا ہے کہ یہ عرب شیخ اور ان کے معاونین ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم شیطان ہیں اور ہم کو ہلاک کر کے ہی وہ جنت میں داخل ہو سکتے ہیں، پھر وہ افسر مسلمانوں کو مغلظات بکنے لگتا ہے اور فلم کے اختتام میں یہ عرب شیخ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد کہتے ہیں ''دھماکوں کا انتظار کرو''۔

''American Jihadi'' نامی فلم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کہ دنیا میں پیش آنے والے حادثات اور دنیا پر منڈلاتے خطرات کے ذمہ دار صرف یہی عرب ہیں۔

ہالی ووڈ نے اپنی ''Blocked'' فلم میں جس کی بڑے پیمانہ پر تشہیر کی گئی، یہ دکھایا کہ عربوں کی فطرت ہی میں دہشت گردی کا عنصر شامل ہے، قتل و غارتگری ان کے خون مین داخل ہے، تشدد اور انتہا پسندی ان کی موروثی صفات ہیں، وہ جانباز امریکی فوجیوں کی ہمت اور شجاعت کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔

''Sword of Islam'' نامی فلم میں جس کو امریکہ میں ۵/سال تک پردہ پر دکھایا جاتا رہا، یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام دہشت گردی اور قتل و غارت گری کی تعلیم دیتا

ہے، وہ تہذیب وتمدن کا دشمن ہے، اسی فلم میں مسلمانوں کی جانب سے قتل وغارت گری کے کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں (بحوالہ: نحن والآخر)

مغربی میڈیا مسلمانوں میں غصے کا سبب بنے والے محرکات پر غور کرنے کے بجائے اور اس طرح کی مذموم حرکت کرنے والوں کو کلین چٹ دیتے ہوئے سارا قصور مسلمانون کے سر تھوپ دیتا ہے، مغربی میڈیا نے اور یورپی ممالک کے حکمرانوں نے مسلمانوں کی جوابی کارروائی کو دہشت گردی اور تشدد پسندی سے تعبیر کیا ہے۔

مہذب، باادب اور بااخلاق لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس طرح کے واقعات کے رونما ہونے پر فوراً اس کے خلاف آواز اٹھائیں، مجرموں کی گرفتاری کو یقینی بنائیں اور اس طرح کے واقعات پھر رونما نہ ہوں، اس کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں اور عملی تدابیر اختیار کی جائیں۔

یورپ اور پوری دنیا جانتی ہے کہ مسلمان اپنے نبی کریمؐ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور وہ اپنی جانیں آپؐ کے دفاع میں قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، یہی ان کے ایمان کی علامت اور ان کے سچے مسلمان ہونے کی پہچان ہے، مسلمانوں نے بارہا اس کا مظاہرہ بھی کیا، جب آپ کی شان میں گستاخی کی مذموم کوشش کی گئی، مسلمانوں نے خوشی خوشی اپنی قربانی پیش کردی۔

تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا جو آپ کے تعلق سے مسلمانوں کی غیرت، حمیت اور محبت کو جانچ سکے، مسلمان اپنے نبی کی آبرو پر ہر وقت جان دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور پورا یورپ یہ بھی جانتا ہے کہ اس طرح کی ناپاک کوششوں پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں، کتنے انسان موت کا لقمہ بن جاتے ہیں، پھر بھی یورپ بارہا یہ عمل دہراتا رہتا ہے، میڈیا کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، میڈیا بھی اپنے مقصد سے بے پرواہ اور اپنی ذمہ داری

سے غافل ہو کر غلط ہاتھوں استعمال ہوتا رہتا ہے، یقیناً میڈیا آزادی رائے کے معنی بھول چکا ہے۔

کیا زبان درازی کرنا، بلند اقدار پر کیچڑ اچھالنا، عقائد کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کرنا، مقدس جگہوں کی بے حرمتی کرنا، یہی آزادی رائے کا مطلب ہے؟ کیا یہی مغربی تہذیب کی علامت ہے؟، اس طرح کی یورش کرنے والی تحریکوں کا ظہور پذیر ہونا خلاف عقل نہیں ہے، اس لیے کہ ہر معاشرہ میں اچھے برے دونوں طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، گالی دینے والے بھی ہیں اور محبت بانٹنے والے بھی اور مثل مشہور ہے ''برتن سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے''، ہم کسی کو بھی گمراہ کن اور حاسدانہ خیالات باہر لانے سے نہیں روک سکتے، لیکن جس معاشرہ میں یہ واقعات رونما ہوں، اس معاشرہ کے ہر شریف شخص کی ذمہ داری ہے کہ اپنے قول سے اور عمل سے اس پر نکیر کرے اور اپنی برأت ظاہر کرے۔

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح کی گندی اور ناپاک کوششیں بار بار ہو رہی ہیں اور ان پر کوئی نکیل نہیں کسی جا رہی ہے، بلکہ ان کو آزدای رائے کی آڑ میں جواز کا درجہ دے دیا گیا ہے جب کہ اندرونی معاملات میں آزادی رائے کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

ابھی حال میں کی گئی ناپاک اور مذموم حرکت پر مسلمان بھڑک اٹھے، انہوں نے اپنے غصہ کا اظہار کیا، احتجاج بھی کیا، بڑے پیمانہ پر کیا، مگر امن کا دامن تھامے رہے، کیوں کہ وہ اس نبیؐ کے امتی ہیں جس کی رحمت سب کے لیے یکساں ہے، اس نبیؐ کی رحمت میں اپنے اور پرائے میں کوئی تفریق نہیں ہے، وہ اس قرآن کے ماننے والے ہیں جس میں رحم دلی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، جس قرآن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ''لا اکراہ فی الدین'' پر کاربند رہیں، وہ اس قرآن کے ماننے والے ہیں جس میں اللہ تعالی فرماتا ہے ''اے مسلمانو! تم سب کہو کہ

ہم اللہ پر ایمان لائے، اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب علیہم السلام اور ان کے اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا، ہم ان میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں'' (سورہ بقرہ:۱۳۶)

تمام مسلمانوں کا عالمی طاقتوں سے مطالبہ ہے کہ اس کے طرح کے واقعات کی روک تھام کے لیے قانون بنایا جائے، عالم اسلامی کے حکمرانوں نے بھی اقوام متحدہ سے یہی مطالبہ کیا ہے، ماضی میں بھی مسلمان اس طرح کے مطالبات کر چکے ہیں، لیکن مغربی ممالک نے ان مطالبات کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس بار بھی اس مطالبہ کو عالمی طاقتوں کی تائید نہیں ملی، اس لیے کہ اس طرح کی بدزبانیاں وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دنیا پر تسلط ہے، میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے اور بدزبانی کا نشانہ صرف مسلمان ہی بنتے ہیں، جبکہ مسلمان تمام ادیان ومذاہب کا احترام کرتے ہیں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں اور ان کی مقدس ہستیوں کی پوری عزت کرتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کسی مسلمان نے کسی دین یا کسی مقدس ہستی کی شان میں گستاخی کی کوشش نہیں کی۔

۵۶ مسلم ممالک کے حکمرانوں نے اس طرح کے قانون بنائے جانے کے لیے اقوام متحدہ کو قرداد بھیجی ہے، جس میں انہوں نے صرف اسلام اور حضور اکرمؐ کے احترام کے لیے قانون بنائے جانے کی وکالت نہیں کی ہے، بلکہ تمام مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی مقدس ہستیوں کے احترام کے لیے قانون بنائے جانے پر زور دیا ہے، اس سلسلہ میں عالمی قانون بنائے جانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہر انسان امن اور آزادی کے ساتھ بے خوف وخطر زندگی گزار سکے اور اپنے ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

مسلمان ایک عالمی امت ہیں (☆)

جس سے بے نیازی ممکن نہیں

مسلمان اس وقت پوری دنیا میں جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملتی، کہیں مسلمانوں کے وجود کو مٹانے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں، تو کہیں ان سے اپنے ملی تشخص، اسلامی و دینی شناخت، مخصوص وممتاز اسلامی طرز حیات سے دستبردار ہونے اور نظام تعلیم وتربیت کو بدلنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور کہیں ان کے مقدسات اور دینی شعائر پر حملے کیے جارہے ہیں، حالانکہ مسلم اکثریت والے ممالک کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور دنیا کے متعدد بڑے ملکوں میں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں، جغرافیائی اہمیت کے حامل علاقوں پر قابض ہیں، معدنی ذخائر اور زبردست انسانی طاقت کے مالک ہیں اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں قربانی و جانثاری کے جذبات اور موت کی محبت سے سرشار ہیں، اس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملتی، مسلمان جغرافیائی اور سیاسی وعسکری لحاظ سے اسٹراٹیجک پوزیشن رکھتے ہیں جو دنیا کے نظام مواصلات پر اثر انداز ہوتی ہے اور مسلمانوں کے متعدد ممالک پولیس مین اور پہرے دار کی حیثیت رکھتے ہیں کہ دنیا کے بڑے ممالک ان سے مستغنی نہیں ہوسکتے اور مسلمان ہی ان کے تاریخی حقدار ہیں، سامراجی ممالک نے کئی بار ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں کیں؛ لیکن ہر بار انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے کہ کسی ایک طاقت کا قبضہ دوسری طاقت کے غصہ کو بھڑکا دیتا ہے اور اسے اپنے مفادات کی فکر لاحق

(☆) تعمیر حیات، ۱۰/اپریل ۲۰۱۴ء۔

ہو جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں عالمی طاقتوں میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اسی عالمی ٹکراؤ کی وجہ سے بہت سے جغرافیائی اور فوجی اہمیت کے حامل مسلم علاقے محفوظ رہے۔

یورپ کی ہمیشہ یہ حکمت عملی رہی ہے کہ جو ممالک جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے اسٹراٹیجک (Strategic) پوزیشن رکھتے ہیں، ان پر اس کا کنٹرول رہے، فلسطین کو یہی حیثیت حاصل رہی ہے، یہاں مغرب نے ایسا نظام قائم کر لیا ہے جو اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اور اسکے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے، اس کے اور اسکی سرپرست طاقت کے درمیان بعد مسافت کی بنا پر اب اسکے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، کیونکہ اس کی قوت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، دور سے وہ اسرائیل کی حفاظت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ ایک ایسی عظیم آبادی کے بیچ میں گھرا ہوا ہے جو اسے غیر ملکی اور غاصب تصور کرتی ہے اور اس کی مملکت میں اپنے حق کی دعویدار ہے، اور خود اندرون ملک بھی ایک بڑی اکثریت ہے جو اپنے ملک کی بازیابی کے لیے برسرپیکار ہے، ان حفاظتی انتظامات کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اور اس کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے مغرب اس وقت فریقین کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں مصروف وسرگرم ہے، تاکہ اس کے اقتصادی اور دفاعی بوجھ میں کمی آجائے اور جن بین الاقوامی ذمہ داریوں کا سامنا اسے کرنا پڑتا ہے، اس میں کچھ تخفیف ہو جائے، اس مقصد کی تکمیل کے لیے بڑی طاقتیں ہر ممکن حربے اور وسائل استعمال کر رہی ہیں۔

اہمیت کے حامل یہ مقامات جن پر مسلمانوں کا قبضہ ہے خواہ یہ بری ہوں یا بحری اور یہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی پوشیدہ طاقت بڑے ممالک کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ جن ممالک میں یہ مقامات موجود ہیں، ان کے ساتھ اس کے خصوصی نوعیت کے روابط قائم رہیں، ان پر گذشتہ عہد میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، پرتگال اور روس کا قبضہ تھا، اب امریکہ ان سب مقامات پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے،

ان بڑے ممالک میں سے ہر ایک کے لیے اپنے مقاصد ہیں اور ان کے مابین باہمی رنجشیں بھی ہیں اور کشمکش کے وہ پس منظر ہیں جن کے سبب طویل جنگیں ہوئیں، جن کی یاد ذہنوں سے محو ہونے والی نہیں، اگرچہ امریکہ کے علاوہ کوئی بھی ملک اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ تنہا ان مقامات پر مکمل تسلط حاصل کرلے، سوائے اس کے کہ وہ خود وہاں کی حکومتوں کا تعاون حاصل کرے اور جب تک ان مقامات کی حکومتیں یورپ کے ساتھ تعاون اور اس کی تابعداری کرتی رہیں گی اس وقت تک وہاں سے یورپ کی بالواسطہ سیادت کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ یورپی ممالک اسلامی بیداری سے خائف ہیں، کیونکہ اگر یہ بیداری زور پکڑتی ہے تو لامحالہ حکمراں طبقہ پر بھی اس کے اثرات پڑے بغیر نہیں رہ سکتے، اسی لیے یورپی اخبارات نے بعض ملکوں میں اسلام پسندوں کی واپسی پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اگر اسلامی بیداری زور پکڑتی ہے اور حکمراں طبقہ اس کے دائرہ میں آجاتا ہے تو یورپ کے تجارتی، سیاسی اور دفاعی مفاد کو خطرہ لاحق ہو جائے گا، اپنے ان مفادات کے تحفظ ہی کے خیال سے یورپ، اسلامی بیداری کے خلاف جنگ پر آمادہ ہے، اور عالم عربی میں جہاں جہاں انقلاب ہوا وہاں اسلامی عناصر کو کچلنے کے درپے ہے، یورپ کے تبصرہ نگاروں کے جملہ تبصروں میں یہ تشویش بالکل نمایاں طور پر نظر آتی ہے، بعض تبصرہ نگار اس حد تک خوفزدہ ہیں کہ وہ جنگ کے بجائے اسلامی بیداری کے قائدین سے معاملہ کرنے کی دعوت دینے لگے ہیں اور ان کو اس کا احساس ہونے لگا ہے کہ اسلامی بیداری کی کھلی مخالفت سے بیداری میں قوت پیدا ہو رہی ہے، بعض یورپی قائدین بھی اب سودے بازی کی بات کرنے لگے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ اسلامی بیداری کے خلاف بہت شور مچانے سے اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے، اور یہ جنگ اسلام پسندوں میں مزید قوت واستقلال

پیدا کرنے کا سبب بنے گی اور ان میں اپنے مخالفین کے خلاف غیظ وغصہ اور ان سے انتقام کے جذبہ میں اضافہ ہوگا۔

لیکن ان معتدل آوازوں پر ان سیاسی قائدین نے کوئی توجہ نہیں دی، جو نام نہاد اسلامی دہشت گردی کا ہوا کھڑا کر کے اسلامی تحریک اور اسلام پسندوں کو کچلنے پر کمر بستہ ہیں اور ان کو اقتدار اور ملکی سیاست سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں۔

بعض یورپی ممالک مسلمانوں کو دہشت گردی یا اسلام پسندی کے الزام میں کچلنے کے لیے جو ذرائع استعمال کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں ان ملکوں کے اجتماعی اور تجارتی توازن کے بگڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس لیے کہ اگر بڑی تعداد میں اسلامی عناصر کو نکالا جائے تو اقتصادی نظام افراتفری کا شکار ہو جائے گا اور ایک ایسا خلا پیدا ہوگا جس سے کوئی کور چشم بغض پرور ہی چشم پوشی کر سکتا ہے، کیونکہ ان ممالک کی صنعتی زندگی کا دار و مدار بڑی تعداد میں غیر ملکی کارکنوں پر ہے اور جو صنعتی وتمدنی ترقی ان ممالک کو حاصل ہوئی ہے وہ صرف وہاں کے اصلی باشندوں کے زور پر باقی نہیں رہ سکتی اور یہ ممالک خواہ کتنی ہی دھمکی کیوں نہ دیں، مگر وہ اس بڑی تعداد سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے جس نے ان ملکوں میں بود و باش اختیار کر لی ہے، وہ وہاں کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے، وہاں کے باشندوں سے گھل مل چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بالکل وہاں کے اصلی باشندوں کی سی ہے، مزید برآں اس کارروائی سے وہاں کے موجودہ نظام کے سلسلہ میں لوگوں کے تصورات اور پیمانے بدل جائیں گے، اور یہ عمل ان ممالک، جمہوریت، سیکولرزم، انسانی حقوق، آزادی عقیدہ وعمل اور آزادی سلوک کے تمام دعوؤں کی حقیقت کو بے نقاب کر دے گا۔ یہ ممالک کس طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ اور متمدن ہیں، ان کے یہاں باشندوں کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں اور انھیں مکمل آزادی حاصل ہے؟ جب کہ وہیں پر بعض باشندوں کو ایک

خاص طرز کے لباس، خاص طرح کے کھانے ومشروب اور خاص نوع کے عقیدہ و عبادت کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس سیاست کو اپناتے ہوئے یہ ممالک دنیا کے پچاس سے بھی زائد، سیاسی، جغرافیائی اور تجارتی اہمیت کے حامل ممالک سے دوستانہ تعلقات کیونکر قائم کر سکتے ہیں، یہ اہمیت کے حامل مقامات جو کہ بڑے ممالک کی زندگی کی ناگزیر ضرورتوں کے مالک ہیں، ان کے علاوہ عالم اسلامی کے ممالک، معدنیات، دھات، حیوانات، سمندر اور جنگلات کی ایک عظیم دولت سے مالا مال ہیں، مزید برآں ان کے پاس پٹرول اور سونے کا وہ سرمایہ موجود ہے جس پر یورپ کی صنعت کا دارومدار ہے۔

اس کے علاوہ موجودہ زندگی میں، تمام وسائل وآلات کی ایجادات کے باوجود، انسانی طاقت اپنا ایک وزن رکھتی ہے اور یہ صنعت ودفاع دونوں میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے، دنیا کے متعدد علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہ عددی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

بین الاقوامی اسٹیجوں پر، مثلاً اقوام متحدہ اور اس کے مختلف اداروں میں مسلم ملکوں کی تعداد ترجیحی حیثیت رکھتی ہے، وہ اگر کوئی متحدہ موقف اختیار کریں تو وہ عالمی فیصلہ پر موثر ہوسکتا ہے، اگر مسلم ممالک پوری آزادی اور مکمل خود اعتمادی کے ساتھ اپنے اس حق کا استعمال کریں تو وہ عالمی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

یورپ کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو خود ان کی قوتوں کے سرچشموں، ان کے وزن اور دنیا میں ان کے جائے وقوع کی اہمیت کے احساس سے غافل کر دیا ہے، اور وہ پوری تندہی کے ساتھ پیہم مسلمانوں کو اس احساس سے غافل رکھنے کے لیے کوشاں ہے، جیسا کہ اس نے مسلمانوں کو ان کی دینی تعلیمات سے دور کرنے کی انتھک کوششیں کیں، ان کو اپنے مذہب کی تعلیمات سے

دور رکھا، قومیت اور لادینیت کی اشاعت کی اور بعض ملکوں میں ان پر الحاد کو لازم قرار دیا، اسی طرح مغرب کی یہ پوری کوشش ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل پیرا ہونے اور دین کی تعلیمات کو زندگی میں نافذ کرنے سے باز رکھے، اس مقصد کے حصول کے لیے وہ دعوت کا کام کرنے والوں کو ان کی حکومتوں کے ساتھ اختلافات میں الجھانے اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، تاکہ وہ دینی شعور کی اشاعت کے مشن کو جاری نہ رکھ سکیں۔ بعض حکام نے مغربی حاکموں کے ان فرامین کو قبول بھی کرلیا ہے، اور وہ بھی اسلامی ذہن سے اسی طرح خوفزدہ ہیں جیسے کہ مغرب کے حکام، حد تو یہ ہے کہ بعض مسلم حکام تو مغربی آقاؤں کے اشارے پر کارروائیاں کر رہے ہیں اور مغرب کی طرح وہ بھی اسلامی تعلیم و تربیت اور دعوت کو دہشت گردی قرار دے رہے، لیکن یہ معاندانہ رویہ، اسلام اور اسلامی عمل کو نشانہ بنانا اور صرف اسلامی حکومت اور اسلامی عناصر کے خلاف کارروائی اور دنیا کے مختلف ملکوں میں سرگرم عمل حقیقی دہشت گرد عناصر سے چشم پوشی سے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار ہوگا اور ردعمل بھی جو فطری اور نفسیاتی ہوگا۔

مسلمانوں میں اسلام دشمن طاقتوں کے رویہ کا جس وقت صحیح ادراک اور واقفیت پیدا ہوگی تو ان کے اندر شعور اور اپنی طاقت کا احساس پیدا ہوگا، ان کی صفیں متحد ہو جائیں گی اور پھر اس کے نتیجہ میں آزمائشوں اور مصائب کے باوجود غلبہ حاصل ہوگا، اب یہ شعور مسلم قوموں میں بڑھنے لگا ہے جیسا کہ حالیہ انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہوا جو ''عرب بہاریہ'' کے ملکوں میں ہوئے، دشمن نے بھی اس کو محسوس کیا تو اس نے جمہوری پیمانوں اور قدروں کو پلٹ دیا، حالات خراب کر دیے گئے، عسکری نظام لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور مسلمانوں میں آپسی اختلافات اور ٹکراؤ پیدا کر کے ان کو صفوں کو منتشر کیا جا رہا ہے، عراق، شام، مصر، تونس اور لیبیا کے حالات اس کی مثال ہیں۔

مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہو چکا ہے کہ اسلام کا نظام حیات سب سے بہتر نظام حیات ہے، اگر یہ شعور ان کی زندگیوں میں داخل ہو جائے تو وہ عنقریب ہی خیر الامم ہونے کا درجہ حاصل کر لیں گے، موجودہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ مسلمان موجودہ حالات کا صحیح ادراک کریں، دوست اور دشمن کی تمیز کریں، اپنے مسائل خود حل کریں اور غیروں پر اعتماد اور بھروسہ نہ کریں، اس لیے کہ وہ عالمی امت ہیں جن کے پاس صلاحیتیں، قدرتی ذخائر اور اہمیت کے حامل وہ مقامات ہیں جو عالمی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور وہ ایک ایسا عنصر ہیں جس سے بے نیازی ممکن نہیں۔ اس شعور کے پروان چڑھنے، قوت ارادی، آزادی عمل اور خود اعتمادی کے پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی حالت یکسر تبدیل ہو جائے گی اور موجودہ آزمائشیں اور مصائب اچھے مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً﴾ [بقرہ: ۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم کو مرکزی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہیں)۔

سامراجیت کا نیا فلسفہ

یہ دور اصطلاحات اور نظریات کا دور ہے، آئے دن نئی نئی اصطلاحات اور فسلفے وجود میں آتے ہیں اور موضوع بحث بنتے ہیں، اہل نظر ان اصطلاحات کی طرح طرح کی تشریح کرتے ہیں، بعض تشریحات پر غور کرنے سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلے ان اصطلاحات کو وضع کیا گیا یا اس فلسفہ کو جس کے لئے یہ اصطلاح وضع کی گئی، اس لئے کہ بعض اصطلاحات کا مفہوم زمانہ گزرنے کے بعد بھی واضح نہیں ہو پاتا، یہ شبہ ان کی مختلف تشریحات وتوضیحات کی وجہ سے ہوتا ہے، فہم وشرح کے تعارض کی وجہ سے سادہ لوح عوام کو دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں مغالطے میں رہتے ہیں۔

انھیں اصطلاحات میں گلوبلائزیشن GLOBALIZATIO کی اصطلاح ہے، اس سے پہلے نئے عالمی نظام New World Order کی اصطلاح رائج کی تھی، گلوبلائزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مبصر نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا کہ اس کا مقصد کسی ملک کی تعیین کے بغیر اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی امور میں واضح دخل اندازی کرنا ہے، ایک دوسرے مبصر کے نزدیک اس کا مفہوم سوسائٹیوں، اداروں اور تنظیموں پر حدود وقیود کا نفاذ ہے، ایک اور دانشور اس کی اس طرح وضاحت کرتا ہے کہ یہ ایک آئیڈیالوجی ہے جس کا مطلب دنیا پر تسلط قائم کرنا ہے، ایک مفکر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے پوری دنیا پر ایک ملک کی اجارہ داری مقصود ہے، اس طرح بعض لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ایک اقتصادی تحریک ہے اور بعض

کے نزدیک سیاسی، اسی طرح بعض کے نزدیک محض معاشرتی وثقافتی اور کچھ کا کہنا کہ ایک سامراجی تحریک ہے۔

نئے عالمی نظام کی اصطلاح روس کے زوال اور امریکہ کی عالمی بالادستی کے بعد عام ہوئی اس لیے کہ امریکہ کے حلیف ممالک سخت زبوں حالی اور ضعف کا شکار تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ جاں کنی کے عالم میں تھے، اس لیے انھوں نے امریکہ کی آغوش میں اپنی پناہ ڈھونڈھی اور چونکہ امریکہ کی طاقت وقوت سے ان کو بھی غذا ملتی تھی، اس لیے انھیں ایسا کرنا پڑا، جن ملکوں کا دنیا میں ایک لمبی مدت تک غلبہ رہا ہے ان کو بھی امریکہ کے آگے سپر انداز ہونا پڑا کیونکہ ان ملکوں پر ان کا کنٹرول ختم ہوگیا تھا، جن پر وہ عرصہ تک قابض تھے اور ان کی زبان وثقافت اور قومی امتیازات کا نام ونشان مٹا دیا تھا کہ ان کی جگہ امریکہ نے لی اور پوری دنیا میں اپنی قیادت وسیادت کے بارے میں اعلان کردیا کہ وہ اب پوری دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، اور اب اسی کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا کے اندر اپنا سیاسی اور اقتصادی نظام نافذ کرے جس کو تمام ممالک تسلیم کریں۔

دنیا پر اپنی بالادستی نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی خطرہ کا خیال ابھرا اور اس خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، اس لئے کہ نئے عالمی نظام کا تصور پیش کرنے والوں نے یہ محسوس کرلیا کہ اسلام ایک مستقل عقیدہ اور ثقافت ہے، اور اس کا نظام سیاست اور اقتصادی تصور مغربی تصور سے مختلف ہے، امریکی نظام صہیونی منصوبہ کے مطابق ہے جو قوموں کے استحصال اور ان کے اندر انتشار وافتراق پیدا کرنے والا ہے نیز وہ مادہ پرستی، فحاشی اور فریب دہی کا حامی وداعی ہے اور اسلام ہی تن تنہا ملحدانہ افکار، مادہ پرستی، اباحیت پسندی اور غیر انسانی حرکتوں کی راہ میں رکاوٹ ہے، ایسے غیر انسانی امور جن میں نہ تو کسی کے حقوق کا خیال کیا جاتا ہے اور نہ ہی اقدار وروایات کا؛ بلکہ ان

کے نزدیک انسان کے ساتھ کسی بھی سلوک کا واحد مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے، اسلام جو انسانیت واخلاق کا مذہب ہے کیسے اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام اس طرح کے سلوک کو کسی حال میں قبول نہیں کرسکتا، مغرب کے مفکرین اسلام کے اس مزاج سے واقف ہیں، مغرب کے ایک مفکر نے ان دونوں نظاموں کے فرق کو ''تہذیبی تصادم'' (Clash of Civilization) کا عنوان دیا ہے، چنانچہ اس نے مغربی اور اسلامی تہذیب کے پیروکاروں کے مابین معرکہ آرائی کے خدشات ظاہر کئے اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، ان مفکرین نے اسلام کی تاریخ کا پورے طور پر مطالعہ کیا ہے ان کے بڑوں نے اسلامی موضوعات پر پورے پورے کتب خانے قائم کردیئے ہیں، خواہ ان کتب خانوں میں اسلام کی تصویر کو مسخ وآلودہ کرنے اور تحریف وجعل سازی کی کوشش کی گئی ہوتا ہم ان کے دل اسلام کے جوہر، عروج وترقی کی صلاحیتوں اور دلوں کو مسخر کرنے والی اس کی ادا کو خوب جانتے ہیں، ان کو پتہ ہے کہ اسلام نے اپنے عہد زریں میں کیا کردار ادا کیا، اور کس طرح یورپ اس کی علمی ثقافتی اور سیاسی زد میں آتے آتے رہ گیا۔ وہ اپنے قلم سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، جب کہ پوری گہرائی وگیرائی کے ساتھ تاریخ اور قوموں کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے، وہ پوری دنیا پر حکمرانی کرچکے ہیں اور وہ قوموں وملکوں کے مزاج آشنا ہیں، ان کی ثقافت، رجحانات اور عناصر ترکیبی سے واقف ہیں جو اسلامی فتح کے نتیجہ میں اسلام میں داخل ہوئے اور جو اس کے بغیر اسلام لائے ان کو دونوں کی تعداد کا بخوبی علم ہے، اور یہ بات عیاں ہے کہ بعض ملک کسی بھی مسلم مجاہد کے داخلہ کے بغیر اسلام کی آغوش میں آگئے، عیاں راچہ بیاں خود مغربی مفکرین نے اسلام کی اس کشش کو تسلیم کیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ خود یورپ کے اندر اسلام تیزی

سے بڑھ رہا ہے، برطانیہ وامریکہ اور دیگر عیسائی اور اسلام دشمن ملکوں میں اسلام برگ وبار لا رہا ہے، لیکن آپ دیکھئے کہ کیا وہاں اسلام تلوار کے زور سے پھیل رہا ہے یا کسی مالی حرص سے؟ اسلام پھیلنے کے تمام حقائق روشن ہیں جن سے خبر رساں ایجنسیاں خوب واقف ہیں اور وہ اسلام قبول کرنے کی خبروں اور تفصیلات کو نشر کرتی رہتی ہیں۔

اس وقت مسلم اقلیتی ملکوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کے پاس اشاعت وتبلیغ کے جدید وسائل بھی نہیں ہوتے اور ان کو ملک میں کوئی مقام ومرتبہ اور عہدہ ومنصب بھی حاصل نہیں، وہ کمزور وپسماندہ ہیں اور آزمائشوں سے دوچار ہیں اور جہاں بھی مسلمان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں ابتلاء وآزمائش ان کا نصیب بن چکی ہیں، ان پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں ان کی سرگرمیوں پر رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں اور ملک کی ترقی وترویج کے منصوبوں میں حصہ لینے سے ان کو باز رکھا جاتا ہے اور ان کو بدنام کرنے کے لئے ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس سے بڑھ کر تعجب خیز بات کیا ہوسکتی ہے کہ یورپ میں خود عورتیں اسلام کے سائے تلے آرہی ہیں، جب کہ اسلام پر یہ الزام رہا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا، ان پر ظلم وزیادتی کرتا ہے لیکن ان کے اسلام لانے کے بعد اخبارات جب مومنات کے تاثرات کو نقل کرتے ہیں تو وہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام میں آکر انھوں نے زندگی کی حقیقت وسعادت کو پالیا ہے اور اسلام سے پہلے کی ان کی زندگی حرماں نصیبی اور شقاوت کی زندگی تھی۔

بعض عالمی ایجنسیوں کے مطابق اس وقت پوری دنیا کے مذاہب میں سب سے تیز پھیلنے والا مذہب اسلام ہے، اور یورپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام کو ڈھانے اور اس کو پسپا کرنے کے لئے کن آلات وسائل کی ضرورت ہے اور ان کو معلوم

ہے کہ ان کے ماسبق لوگوں نے اسلام کی بیخ کنی کے لئے کن وسائل کو اپنایا، انھیں پتہ ہے کہ مسلمانوں کے شوکت و دبدبہ اور ان کی قیادت وسیادت میں کیا چیز ان کے لیے مدد ومعاون ہے، یورپ نے اپنے دور سامراجیت میں مسلمانوں کے تشخص کو مٹانے ان کو ذلیل ورسوا کرنے، ستانے اور ان کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جو وسائل اختیار کیے وہ کیا تھے، پھر اس کے بعد مسلمانوں نے اپنی تہذیب وثقافت پر آنچ نہ آنے دینے اور ہر حال میں دین کی حفاظت کرنے کا عزم کرلیا، اس وقت یورپ نے اسلام کا خوب مطالعہ کیا اور انھوں نے اسلام کو اچھی طرح سمجھا، وہ دوسروں کو فریب میں ڈالنے کی کوشش ضرور کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو جانتا ہے، اس کو یہ حق پہونچتا ہے کہ جب وہ اس کی ہدایت وروشنی سے محروم ہے تو اس سے ڈرے، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے دشمنوں میں سے ہدایت نصیب کرتا ہے، آپ دیکھئے کہ ان میں سے روزانہ ایک بڑی تعداد اسلام میں داخل ہورہی ہے۔

اگر دین اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی تعداد فزوں ہونے کو اسلام کے خطرے سے تعبیر کیا جائے تو یہ عجب بات نہیں ہے کیونکہ اسلامی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ مغرب کی ہنگامہ آرائی سے قبل اتنی بڑی تعداد میں لوگ دین اسلام میں داخل نہیں ہورہے تھے جتنے اب ہورہے ہیں۔

اس وقت سارے جہاں میں دو طرح کے رجحان پائے جاتے ہیں ایک اسلام کا حقیقت پسندانہ مطالعہ، اور زندگی میں اس کے بہتر کردار کا رجحان ہے جو معروف ومشہور طرز فکر ہے، اور اس کا روز روشن کی طرح پوری دنیا میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، دوسرا طرز فکر دنیا کے اندر مسلمانوں پر مختلف پہلوؤں سے ظلم وزیادتی کرنے کا ہے، کہیں تو ان پر دہشت گردی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، جب وہ اسلامی دستور کے مطابق اپنے شرعی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے وہ محروم کئے جاچکے ہیں تو ان کا احتجاج ومطالبہ

دہشت گردی ہوجاتا ہے اور جب اپنے اوپر ظلم وسرکشی کا وہ مقابلہ ودفاع کرتے ہیں تو یہ بچاؤ بھی دہشت گردانہ عمل شمار ہوتا ہے، یہاں تک کہ دینی ادارے جو اخلاقی تعلیم کی دانشگاہ اور تربیت نفس، صبر، وبردباری، قناعت وخودداری اور انسانی حقوق کی رعایت کے قلعے ہیں انھیں دہشت وفساد برپا کرنے والوں کی پناہ گاہ شمار کیا جاتا ہے۔

بعض مقامات پر مسلمان بکثرت ظلم وزیادتی کا نشانہ بنتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور قومی زندگی میں وہ شریک ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں، تو ان کو علاحدگی پسند اور نسل پرست کہا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ محض اس وجہ سے ان کو حقوق سے محروم کردیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں یا ان کی نسبت وبنیاد اصل کی طرف ہے جبکہ یہ سوچنے والے خود نسل پرست اور متعصب ہوتے ہیں اور ان کا یہ طرز فکر اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

بعض جگہوں پر مسلمان اس لیے مظلوم ہے کہ وہ اپنے تشخص اور ملی شناخت کو باقی رکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ شوکت واحتشام اور احترام وعظمت کی زندگی بسر کرے اور اپنے دین کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، اس لئے وہ محرمات کو چھوڑتا اور حلال کردہ چیزوں کو کھانے پینے، لباس وغیرہ میں اپناتا ہے تو اس پر تہذیب وثقافت کے مخالف اور اس کے دشمن ہونے کا الزام عائد ہوجاتا ہے، اور بہر صورت اسی مادی دھارے میں بہہ پڑنے پر اس کو مجبور کیا جاتا ہے لیکن اس کارروائی کو ظلم وزیادتی، جبر وزبردستی اور بنیادی حقوق اور آزادی کا مخالف نہیں شمار کیا جاتا ہے۔

مغرب نے نئے عالمی نظام کے ذریعہ پوری دنیا پر اپنے سیاسی، ثقافتی واقتصادی تسلط کی آرزو کی تھی اور اس نئی اصطلاح (Globalization) کے ذریعہ اس نے شطرنج کا دوسرا مہرا رکھ دیا ہے جس کا ایک نام ''نیو ورلڈ آرڈر'' (New World Order) بھی ہے، یہ ہے امریکی تہذیب میں اپنے تمام امتیازات وخصوصیات کو ضم

کرنے کا منصوبہ، اس میں وہی تحلیل ہوسکتا ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہے نہ ثقافت، نہ ہی اس کی قابل فخر تاریخ ہے اور نہ ہی اس کے اندر ضم ہونے کے خطرات سے آگاہ ہونے کی صلاحیت، لیکن جو مذہب وثقافت سے آراستہ ہو اس کی شاندار تاریخ اور اسکے اندر شعور واحساس جاگزیں ہو تو اس کے لئے اس حملہ اور یلغار سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

حد درجہ حیرت انگیز بات ہے کہ جب کوئی مغربی عقیدہ واقدار اور تہذیب وثقافت پر تنقید کرتا ہے تو اسے پسماندہ اور جدید ثقافتی وسائل کا مخالف قرار دیا جاتا ہے کہ وہ متمدن انسان کو جنگل کی زندگی گذارنے اور اونٹ پر سوار ہونے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ جاہلانہ وتاریک زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک خیال خام ہے، اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی اور ان میں علماء وفلاسفہ پیدا ہوئے اور بحث وتحقیق کے میدان میں انھوں نے نئے نئے انکشاف کئے، اور یورپ نے اپنی بیداری وعروج کے دور میں ان سے استفادہ کیا اور بعض حق پسند مغربی مفکرین نے ان کو یورپ کا استاذ قرار دیا، یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ تمدن صرف آلات ووسائل کا نام نہیں ہے بلکہ تمدن کا اطلاق انسانی سلوک، نظام زندگی اور اسکے عقائد وافکار پر ہوتا ہے اور ہر تہذیب کا ایک خاص فلسفہ ہوتا ہے جس کی روشنی میں اس کے ماننے والے زندگی بسر کرتے ہیں اور کسی بھی تہذیب کا کوئی گوشہ اس فلسفہ سے خالی نہیں ہوتا، جیسے تعلیم، سیاست، اقتصاد اور سوسائٹی اور وہ نظام جو ان ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اس کے لیے ضروری یہ کہ وہ اپنے اس فلسفہ اور اس کی تطبیق کے سلسلے میں ماننے والوں کے رجحان ومزاج کو سمجھے اور اس کی رعایت کرے۔

عالم انسانی کے لیے سب سے بڑا فتنہ

صہیونیت ہر اس تحریک کی پشت پناہی کرتی ہے جس کی بنیاد مذہب بیزاری اور کردار کشی پر پڑی ہو، کیونکہ یہود کا خیال ہے کہ وہ اللہ کی محبوب اور برگزیدہ قوم ہے، باقی تمام قومیں اور مذاہب شیطانی یا حیوانی ہیں۔ لہٰذا یا تو انھیں یکسر ختم کر دینا چاہئے، یا غلامی کی رسی گلے میں ڈال دینا چاہئے، ان کی کتابوں میں اس کی پوری صراحت ملتی ہے اور مسلمان تو خاص طور سے ان کی عداوت کا نشانہ ہیں ہی، لیکن عیسائیوں کے سلسلہ میں ان کا نظریہ اپنی درشتی اور سختی میں ویسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کے ساتھ ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا موقف وہی ہے جو دیگر انبیاء کیساتھ تھا یہاں تک کہ خود ان کے اپنے انبیاء بھی ان کی طعن و تشنیع سے نہ بچ سکے، اسی بغض وعناد کو چھپانے کی خاطر یہود اپنی کتابوں اور عقائد کو عام کرنے سے گریز کرتے ہیں، اور کبھی کوئی کتاب منظر عام پر آجاتی ہے جس سے ان کے عقائد کا پردہ فاش ہوتا ہو یا ان کے سازشی کردار کا بھرم کھلتا ہو تو فوراً اس پر پابندی عائد کرتے ہیں، اور اسے عام ہونے نہیں دیتے جیسا کہ انھوں نے حکماء صہیون وتلمود کی دستاویزات کے تعلق سے کیا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ ان کے برے اور خبیث عزائم سے ناواقف و ناآشنا ہیں جو ان کی کتابوں میں مذکور ہیں، اسی طرح اکثر تعلیم یافتہ حضرات بھی ان کے مکتوبات ومعاہدوں سے بے خبر ہیں لیکن ان کی انفرادی واجتماعی حرکات، ظالمانہ رویے دیگر قوموں کے مقدس مقامات کے ساتھ ان کے غلط اقدامات اور ان کے فرعونی ونمرودی کردار ان کی چھپی ہوئی اس عداوت وبغض کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہر چند کہ یہودی تحریکیں نہایت خفیہ طریقہ پر کام کرتی ہیں لیکن پھر بھی بہت سی تحریکوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ یہودی اصول کی حامل ہیں جن کا شیوہ تباہی و بربادی مچانا اور مذہب وعقیدے کی بے حرمتی کرنا ہے، اکثر محققین جنھوں نے مذہب واخلاق کے خلاف آواز اٹھائی ہے یہودی ہیں اور بعض نے تو اپنی یہودیت پر پردہ ڈالنے کے لئے عیسائیت اختیار کرلی، بعض نے الحاد ولادینیت کا اظہار کیا۔ لیکن فی الحقیقت وہ کٹّر اور غالی یہودی ہیں، اسی طرح یہ فرد و جماعت کی زندگی سے اخلاق وکردار کی گرفت کمزور کرنے کے لئے حریت واباحیت کا نعرہ لگاتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ یہودی الاصل تحریکیں ہیں جن کا مذہب بیزاری اور کردار کشی میں اہم رول ہے اور جو قوموں کے تمدن وثقافت ان کے علمی سرمایوں پر پانی پھیرنے پرسکون ماحول میں سنسنی پیدا کرنے، مختلف طبقات اور جماعتوں کے مسائل میں مداخلت کرنے اور ان کے جذبات کو بھڑکانے میں مصروف ہیں، تو دوسری طرف وہ ذرائع ابلاغ ہیں جن کو یہودی ذہن نے دوسرا میدان عمل بنایا ہے، اور اس کے ذریعہ رائے عامہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور حسب موقع اس کو استعمال کرتا ہے، چنانچہ یہ یہودی نیوز ایجنسیوں اور لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والے عالمی رسائل ومجلّات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما پر قابض ہیں اور فلم انڈسٹری پر بھی انکی گہری چھاپ ہے، موجودہ ذرائع ابلاغ کی تاریخ پر جن کی نظر ہے ان کے لئے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اس اہم شعبہ میں یہودی بہت ہی سرگرم ہیں جس میں نہایت چابکدستی اور مہارت کے ساتھ دنیا میں ہونے والے انقلابات وواقعات کا اپنے تصور کے مطابق تجزیہ کرکے لوگوں کی ذہن سازی کرتے ہیں۔

تازہ ترین ذریعہ ابلاغ ''انٹرنیٹ'' ہے اس کے برے اور مضر اثرات پہلے ہی مرحلہ میں ظاہر ہوچکے ہیں، جو یہودیوں کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں، اور اس کا نتیجہ

ہے کہ مختلف سیاسی اور اخلاقی ادارے اس کے ذریعہ شائع ہونے والی خبروں اور واقعات پر شکوک وشبہات کا اظہار کررہے ہیں اور اس طرح کی فریب کاری، جعل سازی اور حقائق کی پامالی کی کتنی ساری مثالیں سامنے آچکی ہیں جن کا نشانہ دنیا کے مختلف ادارے بن چکے ہیں اسی لیے بعض ممالک اس نظام پر پابندی عاید کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ ''انٹرنٹ'' کے ذریعہ ایک ہندوستانی اداکارہ اور ایک ہندو دیوی کی عریاں تصویر شائع کی گئی، اسی طرح عالمی عقائد ونظریات کے سلسلہ میں غلط اور بے بنیاد باتیں پیش کی گئیں اس خطرے کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بقدر مفاد معلومات فراہم کرنے اور ترسیل وغیرہ کے مسئلہ میں غایت درجہ آسانی پیدا ہوگئی ہے کبھی تو واقعی معلومات حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں، اور کبھی صرف خیالی اور بے بنیاد ہوتی ہیں اور کبھی اس کا تعلق کسی فرد سے ہوتا ہے اور کبھی کسی جماعت یا معاشرے سے اور یہی اصل خطرے کی بات ہے اور اس سے زیادہ خطرناک بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی معلومات فراہم کرنے والے اداروں کی تعیین مشکل ہوجاتی ہے۔

اس ذریعہ ابلاغ کے ظہور پذیر ہونے کے تھوڑی ہی مدت بعد اس خطرے کے اثرات نمایاں ہونے لگے، چنانچہ تخریب پسند تحریکات اور غلط مکتب فکر کے لوگوں نے اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی سہولتوں کو اپنے افکار ونظریات کو فروغ دینے کے لیے غنیمت سمجھا، نتیجہ یہ ہے کہ یہی ذریعہ ابلاغ بیک وقت خبر رسانی اور حقائق پامالی دونوں کا سرچشمہ بنا ہوا ہے، مختلف ممالک نے اس خطرے کا نوٹس لیا ہے، اور اس پر پابندی عائد کرنے کی بات کہی ہے۔

مجلّہ ''اکنامسٹ'' شمارہ ۵، ۱۱/جولائی ۱۹۹۷ء نے لکھا ہے کہ: ''امریکی

نوجوان گذشتہ دنوں ایک سیاح کی حیثیت سے دوسرے ممالک پر حملہ آور ہوتے تھے، اور اجتماعی اور معاشرتی زندگی پر اپنا اثر ڈالتے تھے پھر بھی ان کا یہ اثر محدود ہوتا تھا، لیکن ''انٹرنٹ'' کا حملہ وسیع وعریض پیمانہ پر گھر، خاندان اور افراد اور جماعت سب پر یکساں طور پر ہے، کیونکہ یہ لسانی تمدنی اور جغرافیائی تمام حدود کو پار کرتا جارہا ہے۔ اور بیک وقت سب کو اپنا مخاطب بنارہا ہے اور یہ ہر طرح کی رطب ویابس خبریں اور معلومات فراہم کررہا ہے، خواہ اس پر اتفاق ہو یا نہ ہو، قوموں کی سیاست وکردار میں میل کھاتی ہوں، یا نہ کھاتی ہوں۔

بین الاقوامی میگزین ''اکنامسٹ'' کے مطابق ایک طرف تو ہر طرح کے مناسب ونامناسب افکار ونظریات اور مطلوب وغیر مطلوب معلومات منظر عام پر لائے جارہے ہیں، دوسری طرف ایک اور مسئلہ کھڑا ہے جو اس کے عام اور رائج ہوجانے ہی کا نتیجہ ہے، اور وہ کتابوں کے حقوق طبع کا مسئلہ ہے اس لئے کہ اب بڑی آسانی کے ساتھ کتابیں اس پر منتقل ہوتی جارہی ہیں، اب نتیجہ یہ ہے کہ ان کی طباعت واشاعت کا مسئلہ دشوار ہوا جارہا ہے، اسی طرح جن کتابوں پر پابندی عاید ہے وہ بھی عام اور متداول ہورہی ہیں اور بعض ایسی باتیں جو صیغۂ راز میں رہنے کی ہیں وہ ہر کس وناکس کے سامنے آرہی ہیں جس کی وجہ سے بعض قابل احترام شخصیتیں بھی نازک صورت حال سے دوچار ہورہی ہیں۔

فلسطینی مسلمانوں اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نادیدنی اور گھناؤنی تصویروں کی ترسیل عربوں کے ساتھ دشنام طرازیاں، فلسطین میں ان نادیدنی تصویروں والے پوسٹروں کو آویزاں کرنا اس جعل سازی اور حقائق پامالی کی تازہ ترین مثال ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے مسلمان برہم اور مشتعل ہیں۔

میگزین ''اکنامسٹ'' نے اپنے اسی شمارے میں لکھا ہے کہ اس طرح کے

پوسٹروں کے آویزاں کئے جانے کے بعد ہی جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خنزیر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ خلیل (فلسطین) میں کشیدگی اور تناؤ بڑھ گیا، اور فلسطینی مسلمانوں نے اس گستاخی کی تاب نہ لاکر اسرائیلی فوج پر بموں اور پتھروں کے ذریعہ حملہ کردیا، مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے اخبار ''العالم الاسلامی'' کے مطابق فلسطینی وزارت تعاون ومنصوبہ بندی کے ذمہ دار نے بتایا کہ انھیں برقی ڈاک کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور فلسطینی مسلمانوں کی نہایت گندی تصویریں ملیں، اور یہ ڈاک E-mail کے ذریعہ آئی تھی، مزید براں ان کے ساتھ گستاخانہ لہجے میں دشنام طرازیاں اور زبان درازیاں بھی کی گئی تھیں۔

وزارتی ابلاغی رپورٹ میں آیا کہ کمپیوٹر اس بورڈ کا تابع ہے جس نے برقی خط بھیجا۔ اس میں اس کی صراحت ہے کہ یہ خط اولاً نیویارک سے کسی عنوان سے ''انٹرنٹ'' کے ذریعہ بھیجا گیا۔

تصویر ورسائل کے ذریعہ اقوام وملل پر حملہ کی خاطر ''انٹرنٹ'' کا استعمال ایک عام بات ہوگئی ہے، چنانچہ عربی میگزین ''المجتمع'' نے ۱۵-۲۱/جولائی ۱۹۹۷ء کے شمارے میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کی گئی گستاخی کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ نیویارک میں یہودی تنظیموں نے مغربی کالونیوں میں اپنے خنزیروں کے ساتھ منظم طریقہ سے ''انٹرنٹ'' کے ذریعہ یکساں مہم شروع کردی ہے اور اس سلسلہ میں اہانت آمیز تصویریں عام کردی ہیں جس میں عربوں کے خلاف نازیبا اور گستاخانہ عبارتیں بھی ہیں، لیکن صرف مسلمان ہی اس پروپیگنڈہ کا شکار نہیں ہیں کیونکہ گیلیلیو نامی ایک اسرائیلی میگزین نے ایک تصویر شائع کی ہے جس میں انسانی کلوننگ کے ضمن میں حضرت مریم علیہا السلام کو گائے کے سر سے منسلک کرکے پیش کیا گیا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ تصویر بھی ''انٹرنٹ'' کا ہی شاخسانہ ہو۔

دیگر اقوام وملل سے یہود کا بغض وعناد نہایت قدیم اور مشہور ہے ان کی اس عداوت کے قصے ان کے تلمود اور مذہبی کتابوں میں مذکور ہیں، اور یہود اس کو چھپا بھی نہیں سکتے، ان کی پوری توجہ اگرچہ اسلام اور مسلمانوں پر ہے، لیکن دوسری اقوام وملل کے تعلق سے بھی انسانیت اور اخوت ومحبت کے جذبے سے یکسر محروم اور تہی دست ہیں۔ اس بغض وعناد کو عملی پیکر میں ڈھالنے کی خاطر وہ علم وہنر، ابلاغ وترسیل، سیاسی واقتصادی ہر طرح کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں، دوسرے ممالک میں اپنا اثر قائم کرنے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہر طرح کی تحریکات وتنظیمات میں بھی اپنے کو پیش پیش رکھتے ہیں تاکہ اپنا رسوخ قائم کرکے اخلاق وکردار کو پامال کرسکیں، افکار ونظریات اور تعلیم وتربیت پر اپنی چھاپ قائم کرسکیں اور دوسری قوموں کے عادات واطوار اور ان کے طریقہ کار کو تبدیل کرسکیں، یہود کے یہ نازیبا تصرفات، یہ حرکتیں ثابت کرتی ہیں کہ واقعی وہ ''مغضوب علیہم'' کا صحیح مصداق ہیں، اور انسان اور انسانیت کے لیے سب سے بڑا فتنہ اور خطرہ ہیں۔

انسانی حقوق: نظریات اور حقائق

کوئی بھی حساس اور خوب و ناخوب کی تمیز کی صلاحیت کا حامل تجزیہ نگار، بین الاقوامی پالیسی سازوں کے وضع کردہ انسانی حقوق کے پیمانوں کو مدنظر رکھ کر موجودہ صورتحال کا جائزہ لے گا تو اسے انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں دنیا کے تمام ممالک میں ملیں گی جن میں سرِ فہرست انسانی حقوق کے دعویدار متمدن ممالک ہیں۔

اقوامِ متحدہ نے انسانی حقوق کا چارٹر تیار کیا اور اس کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکا جاسکے اور ضرورت پڑنے پر کارروائی کی جاسکے۔

گذشتہ زمانہ میں بھیانک جنگیں ہوا کرتی تھیں جن کے نتیجہ میں بھاری جانی و مالی نقصان ہوتا تھا جس کی بدترین مثال روم و فارس کی جنگیں ہیں، شام کا علاقہ بھی میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ وہاں کے باشندوں کو زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑا جن میں یہود و نصاریٰ بھی تھے۔

موجودہ ترقی یافتہ اور متمدن دور میں بھی یوروپی ممالک کے درمیان دو عظیم جنگیں ہوئیں اور انقلابات رونما ہوئے جس کا سب سے زیادہ برا اثر عالم اسلام پر پڑا، ظلم و ستم اور انسانی حقوق کی پامالی کا ایک سلسلہ چل پڑا، تہذیب و ترقی کے نام پر اسلامی ممالک میں ایسے نظام تعلیم کو تھوپا گیا جو ان کے عقیدہ و دین اور فکر و نظر سے متصادم تھا۔

دونوں عظیم جنگوں کو دیکھنے والے اس کے جانی و مالی نقصانات اور تباہ کاریوں

سے بخوبی واقف ہیں، ان جنگوں نے فرانس، برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ ان کو اپنے مقبوضات سے دست بردار ہونا پڑا۔

جنگِ عظیم کے بعد اشتراکی انقلاب برپا ہوا، جس نے سویت یونین کے نام پر تمام ممالک کو ایک نظام کے تحت لانے کی ناکام کوشش کی، چین میں بزورِ طاقت اشتراکی آئیڈیالوجی تھوپنے کے سلسلہ میں لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا، مخالفین کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، سویت یونین کے مقبوضہ ممالک میں دینی شعائر و آثار کو مٹانے اور ملحدانہ نظریات تھوپنے کے لیے ہر طریقہ کو جائز سمجھا گیا، خصوصاً مقبوضہ اسلامی علاقوں میں تو اسلامی شعائر کو چن چن کر ختم کیا گیا۔

پھر یہی اشتراکی آئیڈیالوجی ایشیا و افریقہ کے اسلامی عربی ممالک میں پہنچی جہاں کی حکومتوں نے اس آئیڈیالوجی کو نافذ کرنے کے لیے انسانی حقوق کی بدترین پامالی کی، تحریکات پر پابندی لگائی، آوازوں کو دبایا اور مخالفین کو تختہ پلٹنے کے جھوٹے الزام میں جیلوں میں ڈال دیا، اٹلانٹک سے لے کر خلیج تک یہی رویہ اپنایا گیا، افریقہ چور اور ڈاکوؤں سے بھر گیا، جن کا شکار اہلِ حق اور رفاہی تنظیمیں بنیں، ان کو عقوبت خانوں کی المناک آزمائشوں سے گزرنا پڑا، دیگر ممالک کے مقابلہ میں اسلامی ممالک اور وہاں کے اہلِ حق نے زیادہ ظلم و استبداد کا سامنا کیا، لیکن ظلم وستم کا یہ دور باقی نہیں رہا اور ظالم و جابر حکمراں تاریخ میں گم ہو گئے جس پر تاریخ کے صفحات شاہدِ عدل ہیں۔

انسانوں کو خوشحالی اور امن و امان فراہم کرنے میں اشتراکیت کی ناکامی کے بعد یہ امید تھی کہ عالمِ اسلام اس تجربہ سے سبق سیکھے گا، لیکن حالات اس کے برعکس ہیں، ان ممالک میں بھی جہاں فوجی انقلابات ہوئے اور ان ممالک میں بھی جہاں فوجی انقلابات نہیں ہوئے، تمام اسلامی ممالک اس روش پر گامزن ہیں اور بیرونی

طاقتوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے ہوئے ہیں، انسانی حقوق کی پامالی عروج پر ہے، آزادیٔ رائے پر قدغن لگائی جارہی ہے۔

اشتراکیت کے سقوط اور سامراج کی رخصتی کے باوجود مغربی ممالک کی پالیسی میں تبدیلی نہیں آئی، ان کی پالیسی سے ایسا لگتا ہے کہ وہ دوبارہ قدرتی ذخائر سے مالا مال اسلامی علاقوں میں تسلط قائم کرنے کے فراق میں ہیں، بلکہ حالات پہلے سے بھی بدتر ہوگئے ہیں کیونکہ پہلے مغرب کی ریشہ دوانیاں علانیہ ہوا کرتی تھیں اور اب نہایت ہی منظّم انداز میں خفیہ طور سے ہوتی ہیں، کانوں کان کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، آوازوں کو دبایا جاتا ہے، تحریکات پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، حالانکہ یہ امید تھی کہ اشتراکیت و سامراج کے بعد حالات سدھر جائیں گے اور کام کرنے کے میدان کھل جائیں گے جس سے اشتراکیت ومغربی سامراج کے باقی ماندہ فاسد اثرات کو صاف کرنے میں مدد ملے گی لیکن موجودہ صورتحال بڑی مایوس کن ہے، پھر بھی ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ صرف خدائے بزرگ و برتر ہی کارکشا و کارساز ہے قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران ۲٦) (ترجمہ: کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

ایک نئی عالمی طاقت کی ضرورت

معاصر تہذیب جس کی بنیاد مغربی مفکرین اور دانشوروں کے ان افکار و نظریات پر ہے جو نشأۃ ثانیہ کے دور میں پیش کیے گئے، اس کی اولین بنیادوں میں انسانی آزادی کی بازیافت ہے، اور انسان کو ان تمام معاشی، سیاسی اور مذہبی پابندیوں سے آزاد کرانا ہے جو قرون وسطیٰ میں اس کے دوشِ ناتواں پر ڈال دی گئی تھیں، اور انسان اس دور میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا تھا، جبکہ دوسری طرف حکام اور مطلق العنان حکم رانوں کا مقصد ممالک اور دنیا کے وسیع رقبہ پر قبضہ اور بالادستی حاصل کرنا تھا جس کے نتیجے میں خونریز جنگیں ہوئیں اور ان میں زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا، اور علاقہ کے علاقہ تباہ و برباد ہو گئے اور مظلوم ولاچار انسان غلامی اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا، ان خونریز اور انسانیت کش معرکوں کی آخری کڑی پہلی اور دوسری عالمی جنگ ہے۔

انسانی جانوں کو تلف اور انسانیت کو شرمسار کرنے والی جنگوں کے سلسلہ کو روکنے لیے بڑی طاقتوں نے انسانی حقوق کا منشور جاری کیا، دوسری طرف چھوٹے اور کمزور ممالک کے داخلی معاملات میں بڑے اور طاقتور ممالک کی مداخلت پر روک لگانے اور ستم رسیدہ افراد کو امن وانصاف عطا کرنے کے لیے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا، جس نے دنیا کے مختلف علاقوں میں متعدد بحرانوں اور خارجی و داخلی جھگڑوں کو ختم کرنے اور جنگ اور مسلح ٹکراؤ سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، اور پھر جب کسی خطہ میں حالات جنگ میں تبدیل ہو گئے تو قیام امن وامان، مصالحت اور مسائل کے تصفیہ کے لیے موثر اقدامات بھی کیے۔

اقوام متحدہ سب سے پہلے جنگ زدہ علاقوں میں اپنے نمائندے بھیجتا، یا اقوام متحدہ کا جنرل سکریٹری ان مسائل ومشکلات کے تصفیہ کے لیے شخصی طور پر کوشش کرتا، پھر ان علاقوں میں اپنے مشاہدین (آبزرور) بھیجتا، اور جب بات چیت اور مصالحت سے مسئلہ حل نہ ہوتا تو اقوام متحدہ کی فوج بھیجی جاتی جو فریقین کو جنگ سے روکتی۔

اقوام متحدہ کی اولین ترجیحات میں رکن ممالک کی قومی اور علاقائی سلامتی کی حفاظت کے ساتھ انھیں طاقتور ممالک کی چیرہ دستی سے مکمل تحفظ فراہم کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ مغربی سامراج سے آزادی حاصل کرنے پر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی رکن ممالک اقوام متحدہ میں باقی ہیں۔

موجودہ عالمی بحران کی وجہ جہاں ایک طرف غیر جانبدار منصف طاقت کا فقدان اور کمزور وپسماندہ اقوام کے داخلی امور میں بیرونی مداخلت ہے، تو دوسری طرف جنگی طاقت ووسائل کے حامل ممالک کا ان ملکوں کے امور میں مداخلت کرنا ہے جو اپنی سلامتی کے وسائل نہیں رکھتے۔

مسائل کے حل اور ظالم کی سرکوبی میں اقوام متحدہ کی بے بسی کی وجہ سے شرق اوسط کے متعدد ممالک میں خونی ٹکراؤ جاری ہے، اس لیے کہ ایک ہی طاقت ان ملکوں کے معاملات میں تصرف کررہی ہے۔

آزاد ممالک کی سلامتی کے ساتھ نسلی اور مذہبی اقلیتوں کو بھی تحفظ فراہم کرنے کا مسئلہ ہے، اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے چارٹر میں اقلیتوں کی سلامتی اور تحفظ کو شامل کیا گیا، اور ان میں ہر طرح کی تفریق کو ختم کیا گیا، اس میں نسلی امتیاز کے خاتمہ کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔

افریقہ کے متعدد ممالک میں بعض عالمی طاقتوں کی طرف سے نسل پرستی کی

بنیاد پر کی گئیں ظالمانہ کارروائیوں کی بیخ کنی کے لیے عالمی پیمانہ پر کوششیں کی گئیں جس کی وجہ سے نسلی امتیاز کی بنیاد پر قائم نظام حکومت ختم ہو گئے۔

اسی طرح نسلی اور مذہبی امتیاز کی بنیاد پر نسل کشی اور اجتماعی قتل کا معاملہ ہے، اقوام متحدہ نے نسل کشی کے خلاف فیصلہ کن موقف اختیار کرنے میں مؤثر رول ادا کیا۔

موجودہ عالمی صورتحال اس بات کی غماز ہے کہ طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے، پیمانے بدل گئے ہیں، اقوام متحدہ کا اثر ختم ہو گیا ہے اور وہ بحران و مسائل کے حل میں بے بس ہو گیا ہے، دنیا کے معاملات میں صرف ایک طاقت تصرف کر رہی ہے، کمزور و ماتحت ملکوں کے مسائل میں مداخلت کر کے اختلافات کے دائرہ کو بڑھایا جا رہا ہے، اسلحہ کی فراہمی اور تخریب کاروں کی ٹریننگ کے ذریعہ استحصال کی راہ ہموار کی جا رہی ہے، یہ کام ایجنسیوں کے ذریعہ فسادات اور پرتشدد واقعات کرا کے کیا جا رہا ہے، اور پھر بے گناہوں کو مجرم قرار دے دیا جاتا ہے، اور ان کی سرکوبی کے لیے حملے کیے جاتے ہیں، اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لیے ابلاغ و میڈیا کے سارے ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔

اس وقت پوری دنیا قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کی آماجگاہ بن گئی ہے، شہر اور دیہات بلکہ پرامن سمجھے جانے والے مقامات پر بھی انسانی زندگی خطرہ میں پڑ گئی ہے، دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں میں جو واقعات و حوادث رونما ہو رہے ہیں، وہ اس کے گواہ ہیں، یہاں تک کہ ہوائی جہازوں، ٹرینوں اور بسوں کے مسافر بھی حملوں سے محفوظ نہیں، بے گناہ قیدیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جھیل رہے ہیں، اور اس سے بھی سنگین حالت وہ تعذیبی کارروائیاں ہیں جو اقوام متحدہ کے حقوق انسانی چارٹر کے خلاف ہیں، حالانکہ اس کا قیام حقوق انسانی کی بازیافت اور ہر طرح کی جارحیت

وبربریت پر لگام لگانے کے لیے ہوا تھا، اسی لیے اس کا بنیادی مقصد حقوق انسانی کی سلامتی اور ان کو تحفظ کو فراہم کرانا تھا۔

حقوق انسانی کی پامالی سب سے زیادہ اشتراکی نظام نے کی ہے، انسانی شرف ووقار کی بے حرمتی اور انسانی امن وسلامتی کو غارت کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش رہا ہے، اور اشتراکیت کا دورِ انقلاب اور اسی طرح سوویت یونین اور اس کے زیرِ نگیں ممالک کی تاریخ انہی انسانی جرائم سے پر ہے، کمیونزم نظام زندگی کو نافذ کرنے میں سب سے پہلے انسانی آزادی کو سلب کیا گیا، اخلاق ومعاملات اور عقائد کی ساری آزادی یک قلم ختم کردی گئی، اور جب اس نظام زندگی کا زوال ہوا تو یہ امید ہو چلی تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک اس ظالمانہ اور استبدادی نظام کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد۔

اور ہوا یہ کہ روس کے زوال کے بعد مغرب کی سامراجی طاقتوں نے اس ظلم و ستم کے خلا کو پر کرنے کی بھرپور کوشش کی، جس وقت روس نے عالمی سیاست سے گوشہ نشینی اختیار کی تو مغربی سامراجی طاقتوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے اور کمزور ممالک کے معاملات میں ظالمانہ مداخلت کی اور ان کا استحصال کیا جیسا کہ افغانستان، عراق، لیبیا اور دوسرے انقلابی ممالک میں ہوا، ان حالات میں اقوام متحدہ نے اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی، لیکن شام کی موجودہ صورتحال کے پس منظر میں اقوام متحدہ بے بس نظر آرہا ہے۔

سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد روس نے عزلت گزینی اختیار کرلی تھی، لیکن شرق اوسط کے حالیہ واقعات روس کے دوبارہ ابھرنے اور ملکوں کے داخلی معاملات وتنازعات میں اس کی مداخلت پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ شام میں ہو رہا ہے، بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق مسئلۂ شام کے حل نہ ہونے کے پیچھے روس کی

سیاسی اور عسکری مداخلت ہے۔ اسی لیے امریکی صدر براک اوباما نے روس پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ مسئلۂ شام کے حل ہونے کی راہ میں حائل ہے، جس کی وجہ سے شام میں خون خرابہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہاں کچھ ایسے اشارے مل رہے ہیں کہ شام مستقبل قریب میں روس کی کالونی بن جائے گا، اور وہاں روسی نظام وقانون نافذ کیا جائے گا جس کے نتیجے میں شام دین اور خالص عربی پہچان سے نکل کر روس کے مذہب بے زار نظام کو اختیار کرلے گا اور پھر اپنا تاریخی مقام وحیثیت اور عربی شناخت کو کھودے گا اور روس کی پناہ میں آجائے گا جس نے شام کے لاکھوں باشندوں کو تہہ تیغ کردیا ہے اور اس کے بڑے رقبہ کو ملبہ میں تبدیل کردیا ہے۔

شام کے ساتھ عراق اور لیبیا میں بھی روس کی مداخلت اور اس کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ جگ ظاہر ہوگیا ہے، جہاں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے، اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد نقل مکانی پر مجبور ہے۔

اس صورتحال میں ترکی نے مظلوموں کو امدادی وسائل فراہم کرنے اور مہاجرین کو پناہ دینے میں اہم کردار ادا کیا، اور اس سے زیادہ کی توقع کی جارہی تھی، لیکن روس کے معاندانہ موقف نے شرق اوسط کے سیاسی بحران وتنازع کے تصفیہ کے لیے ترکی کی کوششوں کو روک دیا ہے۔ رہی بات اقوام متحدہ کی تو وہ ان حالات سے یا تو چشم پوشی برت رہا ہے یا پھر وہ بے بس اور مجبور ہوگیا ہے۔

دنیا کی موجودہ صورتحال ایک ایسی موثر وعادل طاقت کی متقاضی ہے جو ظالموں کو ان کے ظلم واستبداد سے روکے، اور دنیا کے مختلف علاقوں میں امن وامان قائم کرے اور انسانی حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کرے۔